بند مٹھی
محی الدین نواب

فہرست

وہ جب پیدا ہوا تو دائیں ہاتھ کی مٹھی بند تھی۔ دائی نے کہا' یہ بہت غصے والا ہو گا۔ باپ نے کہا' میرا بیٹا بہت بڑا باکسر بنے گا۔ ماں نے کہا' یہ بڑا خوش نصیب ہو گا' ساری دنیا کی دولت اس کی مٹھی میں ہو گی۔ اس کی بند مٹھی میں بے شمار راز چھپے ہوئے تھے۔ اگر یہ مٹھی کھل جاتی تو..........

جب وہ پیدا ہوا تو اس کے دائیں ہاتھ کی مٹھی بندھی ہوئی تھی۔ دائی ماں نے اسے دیکھ کر کہا۔ "یہ بہت غصے والا ہو گا کیونکہ غصے میں انسان مٹھیاں بھینچتا ہے۔"

اس کے باپ نے اس کی بند مٹھی دیکھ کر دعویٰ کیا۔ "میرا بیٹا بہت بڑا باکسر بنے گا۔"

اس کی ماں نے بڑے یقین سے پیش گوئی کی۔ "میرا بیٹا خوش نصیب ہے۔ ساری دنیا کی دولت اس کی مٹھی میں ہو گی۔"

لیکن جب وہ بچہ جوان ہوا تو اپنی بند مٹھی کھول کر پانسا پھینکنے لگا اور ایک بدنام جواری بنتا چلا گیا۔

جس کے متعلق اتنی پیش گوئیاں اور دعوے کئے گئے اور جسے بہت کچھ ہونا چاہئے تھا اور وہ کچھ سے کچھ ہو گیا تو وہ بندہ نصف بدنام اور نصف نیک نام میں ہوں۔ میرا نام شریف نامی ہے۔ اصل پیدائشی نام محمد شریف زبیری ہے لیکن سوسائٹی میں میرا چرچا ایسے ہوتا ہے جیسے میں نامی گرامی ہوں۔ میرے منہ پر کہا جاتا ہے' یہ بڑا نامی بندہ ہے۔ ایک نیکی نہیں چھوڑتا ساری کی ساری دریا میں ڈبو دیتا ہے۔ پیٹھ پیچھے پبلسٹی ہوتی ہے' یہ بڑا نامی بدمعاش ہے۔ دور تک پہنچ ہے۔ علاقے کا تھانہ یہی چلاتا ہے۔ مثبت اور منفی دونوں ہی صورتوں میں مجھے نامی کہا جاتا ہے۔ اس لئے میرا نام شریف نامی پڑ گیا ہے۔

یہ جو ماں باپ ہوتے ہیں' یہ بے چارے اپنے اپنے طور پر بچوں کے متعلق رائے قائم کر لیتے ہیں اور اسی کے مطابق ان کی تقدیر بنانا چاہتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ بند مٹھی کے اندر جو لکیریں ہوتی ہیں وہ اپنا مزاج اور اپنا بیان بدلتی رہتی ہیں۔ میری مٹھی عادتاً بند رہتی تھی' میں صرف کھاتے وقت یا کسی ضرورت کے وقت اسے کھولتا تھا۔ پھر جلدی سے یوں بند کر لیتا تھا جیسے کوئی چیز چھپا رہا ہوں۔ دیکھنے والے

یہی شبہ کرتے تھے۔ ابتدا میں میرے ماں باپ بھی دھوکا کھا جاتے تھے۔ اگر میں باہر کہیں کھیلنے کے لئے جانا چاہتا تو ابو للکار کر پوچھتے۔ "ٹھہرو شریف! سچ سچ بتاؤ کیا چرا کر لے جا رہے ہو۔"

"کچھ نہیں ابو!"

"جھوٹ بولتے ہو۔ مٹھی کھول کر دکھاؤ۔"

میں اپنی ننھی سی مٹھی کھول دیتا جو ہمیشہ کی طرح خالی ہوتی تھی۔ اگر فریج سے کھانے کی کوئی چیز غائب ہوتی تو امی ڈانٹ کر کہتیں۔ "مٹھی کھول کر دکھاؤ۔" میں ان دنوں معصوم تھا۔ وقتاً فوقتاً اپنی مٹھی کھول کر بے گناہی ثابت کرتا رہتا تھا۔ میرا وہ معصوم ذہن رفتہ رفتہ سمجھنے لگا کہ میری مٹھی ایک ایسا گودام ہے جہاں چوری کا مال چھپایا جاسکتا ہے۔ میں نے آزمائش کے طور پر ایک دن ابو کی جیب سے پانچ روپے کا ایک نوٹ نکال لیا' اسے تہہ بہ تہہ موڑ کر مٹھی میں چھپا لیا۔ ابو نے کوٹ پہننے کے بعد جیب سے روپے نکال کر گنے پھر میری مٹھی کو دیکھا لیکن یہ سوچ کر نظرانداز کر دیا کہ یہ بچے کی پیدائشی عادت ہے۔ بار بار میری مٹھی کھلوانے سے شرمندگی ہوتی تھی۔ انہوں نے سوچا شاید امی نے جیب سے پانچ روپے نکالے ہوں گے۔ اس طرح میں پہلی بار بحفاظت چوری کی رقم گھر سے باہر لے جانے میں کامیاب ہو گیا۔

دوسری بار میری ماں نے چوری پکڑلی لیکن اس ڈر سے میرے ابو کو نہیں بتایا کہ باپ ظالم ہوتے ہیں۔ بچوں کو ان کی عمر سے زیادہ سزائیں دیتے ہیں۔ سزا سے بچنے کے بعد میرا حوصلہ بڑھ گیا۔ یہ بات سمجھ میں آگئی کہ جب تک ماں زندہ ہے' باپ تعزیزی قانون نافذ نہیں کرسکے گا۔ یہ عجیب سی بات تھی کہ دنیا دیکھنے کے لئے آنکھوں کو کھلا رکھنا پڑتا ہے لیکن میں دنیا کو سمجھنے کے لئے مٹھی بند رکھتا تھا اور دنیا سمجھ میں آتی جارہی تھی۔

اسکول میں بھی میری مٹھی توجہ کا مرکز رہی۔ تمام استاد اور طلبہ شبہ کرتے رہے کہ میں کچھ چھپا کر رکھتا ہوں۔ خصوصاً امتحان کے دوران ممتحن بار بار میرے پاس آتے تھے اور میری مٹھی کھول کر مایوس ہو جاتے تھے۔ نویں جماعت تک تمام اساتذہ نے یقین کرلیا کہ میں ذہین طالب علم ہوں اور نقل کرنے کے لئے کبھی کچھ چھپا کر نہیں لاتا ہوں۔ یہ مٹھی پیدائشی طور پر بند رہتی ہے۔ خالی بوتل کو کھولنے سے وہ خالی ہی

رہے گی۔ اس میں سے جن نہیں نکلے گا۔

ایک سال بعد کا ذکر ہے۔ دسویں جماعت کے طلباء اور طالبات بڑے سے ہال میں بیٹھے ریاضی کا پرچہ حل کررہے تھے۔ میرے آگے والی سیٹ پر ثمینہ بیٹھی ہوئی تھی۔ ممتحن کو کچھ شبہ ہوا تو اس نے للکارا۔ "ثمینہ! تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟" وہ ایک دم سے گھبرا گئی۔ اس کے بائیں ہاتھ میں ایک کاغذ تھا جسے دیکھ کر وہ نقل کررہی تھی۔ اس نے جلدی سے اس کاغذ کو توڑ مروڑ کر گولا سا بنایا۔ ممتحن ہال کے آخری سرے سے تیز قدم اٹھاتا آرہا تھا۔ اس کی نظر چوکتے ہی ثمینہ نے غیرارادی طور پر کاغذ کے گولے کو پیچھے کی جانب اچھال دیا۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ وہ گولا میرے پاس یا میری میز کے نیچے پہنچا ہوگا اس کی حالت عجیب سی ہوگئی۔ ایک تو پکڑے جانے کا ڈر تھا دوسرے وہ بہت مغرور تھی۔ اس خیال سے توہین محسوس کررہی تھی کہ پوری کلاس کو اس کی چوری کا علم ہو جائے گا۔

عام طور پر حسین لڑکیاں مغرور ہوتی ہیں۔ کوئی بھی ثمینہ کو دیکھے بغیر اس کے غرور کا ذکر سن کر اندازہ کرسکتا ہے کہ وہ کس قدر حسین اور دلنشین ہوگی۔ کسی کو بوائے فرینڈ بنانا تو دور کی بات ہے وہ کسی لڑکی کو بھی اپنی سہیلی بنانے کے قابل نہیں سمجھتی تھی اور اس بات کا خاص خیال رکھتی تھی کہ اس کی کوئی کمزوری کسی کے ہاتھ میں نہ جائے لیکن اُس روز بدحواسی میں اس نے ایک کمزوری میری طرف اچھال دی تھی اور میں نے اسے کیچ کرلیا تھا۔

ممتحن نے قریب آکر حکم دیا۔ "ثمینہ! کھڑی ہو جاؤ۔"

وہ کھڑی ہوگئی تھی۔ ممتحن نے پھر حکم دیا۔ "مٹھی کھولو۔"

اس نے دونوں ہتھیلیاں کھول دیں۔ اس کے پاس کچھ نہیں تھا۔ وہ کن انکھیوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں مسکراتے ہوئے اپنی کاپی پر جھک کر لکھنے لگا۔ ممتحن میز کے نیچے جھک کر وہ کاغذ تلاش کرنے لگا۔ میں نے نظریں اٹھا کر مسکراتے ہوئے دیکھا۔ اس نے غصے سے منہ پھیر لیا۔ اس کے رخسار توہین کے احساس سے سرخ ہو رہے تھے۔ ممتحن نے ناکام ہو کر پوچھا۔ "تم نے وہ کاغذ کہاں چھپایا ہے؟"

ثمینہ نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔ "سر! کون سا کاغذ؟"

"تم انجان بن رہی ہو۔ میں نے تمہارے ہاتھ میں کچھ دیکھا تھا۔"

"جی ہاں' میں نے یہ سفید رومال ہاتھ میں رکھا تھا۔ کیا آپ اسے کاغذ سمجھ رہے تھے؟"

وہ تذبذب میں پڑ گیا۔ یہ بات سمجھ میں آتی تھی کہ اس نے سفید رومال کو دور سے کاغذ سمجھ لیا ہو۔ مگر دل نہیں مان رہا تھا۔ اس نے ثمینہ سے نظریں ہٹا کر مجھے دیکھا۔ میں بائیں ہاتھ سے لکھنے کا عادی تھا۔ اس لئے دائیں مٹھی اپنی عادت کے مطابق بند کی ہوئی تھی۔ اس نے کہا۔ "شریف! ہم جانتے ہیں کہ یہ تمہاری پیدائشی عادت ہے مگر ابھی اپنی مٹھی کھول کر دکھاؤ۔ مجھے شبہ ہے' تم ثمینہ کی مدد کر رہے ہو۔"

میں نے مٹھی کھولنے سے پہلے ثمینہ کو دیکھا۔ اس کے حسین مکھڑے پر بے عزتی کا خوف لہرا رہا تھا۔ میں نے بڑی آہستگی سے مٹھی کھول دی۔ وہ خالی تھی۔ ممتحن مایوس ہو کر پلٹ گیا۔ وہاں سے جانے لگا۔ میں نے فوراً کاغذ کا گولا منہ سے نکال کر مٹھی میں دبا لیا۔ وہ میری حرکتیں دیکھ رہی تھی۔ ممتحن کو دو قدم چلنے کے بعد شاید یہ خیال آیا کہ میں چپ تھا۔ جواب میں کچھ نہیں بول رہا تھا۔ لہٰذا میرا منہ کھلوانا چاہئے۔ اس نے واپس آ کر کہا۔ "شریف! جیومیٹری کا کوئی مسئلہ مشکل ہو تو پوچھ لو۔"

"شکریہ سر!" میں نے ذو معنی بات کہی۔ "میں نے مسئلہ حل کر لیا ہے۔" ممتحن مجھے بولتے دیکھ کر مطمئن ہو گیا کہ میرے منہ میں کاغذ نہیں ہے۔ وہ چلا گیا۔ ثمینہ اپنی جگہ بیٹھ کر کاپی پر جھک گئی۔ اسے میرا احسان مند ہونا چاہئے تھا لیکن ایسی لڑکیاں احسان نہیں مانتیں۔ گھر سے اسکول تک کتنے ہی لڑکے اس کے کسی کام آنے کے لئے ایک ٹانگ پر کھڑے رہتے تھے۔ میرا خیال ہے لڑکیاں فطرتاً مغرور نہیں ہوتیں' لڑکے ان کا بھاؤ بڑھا کر مغرور بنا دیتے ہیں۔

اب وہ میری طرف پشت کئے یوں بیٹھی تھی جیسے کبھی مجھ سے کوئی واسطہ تھا' نہ رہے گا۔ میں نے ایک کاغذ پر لکھا۔ "حسینوں کو اس قدر بے مروت نہیں ہونا چاہئے۔ کم از کم شکریہ تو ادا کرو۔ یہ مندرجہ ذیل سطور اپنی تحریر میں فوراً مجھے ارسال کرو۔ انکار کرو گی تو کاغذ کا گولا ممتحن صاحب کے ہاتھوں میں پہنچ جائے گا۔"

پھر میں نے نیچے یہ سطور لکھیں۔ "میرے ہمدم! میرے محبوب' شریف زبیری! اگر تم ریاضی کے پرچے میں نقل کرنے کے دوران مجھے ممتحن سے نہ بچاتے تو میرا ایک سال برباد ہو جاتا اور میں پکڑے جانے پر کسی سے آنکھ ملانے کے قابل نہ رہتی۔

مجھے یقین ہو گیا ہے کہ میری طرح تم بھی مجھے دل و جان سے چاہتے ہو۔ ہال سے نکلنے کے بعد میں بڑے پیار سے تمہارا شکریہ ادا کروں گی۔ فقط تمہاری ثمینہ............"

میں نے اس کاغذ کا گولا بنایا پھر نشانہ لگا کر اس کی گود میں پھینک دیا۔ اس نے گولے کو اٹھایا پھر مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ میں نے انگلی کے اشارے سے کہا "اسے پڑھو۔"

اس نے مجھے ناگواری سے دیکھا پھر اسے کھول کر پڑھنے لگی۔ اسے پورا پڑھنے سے پہلے اس نے مجھے گھور کر دیکھا۔ میں نے پھر اشارے سے کہا۔ "آگے پڑھو۔"

اس نے آگے پڑھا۔ پھر اس کاغذ کو غصے میں بھینچ کر مجھے گھورنے لگی۔ میں سر جھکا کر پرچا حل کرنے لگا۔ وہ بری پھنسی تھی۔ جس کاغذ سے نقل کر رہی تھی اس کاغذ پر اس کی اپنی تحریر تھی۔ اس تحریر کو اس کی امتحانی کاپی سے ملایا جائے گا تو چوری صاف پکڑی جائے گی۔ اس کے لئے ایک ہی راستہ تھا کہ میرے حکم کی تعمیل کرے اور کاغذ کے گولے کو ممتحن تک نہ پہنچنے دے۔ میں نے میز پر آگے جھک کر اس کے پیچھے سرگوشی کی۔ "میں دو منٹ تک انتظار کروں گا۔ اس کے بعد............"

وہ گھبرا کر لکھنے لگی۔ میرے حکم کی تعمیل کرتے وقت اسے غصہ آ رہا تھا۔ اکثر مائیں اپنی بیٹیوں کو سمجھاتی ہیں کہ حد سے زیادہ ناز نخرے لڑکیوں کا گھر اجاڑ دیتے ہیں۔ بڑی مغرور شہزادیاں بھی اپنے شوہروں کے سامنے جھک جاتی ہیں۔ ثمینہ کو اس کی ماں نے سمجھایا ہو یا نہ ہو مگر اس روز کچھ سمجھ میں آیا کہ مجبوری کیا ہوتی ہے۔ عورت کو اپنی زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر کسی مرد سے ہارنا پڑتا ہے۔ اس نے ایک منٹ بعد کاغذ کی ایک چھوٹی سی تہہ بنا کر میری طرف پھینک دی۔ میں نے اسے اٹھایا پھر اسے کھول کر پڑھا۔ اس نے لکھا تھا۔ "شریف! میں تمہارا شکریہ ادا کرتی ہوں اور یہ وعدہ کرتی ہوں کہ ہم آئندہ اچھے دوست بن کر رہیں گے۔ فقط ثمینہ............"

میں نے اس کاغذ کو جیب میں رکھا۔ پھر جواباً لکھا۔ "اچھی دوستی تب مستحکم ہو گی جب تم میری مرضی کے مطابق من و عن وہی لکھو گی جو میں تم سے کہہ چکا ہوں' یاد رکھو میں تحریر حاصل کئے بغیر تمہیں امتحان ہال سے اٹھنے نہیں دوں گا۔"

میرے سخت رویے نے اسے یقین دلایا کہ جھکنا ہی پڑے گا۔ وہ دل پر جبر کر کے اپنی انا کے خلاف ایک شکست نامہ لکھنے لگی۔ لکھنے کے دوران وہ بار بار دوپٹہ درست

کر رہی تھی۔ اس طرح خود کو مجھ سے چھپا رہی تھی۔ کوئی بھی ہو اپنی کمزوری مجبوراً پیش کرتے وقت منہ چھپاتا ہے۔ اس نے لکھنے کے بعد کاغذ کا گولا بنایا پھر اسے میری طرف پھینکنے سے پہلے محتاط نظروں سے ممتحن کو اور کبھی آس پاس کے طلبا وطالبات کو دیکھنے لگی۔ اس کی اس ادا میں بڑی محبوبیت تھی جیسے گورے گورے مکھڑے والی گوری دنیا والوں سے ڈرتی ہوئی' چوری چوری' چھپ چھپ کر سیاں جی کے پاس آرہی ہو۔

پھر میرے پاس آگئی۔ اس کی تحریر آگئی۔ میں نے خوش ہو کر کاغذ کھولا اور جب اسے پڑھا تو جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ اس لڑکی نے اپنی تحریر کے ذریعے اٹھا کر پٹخ دیا تھا۔ اب میں اسے بلیک میل نہیں کر سکتا تھا۔

اس نے لکھا تھا۔ "میں اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتی ہوں کہ آج اس معبود نے تمہارے ذریعے میری آنکھیں کھول دیں۔ تم نے سمجھا دیا کہ عورت ایک بھول کرتی ہے اور ایک مرد کی مٹھی میں پہنچ جاتی ہے اور یہ مٹھی ایک دلال ہوتی ہے جو ہمیں ہوس کے بازار میں پہنچا دیتی ہے۔ اگر شیطان نہ ہوتا تو انسان صحیح معنوں میں اللہ کو پہچان نہ پاتا۔ اگر تم نہ ہوتے تو مجھے اپنے مقام سے گرنے کا احساس نہ ہوتا۔

"میں کسی خوف کے بغیر اعتراف کرتی ہوں کہ میں نے ریاضی کا پرچہ حل کرنے کے لئے نقل کرنے کا جرم کیا۔ علم کو چور دروازے سے حاصل کرنا چاہا۔ جبکہ نقب لگانے سے علم کبھی نہیں ملتا' جھوٹی تعلیمی سند ملتی ہے۔ لو' میں نے اعتراف کیا۔ یہ تحریر لکھ دی' جاؤ اسے ممتحن کے حوالے کر دو۔ فقط راقم الحروف ثمینہ۔"

میرے منہ پر زبردست طمانچہ لگا۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا اس کا چہرہ دوسری طرف تھا۔ مگر ایک ہاتھ کی حرکت سے اندازہ ہوا کہ وہ آنچل سے آنسو پونچھ رہی ہے۔ میں ندامت سے سکڑ کر چھوٹا ہو گیا۔ کبھی کبھی کوئی اپنے مثبت عمل سے اتنا عظیم ہو جاتا ہے کہ ہم سمٹ کر اس کی چٹکی میں آجاتے ہیں۔ میں پوری ایک مٹھی میں اسے جکڑ نہ سکا۔ اس نے ایک چٹکی میں جکڑ لیا۔

وہ تھوڑی دیر تک بیٹھی رہی۔ شاید انتظار کر رہی تھی کہ میں اس کی تحریر ممتحن کے حوالے کر دوں گا۔ جب میں نے ایسا نہیں کیا تو وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ میں دونوں ہاتھوں سے سر تھامے بیٹھا ہوا تھا۔ ممتحن نے دور سے پوچھا۔ "کیا چاہتے ہو تم؟"

میں اپنی کاپی اٹھا کر بولا۔ "میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔"

وہ بھی اپنی کاپی اٹھائے میرے سامنے سے چلتی ہوئی ممتحن کے پاس آئی پھر کاپی دے کر باہر چلی گئی۔ اس کے بعد میں کاپی دینے آیا۔ ممتحن ثمینہ کی کاپی کھول کر دیکھ رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔ "تعجب ہے۔ اس نے ایک ہی سوال حل کیا ہے۔ باقی کاپی سادی چھوڑ دی ہے اور وقت سے پہلے ہی چلی گئی ہے۔"

میں فوراً ہی اپنی کاپی دے کر باہر آیا۔ دائیں بائیں نظر دوڑائی وہ نہیں تھی۔ میں ایک برآمدے سے گزرتا ہوا دوسرے برآمدے میں آیا' وہ اسکول کے احاطے سے باہر جا رہی تھی۔ میں دوڑتا ہوا گیا۔ قریب پہنچ کر اپنی دوڑ کو چال میں بدل دیا۔ تیزی سے چلتے ہوئے اس کے برابر آیا تو وہ پرے ہٹ گئی اسکول کی طرف دیکھ کر بولی۔ "وہ سب کلاسوں میں بیٹھے ہوئے دیکھ رہے ہوں گے کہ تم میرا پیچھا کر رہے ہو۔"

"پلیز مجھے سمجھنے کی کوشش کرو۔ پیچھے آنے میں حرج نہیں ہے۔ پیچھا کرنے میں بدنامی ہے۔ اچھی بات کے لئے پیچھے آنے اور بدمعاشی سے پیچھا کرنے میں بڑا فرق ہے۔"

"اور کون سی اچھی بات کے لئے آئے ہو؟"

میں نے وہ دونوں کاغذ اسے دکھائے جن میں اس کی تحریر تھی۔ پھر انہیں پھاڑتے ہوئے کہا "میں سچ کہتا ہوں' تمہیں بلیک میل نہیں کر رہا تھا' صرف شرارت کر رہا تھا۔"

"ایک لڑکی سے زبردستی خط لکھوانا شرارت نہیں بدمعاشی ہوتی ہے۔ یہ میرے ہمدم اور میرے محبوب کا مطلب کیا ہوتا ہے؟ کیا میں تم سے محبت کرتی ہوں؟"

"اتنا بتا دو' کیا نفرت کرتی ہو؟"

"نفرت نہ کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں..........."

"بس بس آگے نہ کہو۔ میں اتنا ہی سننا چاہتا تھا کہ تم مجھ سے نفرت نہیں کرتی ہو۔ آج تم نے امتحان ہال میں ایک غلطی کا اعتراف کیا۔ ایک اور غلطی مان لو کہ جب تم سامنا ہوتے ہی منہ پھیر کر جاتی ہو تو یوں لگتا ہے کہ پتھر مار کر جا رہی ہو۔ کتنے ہی لڑکے تمہارے اس غرور کو اپنے لئے چیلنج سمجھتے ہیں۔"

"واہ' کیا سمجھداری ہے! لڑکیاں ہوس ناک نگاہوں سے بچنے کے لئے منہ پھیر

کر چلیں تو مغرور کہلائیں اور نگاہیں چار کرتے ہوئے مسکرا کر چلیں تو بے حیائی کا الزام اٹھائیں۔ تم لوگ ہمیں کسی طرح جینے نہیں دو گے۔"

وہ بڑی مدلل باتیں کر رہی تھی۔ اس وقت مجھ سے کوئی جواب نہ بن پڑا اس نے کہا۔ "تم نے میری ایک بات پوری نہیں ہونے دی۔ میں کہہ رہی تھی نفرت نہ کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ آدمی اچھا ہو' کسی قابل ہو تو اسے پسند کیا جاتا ہے۔ تم اسکول کے بہت ذہین اسٹوڈنٹ سمجھے جاتے ہو۔ ہم ساری لڑکیاں تمہیں پسند کرتی ہیں اور پسند کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ساری لڑکیاں تم سے محبت کرتی ہیں۔ کیا تم نے غور کیا کہ امتحان ہال میں نقل کرنے والا جو خط میں نے لکھ کر تمہیں دیا' وہ ممتحن کو کیوں نہ دیا' جب میں اپنی غلطی یا جرم کا اعتراف کر رہی ہوں تو ممتحن کے سامنے بھی کر سکتی تھی۔"

"ہاں' تم ایسا کر سکتی تھیں لیکن تم نے وہ خط مجھے دے کر میری آنکھیں کھول دیں۔ مجھے احساس دلایا کہ میں تم پر زیادتی کر رہا ہوں۔"

"یہ بات نہیں ہے جناب! میں نے ممتحن کے سامنے اس لئے اعتراف نہیں کیا کہ اعتراف کرنے سے تم بھی پکڑے جاتے کیونکہ تم نے وہ کاغذ غائب کیا جسے دیکھ کر میں نقل کر رہی تھی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ تمہاری کاپی ضبط کی جائے اور تمہارا ایک سال برباد ہو جائے۔"

یہ کہتے ہی وہ تیزی سے چلتی ہوئی احاطے کے باہر چلی گئی۔ میں اسے دیکھتا اور سوچتا رہ گیا۔ ہائے وہ کیا کہہ گئی تھی' میرا ایک سال برباد نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اسے میری نیک نامی اور امتحان میں کامیابی عزیز تھی۔ یہ درست ہے کہ اسکول میں مجھے سب ہی پسند کرتے تھے لیکن وہ میرے لئے جیسا سوچتی تھی اور جو کر گئی تھی اور جو کہہ گئی تھی وہ پسند سے ہی تھا بلکہ بہت زیادہ تھا۔

میں نے سوچا پسند کسے کہتے ہیں؟

سمجھ میں آیا پسند ہوتی ہے ناپسند کی ضد۔ یہ پسند وہاں سے ہوتی ہے جہاں سے کوئی اچھا لگتا ہے۔

کوئی اچھا کیسے لگتا ہے؟

اگر کوئی بدصورت مرد جان پر کھیل کر عزت بچائے تو اس کی دلیری پسند ہے

لیکن اس کی صورت پسند نہیں ہے۔ یعنی وہ ایک طرح سے اچھا ہے دوسری طرح سے اچھا نہیں ہے۔ اگر وہ خوبرو ہے' دلیر ہے اور ذہین ہے تو وہ ہر اعتبار سے اچھا ہے۔ بدصورت دلیر کے لئے پسندیدگی اور عزت ہے۔ خوبرو دلیر کے لئے پسندیدگی اور محبت ہے۔

میں نے گھر میں آ کر آئینہ دیکھا۔ ایمان کی بات ہے کہ میں کسی ہیرو کی طرح خوبرو نہیں ہوں مگر قبول صورت ہوں۔ ثمینہ نے میری ذہانت کی تعریف کی تھی۔ جو بات قابلِ تعریف ہوتی ہے وہی زبان پر لائی جاتی۔ باقی باتوں کو نظرانداز کیا جاتا ہے۔ میں ایسا تو نہیں ہوں کہ مجھے نظرانداز کیا جائے پھر ثمینہ نے کچھ اور کیوں نہیں کہا؟

میں بے چین ہو گیا۔ یہ لڑکیاں آدھی بات کہتی ہیں آدھی پیٹ میں رکھتی ہیں۔ ایک معما بن کر اپنی ذات سے دلچسپی لینے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ پھر شکایت کرتی ہیں کہ لڑکے ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ یہ باتیں اس وقت یاد نہیں آئیں جب ثمینہ نے مجھے لاجواب کر دیا تھا' میں بھی اس کا منہ بند کر دیتا۔ مگر وقت گزر چکا تھا میں نے یہ باتیں ڈائری میں نوٹ کر لیں تاکہ آئندہ کسی ملاقات میں منہ توڑ جواب دے سکوں۔

میں دوسرے دن امتحان ہال میں آیا۔ وہ نظر نہیں آئی' میں بے چین ہو گیا۔ بڑی بے دلی سے معاشرتی علوم کا پرچہ حل کرنے لگا۔ پہلے تو مجھے یقین تھا وہ ضرور آئے گی۔ کلاس میں ناغہ ہوتا ہے' امتحان میں ایک دن کا بھی ناغہ نہیں کیا جاتا۔ پورا ایک سال برباد ہو جاتا ہے۔ پھر خیال آیا کہ وہ گزشتہ روز ریاضی کا پرچا حل کئے بغیر خالی کاپی ممتحن کو دے گئی تھی۔ اس سے ظاہر تھا کہ وہ اپنا ایک سال ضائع کر رہی ہے۔ آج دوسرا پرچہ نہ دے کر اس کی تصدیق کر رہی ہے۔

تیسرا دن بھی گزر گیا۔ پھر امتحان بھی ختم ہو گئے۔ میرے اندر جرم کا احساس پکنے لگا۔ اگر میں شرارت نہ کرتا اور وہ میری شرارت کو بلیک میلنگ نہ سمجھتی تو پورے امتحان سے گزرتی۔ اپنا ایک سال برباد نہ کرتی۔ وہ میری وجہ سے امتحان ہال میں پھر نہیں آئی۔ مجھے اپنے آپ پر غصہ آنے لگا یہ کیسی تقدیر لے کر پیدا ہوا ہوں' کوئی جرم نہیں کرتا' پھر بھی ماں کہتی ہے' مٹھی کھولو' باپ کہتا ہے مٹھی کھولو' ممتحن کہتا ہے مٹھی کھولو' ثمینہ بھی کہتی دل کھولو تو میں دل چیر کر دکھا دیتا کہ میں نے اس کا برا

نہیں چاہا تھا۔ برا ہوتا تھا' سو ہو گیا۔

کہاں ہو ثمینہ؟ تم کہاں ہو؟

میں نے اس کی ایک سہیلی سے کہا۔ "چھ دنوں سے انتظار کر رہا ہوں' اس نے امتحان نہیں دیا۔ اسکول بھی نہیں آ رہی ہے۔ کیا تم اس کا پتا جانتی ہو؟"

"کیا اسے پیغام پہنچانا چاہتے ہو؟"

"ہاں' میں ایک خط دینا چاہتا ہوں۔"

"کیا مجھے کبوتری سمجھتے ہو؟"

"نن.......... نہیں یہ بات نہیں ہے۔"

"تم ہر سال اول آتے ہو' ذہین کہلاتے ہو مگر اتنی سی بات عقل میں نہیں آئی کہ اسکول کے رجسٹر میں اس کا پتہ لکھا ہو گا۔"

میں خوشی سے اچھل پڑا جیسے وہ مل گئی ہو۔ پھر دوڑتا ہوا آفس میں آیا۔ ہیڈ کلرک کو سلام کر کے کہا۔ "مجھے ثمینہ رحمان کے گھر کا پتا چاہئے۔"

ہیڈ کلرک نے پوچھا۔ "برخوردار! کس رشتے سے پتا پوچھ رہے ہو؟"

میں ہچکچانے لگا یہ سوچا بھی نہ تھا کہ وہ ایسا سوال کرے گا۔ میں نے کہا۔ "بات رشتے کی نہیں ہے' وہ کئی دنوں سے غیر حاضر ہے' ہماری کلاس کی لڑکیوں اور لڑکوں کو اس کے لئے تشویش ہے۔ ہم سب اس سے ملاقات کے لئے جانا چاہتے ہیں۔"

"جو لڑکیاں اور لڑکے ثمینہ سے ملنا چاہتے ہیں انہیں یہاں لے آؤ پھر پتا بتاؤں گا۔"

میں الجھ گیا کلاس کے لڑکے شیطان تھے۔ بعض لڑکیاں حسد اور جلاپے میں بات کا بتنگڑ بنا دیتیں۔ میرے اور ثمینہ کے درمیان ابھی کوئی فسانہ نہیں تھا' یہ اسٹوڈنٹ اس کا ناول بنا دیتے۔ یوں تو میں نے اس کا ایک سال برباد کیا تھا' یہ لوگ اس کی پوری زندگی برباد کر دیتے۔ میں نے سوچ لیا اسکول کے دفتر سے پتا معلوم نہیں کروں گا۔ وہاں سے شکست خوردہ انداز میں اٹھ گیا۔ سر جھکا کر آہستہ آہستہ جانے لگا۔ دروازے پر پہنچا تو ہیڈ کلرک نے کہا۔ "سنو!"

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ سنجیدگی سے بولا۔ "وہ لاہور چلی گئی ہے۔"

مجھے یوں لگا جیسے دل کی دھڑکنیں رک گئی ہوں۔ پھر میں نے ایک گہری سانس

لے کر بے یقینی سے کہا۔ "نہیں' وہ نہیں جا سکتی۔"

"کیا وہ تم سے پوچھ کر آتی جاتی ہے؟"

میں جھینپ گیا۔ ان دنوں میری عمر ہی کیا تھی۔ کچا تجربہ تھا پہلے تولنے اور پھر بولنے کا ڈھنگ نہیں آتا تھا۔ میں اسکول کے برآمدے میں آیا۔ اس کی سہیلی مسکرا رہی تھی۔ میرے قریب آ کر بولی۔ "میرا نام درخشاں ہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔"

"تمہیں اب ثمینہ کا نام بھول جانا چاہئے۔"

"میں نادم ہوں' وہ میری وجہ سے گئی ہے۔"

"تم خواہ مخواہ ایسا سوچ رہے ہو۔ اس کے باپ کا پہلے ہی لاہور ٹرانسفر ہو گیا تھا۔ وہ امتحان کی وجہ سے رکی ہوئی تھی۔ اپنی خالہ کے گھر رہتی تھی۔ مگر امتحان کیا خاک دیتی۔ ایک ماہ تک بیمار پڑی رہی تھی۔ جم کر اسٹڈی نہ کر سکی۔ امتحان کے سخت پرچے دیکھ کر بھاگ گئی۔"

میں خاموشی سے سنتا ہوا اسکول کے احاطے میں آیا۔ درخشاں نے کہا۔ "میری کار میں چلو' جہاں کہو گے ڈراپ کر دوں گی۔"

"شکریہ' تم اچھی ہو۔ مگر ابھی میں نہیں جانتا کہ مجھے کہاں جانا ہے۔"

"کیوں' گھر نہیں جاؤ گے؟"

"نہیں۔ میرے اندر کچھ ہو رہا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہاں جاؤں کیا کروں؟"

"کیا اس سے بہت محبت کرتے ہو؟"

"آں؟" میں نے اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھا پھر کہا۔ "میں نے ابھی سوچا نہیں ہے کہ یہ محبت ہے یا کیا ہے؟ مگر کچھ ہے۔"

"تم اس کے متعلق سوچنا چھوڑ دو مگر تم کہو گے سوچ اپنے بس میں نہیں ہوتی' وہ بے اختیار آتی ہے لیکن دوسری طرف دھیان لگاؤ گے تو دل بہل جائے گا۔ مجھے ٹیوشن پڑھاؤ گے؟"

اس نے کھل کر نہیں کہا مگر سمجھا دیا کہ میرا دھیان بٹانا چاہتی ہے۔ میں دسویں جماعت کا نتیجہ نکلنے کے بعد ملازمت کرنا چاہتا تھا۔ ابو اپنی محدود آمدنی سے میرے کالج

کے اخراجات نہیں اٹھا سکتے تھے۔ انہوں نے صاف کہہ دیا تھا۔ "خود پڑھنا چاہتے ہو اور بھائی بہنوں کو پڑھانا چاہتے ہو تو نوکری کرو۔ مہنگائی روز بہ روز بڑھتی جارہی ہے۔"

ان دنوں آج کی طرح آسمان سے باتیں کرنے والی مہنگائی نہیں تھی چونکہ ہمارے والدین نے بچپن میں چار پیسے سیر مسور کی دال' چار روپے سیر ڈالڈا اور دس روپے سیر خالص گھی کھایا تھا۔ اس لئے انہیں بارہ آنے سیر مسور کی دال اور بیس روپے سیر خالص گھی مہنگا لگتا تھا۔ کیونکہ بحیثیت کلرک ان کی ماہانہ تنخواہ مہنگائی الاؤنس کے ساتھ چھ سو روپے تھی۔ وہ گھبرا گھبرا کر کہتے تھے' مہنگائی بڑھ رہی ہے۔ اب تو والدین اللہ کو پیارے ہوگئے ہیں۔ اگر زندہ ہوتے تو چودہ روپے کلو دال اور پچانوے روپے کلو خالص گھی دیکھ کر ان کا ہارٹ فیل ہوجاتا لیکن ہم اس مہنگائی میں زندہ ہیں۔ ہماری اولاد جب یہ دنیا سنبھالے گی تو پانچ سو روپے کلو بکرے کا گوشت کھا کر زندہ رہے گی۔ کیونکہ ہم سب کھا کھا کر مہنگائی بڑھاتے ہیں۔ اگر پوری قوم چند ماہ تک صرف دال روٹی کھائے تو مجھے یقین ہے کہ گھی اور گوشت وغیرہ کی قیمت خود بخود گرتی جائے گی۔ ہر امیر اور غریب کے گھر میں عید ہوا کرے گی۔ مسئلہ یہی ہے کہ ہم غریب کے گھر میں عید نہیں چاہتے اس لئے ہر قیمت پر کھا کھا کر مہنگائی کا پہاڑ بناتے جاتے ہیں۔

میں نے درخشاں سے کہا۔ "میں دو بچوں کو پڑھاتا ہو۔ پھر نوکری تلاش کر رہا ہوں۔ تمہیں پڑھانے کے لئے وقت نہیں ملے گا۔"

"دو بچوں سے تمہیں کیا مل جاتا ہوگا؟ پانچ یا دس روپے؟"

"ہاں' جیب خرچ نکل آتا ہے۔"

"میں تمہیں دو سو روپے دوں گی۔"

میں نے خوش ہوکر اسے دیکھا۔ مہنگائی اسی طرح بڑھتی ہے بڑے باپ کی بیٹی کے لئے دو سو روپے کچھ نہ تھے لیکن یہ روایت چل پڑے گی۔ پھر میرے جیسا غریب لڑکا اتنی زیادہ ٹیوشن فیس دے کر نہیں پڑھ سکے گا۔ ویسے مجھ غریب کو دو سو روپے مل رہے تھے۔ اس کے بعد مہنگائی کی روایت کیسے بڑھے گی' یہ مجھے سوچنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے بات پکی کرنے کے لئے پوچھا۔ "دو سو؟"

"کم ہیں تو تین سو لے لو۔"

تین سو یعنی میرے باپ کی آدھی تنخواہ۔ میں راضی ہوگیا۔ اس نے کہا۔

"میرے ساتھ چلو آج گھر دیکھ لو کل سے پڑھانے آجاؤ۔"

ہم کار کے پاس آئے ڈرائیور نے ادب سے دروازہ کھولا۔ میں اس کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اب سے پہلے دو ایک بار دوسروں کے ساتھ ٹیکسی میں بیٹھ چکا تھا۔ پرائیویٹ کار میں پہلی بار بیٹھ کر مجھ پر درخشاں کا بڑا رعب پڑا۔ وہ میرے جیسی' انسان کی بچی تھی مگر ایک خوبصورت مہنگی کار میں آتی جاتی تھی۔

ڈرائیور خاصی تیز رفتاری سے گاڑی چلا رہا تھا۔ وہ ڈانٹ کر بولی۔ "گاڑی تیز کیوں بھگا رہے ہو۔ کیا تمہارا باپ مرگیا ہے؟"

اس نے رفتار سست کردی۔ وہ مجھ سے مسکراتی ہوئی بولی۔ "میں چاہتی ہوں یہ راستہ ختم نہ ہو۔ تمہارے ساتھ بیٹھی رہوں۔"

میں نے کہا۔ "مجھ سے ایسی باتیں نہ کرو' میں بہت غریب ہوں۔"

"میرے ساتھ رہ کر چھوٹے لوگوں کی طرح باتیں نہ کرو۔ میں ڈیڈی سے تمہاری ملازمت کے لئے بات کروں گی۔"

"کیا سچ کہہ رہی ہو' ملازمت مل جائے گی؟"

"ڈھونڈنے سے نہیں ملے گی۔ صرف میں تمہیں کام سے لگا سکتی ہوں۔"

"میں تمہارا احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔"

"میں یہی چاہتی ہوں کہ مجھے کبھی نہ بھولو' اس کے لئے ضروری ہے کہ دوسروں کو بھول جاؤ۔"

"دوسروں سے کیا مراد؟"

اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔ "کوئی تمہیں یاد آرہی ہے؟"

ثمینہ یاد آگئی' اس کا چہرہ نگاہوں میں روشن ہوگیا۔ مجھے یوں لگا جیسے دھوپ سے چھاؤں میں آگیا ہوں۔ درخشاں نے پوچھا۔ "کہاں پہنچے ہو؟"

میں چونک گیا۔ اس کی دنیا سے واپس آیا تو درخشاں نظر آئی۔ بہت پھیکی لگی لیکن روزی اور روٹی پھیکی ہو' تب بھی ان میں نمک پڑجاتا ہے۔ میں نے کہا۔ "میں

اسے بھول رہا تھا' تم نے یاد دلایا ہے۔"

"کوئی بات نہیں' تمہیں بھولنا تو آ رہا ہے۔"

گاڑی اس کی شاندار کوٹھی کے پورچ میں رکی۔ میں اس عالیشان کوٹھی کو کئی بار باہر سے دیکھتا ہوا گزرا تھا۔ آج اسے اندر سے دیکھنے کا موقع ملا۔ ڈرائنگ روم کی آرائش اور قیمتی سامان دیکھ کر میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ میرے چہرے سے شدید حیرانی ظاہر ہو رہی تھی اور وہ میری حالت پر مسکرا رہی تھی اس نے پوچھا۔ "کیسا ہے؟"

میں نے کہا۔ "یہ تو محل ہے۔ میں نے محل دیکھا نہیں' سنا اور پڑھا ہے۔ آج دیکھ کر سوچ رہا ہوں محل بھی اتنا شاندار نہیں ہوتا ہوگا۔ ایک بات پوچھوں؟"

"ہاں پوچھو۔"

"تمہاری طرح امیر بننے میں کتنا وقت لگتا ہے؟"

وہ ہنستے ہوئے بولی۔ "محنت کرتے کرتے لوگوں کی زندگیاں ختم ہو جاتی ہیں پھر بھی وہ محتاج رہتے ہیں اور کوئی ایک رات میں امیر بن جاتا ہے۔"

"کیسے بن جاتا ہے؟"

"یہ تو میں نہیں جانتی ہاں ڈیڈی کو کہتے سنا ہے دولت مقدر سے نہیں مکاری سے ملتی ہے۔"

"کیا تمہارے ڈیڈی مکار ہیں؟"

"شٹ اپ! پھر ایسی بات نہ پوچھنا۔"

میں چاروں طرف گھوم گھوم کر ایک ایک چیز کو دیکھنے لگا۔ میری نظریں پوچھ رہی تھیں' میرے پاس یہ سب کچھ کیوں نہیں ہے؟ میں بھی تو اسی دنیا میں رہتا ہوں۔ کیا درخشاں کا باپ انسان ہے' میں انسان نہیں ہوں؟

میرے جیسے خیالات والے لیڈر ہوتے ہیں۔ انقلاب لانے والے لیڈر' امیری اور غریبی کا فرق مٹانے والے لیڈر' جب وہ غریبی کو نہیں مٹا پاتے تو غریبوں کو مٹا دیتے ہیں اور لیڈری کی کمائی سمیٹ کر فارن کنٹری چلے جاتے ہیں۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ لیڈر کس طرح کمائی کرتے ہیں۔ یہ میری کمزوری ہے کہ میں کسی بھی جذباتی معاملے میں بے چین ہو جاتا ہوں۔ اس وقت ثمینہ کی طرف سے بے چینی ختم ہو گئی

تھی' ویسا ڈرائنگ روم والا دولت مند بننے کی بے چینی شروع ہو گئی تھی۔ میں نے پوچھا۔ "تمہارے ڈیڈی کیا کرتے ہیں؟"

"ریٹائرڈ پولیس انسپکٹر ہیں۔ انہوں نے صرف دس برس ملازمت کی۔ اب بزنس کرتے ہیں۔"

"بزنس کیا ہے؟"

"یہ تو وہ کسی کو نہیں بتاتے' کہتے ہیں بڑا آدمی وہی ہوتا ہے جو اپنی مٹھی بند رکھتا ہے' کھول کر کسی کو نہیں دکھاتا۔"

میں نے فوراً اپنا دایاں ہاتھ دیکھا۔ مٹھی بندھی ہوئی تھی یہ خوبی تو میری پیدائشی تھی۔ پہلے میں سوچ سوچ کر کڑھتا تھا کہ یہ کتنی بری عادت ہے' اب سمجھ میں آیا' مٹھی کو بند رہنا چاہئے۔ اسے کھولنے سے آدمی کا بھرم کھل جاتا ہے۔

اس رات میں بڑی دیر تک کروٹیں بدلتا رہا اور سوچتا رہا کہ کم محنت سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ رقم کس طرح حاصل کی جا سکتی ہے؟ درخشاں کا یہ احسان تھا کہ اپنی کوٹھی کا ڈرائنگ روم دکھا کر مجھ میں بڑا آدمی بننے کی لگن پیدا کر دی تھی ورنہ میں عشق میں نکما ہو جاتا۔

دوسرے دن میں نے ایک کلاس فیلو کی جیب میں بہت سے نوٹ دیکھے' اس سے کہا۔ "یار تم تو دولت مند لگ رہے ہو۔"

وہ اسکول کے سامنے والی دکان سے سگریٹ خرید کر پی رہا تھا۔ اس نے مجھے ایک سگریٹ پیش کیا۔ میں نے کہا۔ "ہم طالب علم ہیں' ہمیں ایسی چیزوں سے دور رہنا چاہئے۔ یہ صحت کے لئے مضر ہے۔"

وہ بولا۔ "یہ تو سگریٹ کی ڈبیا پر بھی لکھا ہوا ہے۔ بھئی یہ مضر ہے تو فروخت کیوں جائز ہے۔ اگر فروخت جائز ہے تو پھر یہ مضر نہیں ہے۔ عورتوں کو بازار میں بیٹھنے کا لائسنس دے کر بولو کہ یہ علاقہ ممنوعہ ہے تو کیا لوگ ان عورتوں کے پاس جانا چھوڑ دیں گے؟ یہ سب احمقانہ باتیں ہیں۔ جب تک حکومت سگریٹ اور عورت کی دلالی کرتی رہے گی' یہ نیک کام ہوتے رہیں گے۔"

"بھئی تم کہاں کی باتیں لے بیٹھے' میں اتنے سارے نوٹوں کی بات پوچھ رہا ہوں۔"

"مت پوچھو تم کتابیں پڑھنے میں ذہین ہو۔ دنیا کو ذہانت سے نہیں مکاری سے پڑھنا اور سمجھنا ہوتا ہے اور یہ تمہارے بس کی بات نہیں ہے۔"

مجھے درخشاں کی بات یاد آئی۔ اس کا باپ کہتا تھا' دولت مقدر سے نہیں مکاری سے ملتی ہے۔ میرا کلاس فیلو صمد خان بھی مکاری کا حوالہ دے رہا تھا۔ میں نے کہا۔ "میں دنیا کو سمجھنا چاہتا ہوں' خواہ مکاری سے سمجھنا پڑے۔"

"تو پھر آج رات میرے ساتھ پاشا کے اڈے پر چلو۔"

"وہاں کیا ہوگا؟"

"ہوگا نہیں' ہوتا ہے۔ زبردست جوا ہوتا ہے۔ ایک رات میں لاکھوں روپے اس جیب سے اس جیب میں پہنچ جاتے ہیں۔"

ایک رات میں لاکھوں روپے کی بات سن کر میری سانس اوپر کی اوپر رہ گئی۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام کر بڑے اشتیاق سے کہا۔ "میں ضرور تمہارے ساتھ چلوں گا۔"

میرا وہ دن بڑے اضطراب میں گزرا۔ شام کو درخشاں کے ہاں آیا۔ وہ کتابیں لے کر ڈرائنگ روم میں آئی پھر میرے پاس صوفے پر بیٹھ گئی' میں نے کہا۔ "تمہاری کوٹھی میں بڑی خاموشی رہتی ہے جیسے یہاں کوئی رہتا نہ ہو۔ تمہارے والدین کہاں ہیں؟"

"ڈیڈی شام کو چھ بجے آتے ہیں۔ ممی شاپنگ کے لئے گئی ہیں ارے ہاں' تمہارے لئے بھی شاپنگ کرنی ہے۔"

"میرے لئے؟"

"ہاں یہ سستے سے کپڑے پہننے سے سستے لگتے ہو۔ تمہیں خود کو جاذب نظر بنانا چاہئے۔"

"جب مہینہ پورا ہونے پر تین سو دو گی تو نئے کپڑے سلواؤں گا۔"

وہ ہنستے ہوئے ہاتھ پکڑ کر بولی۔ "چلو اٹھو' تمہاری تمام ضرورت کی چیزیں میں خریدوں گی۔"

میں اٹھ گیا۔ یہ ضرور چاہتا تھا کہ لباس اور حلیہ بدل جائے۔ بڑا نہیں ہوں مگر بڑا آدمی دکھائی دوں۔ میں نے اوپری دل سے انکار کیا۔ "نہیں درخشاں! یہ میری

غیرت گوارا نہیں کرتی کہ ایک لڑکی مجھے کچھ خرید کر دے۔"

"کیا میں تمہاری نظروں میں صرف ایک لڑکی ہوں؟"

"تم تو میرے لئے سر کا آسمان ہو۔ مگر تمہارے دیئے ہوئے کپڑے پہن کر میں لوگوں سے کیا کہوں گا؟"

"کچھ کہنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔"

"سوچتا ہوں کبھی تم نے کچھ کہہ دیا تو سبکی ہو جائے گی۔"

"میں تمہارے لئے جو کروں گی اس کا ذکر زبان پر نہیں لاؤں گی۔"

میں اس کے ساتھ شاپنگ کے لئے گیا۔ کوٹھی میں ماں باپ اور بیٹی کے لئے الگ الگ کاریں تھیں۔ اس نے ڈرائیور سے کہا۔ "آج شاپنگ کے بعد سے شریف صاحب کو کار چلانا سکھاؤ۔ کیا ایک ہفتے میں سکھا دو گے؟"

"جی' بی بی جی!"

وہ میرے قریب جھک کر کان میں بولی۔ "ڈرائیور کی موجودگی میں باتیں نہیں ہوسکتیں تم گاڑی چلاؤ گے تو تیسرا کوئی سننے والا نہیں ہوگا۔"

میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا کیونکہ کان میں بولتے وقت وہ مجھ پر لد گئی تھی۔ حد کر رہی تھی۔ اپنے بدن کا تعارف پیش کر رہی تھی۔ خربوزے پر خربوزے کا رنگ جما رہی تھی۔ اپنی رقم سے مجھے کپڑے پہنانے سے پہلے اپنی جوانی کے جملہ حقوق کا ٹھپا لگا رہی تھی۔ میں پسینہ پسینہ ہوگیا۔

اس روز اس نے ایک درجن سوٹ میرے لئے سلوائے۔ درزی سے کہا کہ روز ایک سوٹ سلائی کرکے مجھے دے۔ پھر اس نے دو جوڑے جوتے' جرابیں' شیونگ کا قیمتی سامان' کریم' لوشن اور شیمپو وغیرہ ایسی ایسی چیزیں خریدیں جنہیں میں نے پہلے کبھی استعمال نہیں کیا تھا۔ پھر مجھ سے کہا۔ "کل نیا سوٹ پہن کر آنا۔ میں ڈیڈی سے ملاؤں گی اور تمہاری ملازمت پکی کروں گی۔"

میں نے پہلی بار اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "سچ کہتا ہوں' میں نے سب کو بھلا دیا ہے۔ تم سے بچھڑ کر صرف تمہیں یاد رکھتا ہوں۔"

وہ خوش ہوگئی۔ جب میں قیمتی سامان لے کر گھر پہنچا تو میرے والدین اور بہن بھائی حیران رہ گئے۔ ابو نے پوچھا۔ "تمہارے پاس کتنی دولت آگئی ہے جو یہ غیر

ضروری چیزیں خرید لائے ہو۔ چھوٹی بہنوں اور بھائیوں کے لئے کپڑے نہیں لا سکتے تھے؟"

میں نے کہا۔ "آپ نے ایک محدود زندگی گزاری ہے اس لئے مجھے بھی گھر کی چار دیواری تک محدود رکھنا چاہتے ہیں۔ اب مجھے اونچی سوسائٹی میں جانا ہوتا ہے' بڑے بڑے لوگوں سے ہاتھ ملاتا ہوں کل سے ہر روز ایک نیا سوٹ پہنا کروں گا۔"

سب کے منہ حیرت سے کھل گئے۔ ابو نے پوچھا۔ "یہ تو بتاؤ' تمہارے پاس رقم کہاں سے آ رہی ہے؟"

میں نے جھوٹ کہہ دیا۔ "مجھے ملازمت مل گئی ہے۔ ایک ہزار روپے تنخواہ ہے۔"

امی خوشی سے کِھل گئیں۔ میری بلائیں لیتی ہوئی بولیں۔ "میرا بیٹا باپ سے بڑھ گیا۔ تمہارے باپ نے تو چھ سو روپے سے کبھی ایک پیسہ زیادہ نہیں دکھایا۔ بیٹا میرے ہاتھ پر ہزار روپے لا کر رکھے گا۔"

بہن بھائی مجھ سے آ کر لپٹ رہے تھے۔ طرح طرح کی فرمائشیں کر رہے تھے۔ ابو کے پاس کوئی نہیں جا رہا تھا۔ وہ چھ سو کے آدمی تھے میں نے ہزار کی بولی دے کر ان سے اقتدار چھین لیا تھا۔ اس گھر میں اب میری حکومت قائم ہو رہی تھی۔ پھر ابو نے آ کر میرے شانے پر ہاتھ رکھا اور کہا۔ "کوئی حاکم اقتدار چھوڑ کر دوسرے کو نہیں دیتا لیکن باپ اپنے گھر کی حکومت جوان بیٹے کو بخوشی سونپتا ہے اور اسی دن کے خواب دیکھتا ہے کہ بیٹا بڑا ہو کر باپ کے کاندھوں سے بوجھ اتارے گا۔ آج تم نے میرے خواب کو پورا کر دکھایا۔ اس گھر کی ذمے داریاں اب تمہارے سر ہیں۔"

ان لمحات میں مجھے دو مختلف ماحول نظر آئے۔ میں ابھی جہاں سے آیا تھا وہاں مغربی تہذیب تھی۔ دولت کی فراوانی اور درخشاں کی چنک منک تھی۔ وہ میرے ساتھ سینہ تان کر چلتی تھی۔ یہاں اپنے گھر میں مشرقی تہذیب کے طور طریقے تھے۔ میں نے اپنی امی اور بہنوں کو کبھی اونچی آواز میں بولتے نہیں سنا تھا۔ ان کے سروں سے کبھی آنچل ڈھلکتا تو وہ فوراً دوبارہ اسے سر پر رکھ لیتی تھیں۔ گویا اب میں دو مختلف دنیا میں زندگی گزارنے والا تھا۔ دو کشتیوں میں پاؤں رکھ کر سفر کرنے والا دریا میں ضرور گرتا

ہے۔ یہ بات اس وقت میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

رات کو میں صمد خان کے ساتھ پاشا بھائی کے اڈے پر پہنچا۔ وہاں ایک بڑا ہال تھا اور مختلف کمرے تھے۔ ہر جگہ جوا کھیلنے والوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ کہیں ایک کانٹے کو گردش میں لایا جا رہا تھا۔ مختلف نمبروں پر داؤ لگانے والے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے کہ گردش کرنے والا کانٹا کس نمبر پر رکنے والا ہے۔ سگریٹ نوشی کی کثرت سے ہر جگہ دھواں بھرا ہوا تھا۔ دیسی شراب کی بُو پھیلی ہوئی تھی۔ ان دنوں شراب پر پابندی نہیں تھی۔ لوگ شراب خانوں اور قمار خانوں میں آزادی سے بیٹھ کر پیتے تھے۔

صمد خان نے پوچھا۔ "داؤ لگاؤ گے؟"

"مجھے جوا کھیلنے نہیں آتا۔"

"مجھے بھی نہیں آتا تھا۔ مگر آج صبح تم نے میری جیب میں نوٹ ہی نوٹ دیکھے تھے' میں یہیں سے جیت کر گیا تھا۔"

"میرے پاس رقم نہیں ہے۔"

"مجھ سے ادھار لے لو۔ اگر ہار دو گے تو کل یہ رقم ادا کر دینا۔ جیت جاؤ گے تو میں اپنی رقم نہیں لوں گا۔ جیت میں حصہ برابر ہو گا۔"

اس نے مجھے سو روپے دیئے میں ایک میز پر دو جواریوں کے ساتھ کھیلنے بیٹھ گیا۔ تاش کے پتے پھینٹے گئے بانٹے گئے۔ میں پہلی ہی بازی میں ستر روپے ہار گیا۔ پریشان ہو کر وہاں سے اٹھ گیا۔ میرے لئے ستر روپے بہت تھے۔ یوں لگ رہا تھا۔ جیسے دو جواریوں نے مجھے جوتے مار کر روپے چھین لئے ہوں۔ ایک نے میرا بازو پکڑ کر جبراً بٹھاتے ہوئے کہا۔ "کہاں جاتا ہے باؤ' ایک بازی میں ڈر گیا۔ مرد کا بچہ نہیں ہے؟"

دوسرے نے کہا۔ "ابھی تیری مٹھی میں بہت کچھ ہے لگا دے داؤ پر۔"

"میری مٹھی میں کچھ نہیں ہے۔ یہ اسی طرح بند رہتی ہے۔"

اس نے کہا۔ "اسے کھول کر دکھا۔"

میں نے کہا۔ "میں صرف ضرورت کے وقت اسے کھولتا ہوں۔"

میں بازو چھڑا کر اٹھ گیا۔ دوسری میز پر صمد خان کے پاس آیا اس نے پوچھا۔

"ہار گیا؟"

میں نے پوچھا۔ "تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "جیتنے والے اور زیادہ جیتنے کے لالچ میں کھیلتے رہتے ہیں۔ تمہاری طرح اٹھ کر نہیں آتے۔"

میں نے اسے تیس روپے واپس کرتے ہوئے کہا۔ "تم نے مجھے ڈبو دیا۔ اب یہ فکر ستائے گی کہ ستر روپے کہاں سے ادا کروں گا۔"

وہ ایک بازی ہار گیا تھا مجھ سے بولا۔ "دیکھو میرے ڈیڑھ سو چلے گئے مگر میں تمہاری طرح روتا نہیں ہوں۔"

وہ پھر کھیلنے لگا۔ ایک شرابی لڑکھڑاتا ہوا میرے پاس آیا۔ پھر میرا دایاں ہاتھ پکڑ کر بولا۔ "ادھر اس میز پر وہ باتیں کر رہے ہیں۔ کہتے ہیں تم نے مٹھی میں کچھ چھپا رکھا ہے۔"

میں نے ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا۔ "بکواس ہے۔ میں نے کچھ نہیں چھپایا ہے۔"

وہ ہنستے ہوئے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "میں نے ان سے کہا ہے کہ تم نے ایسی کوئی چیز نہیں چھپائی جو نظر آئے جو نظر نہ آئے وہ چیز چھپائی ہے۔"

پھر وہ میرے قریب ہو کر تیز سرگوشی میں بولا۔ "تم اس مٹھی میں اپنا مقدر لے کر آئے ہو۔ بولو مانتے ہو؟"

میں نے پیچھا چھڑاتے ہوئے کہا۔ "بھئی تم نشے میں ہو۔ زمین پر رہ کر آسمان کی باتیں کر رہے ہو۔"

"کوئی آسمان کی باتیں کرے تو اسے بھی سن لیا کرو۔"

"مجھے معاف کرو میں زمین پر ستر روپے ہار چکا ہوں۔"

"نہیں، تم کبھی نہیں ہار سکتے۔"

"میں ہار چکا ہوں۔"

"میرے سامنے کھیلو جس کا مقدر اس کی مٹھی میں ہو وہ کبھی نہیں ہارتا۔"

"میرے پاس کھیلنے کے لئے رقم نہیں ہے۔"

"رقم میں لگاؤں گا، ہار میری، جیت میں آدھا آدھا۔"

میں نے اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھا، اس نے کہا۔ "جب تمہارا کوئی

نقصان نہیں ہے تو سوچتے کیا ہو؟"

وہ میرا ہاتھ پکڑ کر باتیں کرتے ہوئے اپنی دانست میں جوا کھیلنے کا نیک مشورہ دیتے ہوئے ایک کمرے میں آیا۔ وہاں لوگ فرش پر بیٹھے ہوئے پانسا پھینکنے پر شرطیں لگا رہے تھے۔ ہم وہاں بیٹھ گئے۔ جب ایک بازی ہو گئی تو شرابی نے پانسا اٹھا کر میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ جوان پانسا پھینکے گا۔ تم میں سے کوئی بھی نمبر بولے مگر سو سو کی بازی ہو گی۔"

اس نے مجھے پانسا دیا میں نے اسے مٹھی میں دبالیا۔ سب کی نظریں میری بند مٹھی پر جم گئیں جیسے سب ہی سمجھنے کی کوشش کر رہے ہوں کہ میری مٹھی سے کون سا نمبر لڑھک کر سامنے آئے گا۔ پھر ایک نے سو روپے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ "نمبر چھ۔ اگر تمہارے جوان نے چھکا نہ پھینکا تو میں تمہارے سو لے جاؤں گا۔"

شرابی نے سو کا نوٹ رکھتے ہوئے کہا۔ "منظور ہے۔ پانسا پھینک جوان۔"

میں نے دھڑکتے ہوئے دل سے اپنی بند مٹھی کو دیکھا پھر اسے کھولتے ہوئے پانسا پھینکا۔ وہ فرش پر لڑھکتا ہوا جب رکا تو چاروں طرف سے شور بلند ہوا۔ "چھکا" میری بند مٹھی نے مقدر کے حکم سے چھکا دکھایا تھا۔

اس نے ہارنے والے کے سو روپے اٹھا لئے۔ وعدے کے مطابق مجھے جیت کا آدھا یعنی پچاس روپے دیئے۔ پھر سو روپے سامنے رکھ کر کہا۔ "ہے کوئی شرط لگانے والا۔ سو روپے میں نمبر بولو، سو روپے۔"

میں نے اس کا سو کا نوٹ اٹھا کر اسے دیتے ہوئے کہا۔ "سو نہیں صرف چالیس روپے کی شرط لگاؤ۔"

وہ بولا۔ "جوان گھبراتے کیوں ہو جیت ہماری ہو گی، ہارنے سے میری رقم ڈوبے گی۔"

میں نے کہا۔ "نہیں چالیس روپے کی شرط لگاؤ گے تو میں پانسا پھینکوں گا مجھ سے بحث نہ کرو۔"

"ہاں ہاں، مقدر سے حجت نہیں کرنا چاہئے۔ چلو چالیس روپے۔"

ایک نے چالیس روپے رکھتے ہوئے کہا۔ "نمبر دو۔"

شرابی نے ترنگ میں آ کر کہا۔ "پھینک جوان۔"

میں نے بند مٹھی کھولتے ہی پانسا پھینکا۔ وہ فرش پر لڑھکتا ہوا ذرا دور جا کر رک گیا۔ پھر ایک شور بپا ہوا "دکی" مقدر نے پھر ساتھ دیا تھا۔ شرابی نے چالیس اٹھا کر بیس مجھے دیئے میں نے وہاں سے اٹھ کر کہا۔ "خدا حافظ۔"

وہ جلدی سے کھڑا ہو گیا۔ میرا ہاتھ پکڑ کر بولا۔ "کیا کرتے ہو' مقدر کو لات مار کر جاتے ہو۔"

"اگر اب میں کھیلوں گا تو مقدر مجھے لات مار دے گا۔ میں صرف ستر روپے حاصل کرنا چاہتا تھا۔ وہ حاصل ہو گئے ہیں۔ میں ابھی قرض ادا کروں گا پھر کبھی یہاں نہیں آؤں گا۔"

"بے شک قرض ادا کرو لیکن آگے کھیلنے میں تمہارا نقصان کیا ہے۔ رقم میری ہے نقصان ہو گا تو میرا ہو گا۔"

"دیکھو' میں جوان ہوں ناتجربہ کار ہوں۔ مگر سمجھ دار بچے اپنے والدین کی باتیں سمجھتے ہیں۔ مجھے یاد ہے' میرے ابو نے ایک بار کہا تھا کہ انہوں نے کبھی کسی جواری کو دولت مند بنتے نہیں دیکھا۔ سب کو گھر لٹاتے دیکھا ہے۔ میرے باپ کی باتیں کبھی جھوٹ نہیں ہوتیں۔"

وہ میری ٹھوڑی پکڑ کر عاجزی سے بولا۔ "جوان! میں اپنا گھر لٹا رہا ہوں تمہارا نقصان ہو تو اپنے باپ کی باتوں پر عمل کر کے یہاں سے چلے جانا۔"

میں پھر انکار کرنا چاہتا تھا اس نے فرش پر بیٹھ کر میرے پاؤں پکڑ لئے۔ مجھے بڑی شرم آئی۔ وہ عمر میں میرے باپ کے برابر تھا۔ کسی محنت کے بغیر دولت کمانے کی ہوس نے اسے میرے پیروں پر گرا دیا تھا۔ میں نے اسے اٹھاتے ہوئے کہا۔ "چلو میں کھیلوں گا۔"

میں نے بڑے ہال میں جا کر صمد کے ستر روپے دیئے۔ پھر اس کمرے میں آ کر بیٹھ گیا۔ وہ بوڑھا شرابی سو روپے کی شرط لگا چکا تھا۔ مجھ سے بولا "تکی پھینکو" میں نے مٹھی کھول کر پانسا پھینکا تو پھر چھکا آیا۔ وہ پہلے جس چھکے پر سو روپے جیت چکا تھا اسی چھکے پر سو روپے ہار گیا۔ میں نے پوچھا۔ "اب کیا کہتے ہو؟"

"کوئی بات نہیں' ایسا ہوتا ہے۔ پھر رہی سو کی شرط۔"

اس بار جس نے شرط لگائی وہ ہار گیا۔ بوڑھا شرابی جیت گیا۔ جوئے میں

تقدیر برابر ساتھ نہیں دیتی۔ اکثر ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔ مگر جواری ہار کو نہیں ایک آدھ جیت کو یاد رکھتا ہے اور پھر جیتنے کی امید پر ہارتا جاتا ہے۔ میں ہر بازی پر پانسا پھینکتا رہا۔ وہ ایک بار جیت کر دو چار بار ہارتا جاتا تھا۔ رات کے دو بجے تک وہ تین ہزار روپے ہار چکا تھا جیب خالی ہو گئی تھی۔ وہ فرش پر ایسے بیٹھ گیا جیسے غبارے سے ہوا نکل گئی ہو۔

میں نے کہا۔ "اٹھو اب گھر جاؤ۔"

وہ میرا ہاتھ پکڑ کر دوسرے ہاتھ سے میری ٹھوڑی پکڑ کر بولا۔ "ہم نے جو بازیاں جیتی تھیں ان کی آدھی رقم تمہیں ملتی رہی۔ تمہارے پاس تو کافی مال ہو گا؟"

"ہاں تقریباً سات سو ہیں۔"

"جوان! مجھے ادھار دو۔ اس بار میں جیت لوں گا۔"

"بڑے میاں! آج میں پہلی بار یہاں آیا ہوں اور پہلا سبق یہ سیکھ کر جا رہا ہوں کہ اپنی رقم سے یا ادھار کے پیسوں سے جوا نہیں کھیلنا چاہئے اور نہ کسی کو کھیلنے کے لئے ادھار دینا چاہئے۔ میری رقم ڈوبے گی تو کہاں سے دو گے؟"

"میں گھر چل کر دوں گا۔"

"تو پھر گھر جا کر لے آؤ۔"

"جا کر آنے میں صبح ہو جائے گی۔"

"تو اگلی رات آئے گی' زندہ رہو تو کھیل لینا۔"

"دیکھو' میں تمہیں بیٹا کہتا ہوں۔ تمہارے پاؤں پڑتا ہوں مجھے پانچ سو ادھار دے دو۔"

اس سے پہلے کہ وہ میرے پاؤں پکڑتا میں فوراً پیچھے ہٹ گیا پھر تیزی سے چلتے ہوئے جانے لگا لیکن وہ میرا پیچھا نہیں چھوڑتا تھا۔ پیچھے سے قمیض کا دامن پکڑ کر کہتا آ رہا تھا۔ "میں گھر نہیں جا سکوں گا' کسی کو منہ نہیں دکھا سکوں گا' میری بیٹی کی شادی نہیں ہو سکے گی' گھر میں ماتم ہو گا۔"

میرے قدم رک گئے میں نے پوچھا۔ "کیا جوئے کی کمائی سے بیٹی کی شادی کرنا چاہتے تھے؟"

"شادی جس رقم سے ہونے والی تھی' وہ رقم ہار چکا ہوں۔ کل دس ہزار گئے

آج پانچ ہزار ڈوب گئے۔ میری گھر والی نے سوچا تھا۔ دس ہزار میں زیورات لے گی اور پانچ ہزار میں باراتیوں کا کھانا ہوگا۔ اب تو کچھ نہیں ہو سکے گا۔ اگر تم مجھے پانچ سو ادھار دے دو تو میں پندرہ ہزار کیا تیس ہزار جیت کر گھر لے جاؤں گا۔"

میں نے غصے سے کہا۔ "تم بوڑھے نہ ہوتے تو تھپڑ مار دیتا۔ تمہیں شرم نہیں آتی جوان بیٹی کی بارات آنے والی ہے اور اسے سہاگن بنانے کے پندرہ ہزار روپے تم جوئے میں ہار گئے میں تمہارے منہ پر کیا تھوکوں' دنیا تھوکنے والی ہے۔"

میں نے جیب سے تمام روپے نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا۔ "یہ کیلیں تمہارے سینے میں چبھ رہی ہیں۔ انہیں اپنی غیرت کے تابوت پر ٹھونک دو۔ اگر یہ رقم بھی ہار گئے تو گھر نہ جانا' کہیں ڈوب مرنا۔"

میں وہاں سے چلا آیا۔ رات کے تین بج گئے تھے۔ میں آج تک رات نو بجے کے بعد گھر سے باہر نہیں رہا تھا۔ اپنے ابو اور گھر والوں کو بھی رات گیارہ بجے کے بعد جاگتے نہیں دیکھا تھا اور صبح اذان کے وقت سوئے ہوئے نہیں پایا تھا۔ والدین کہتے تھے کہ ہر کام وقت کے مطابق باقاعدگی سے کیا جائے تو غلطی کے امکانات کم ہوتے جاتے ہیں۔ میں اتنے بااصول گھرانے میں پیدا ہوا تھا اور اب بے اصولی سے پہلی رات کے تین بجے گھر آیا تھا۔ ممتا کی ماری ماں جاگ رہی تھی وہ پریشان ہو کر بولیں۔ "کہاں رہ گئے تھے؟ کہاں سے آرہے ہو؟ خیریت تو ہے؟"

میں نے کہا۔ "آپ پریشان نہ ہوں۔ اونچی سوسائٹی میں رات گئے تک فنکشنز جاری رہتے ہیں۔ میں آئندہ بھی دیر سے آیا کروں گا۔"

انہوں نے کہا۔ "بیٹا! یہ اونچی سوسائٹی ماہانہ ہزار روپے دے کر تم سے باپ دادا کے طور طریقے چھین رہی ہے۔"

"آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں؟"

ابو نے آنگن میں آتے ہوئے کہا۔ "تمہاری ماں درست کہہ رہی ہے۔ کوئی شریف آدمی رات کو گھر سے باہر نہیں رہتا۔ رات کو اُلو جاگتے ہیں یا چور یا بدمست شرابی اور عیاش۔"

امی نے کہا۔ "بیٹے! میری ایک بات مان لو۔ اپنے باپ کی طرح چھ سو کماؤ' ہمیں زیادہ لالچ نہیں ہے۔ تمہارے ہزار روپوں سے بہت ڈر لگ رہا ہے۔"

میں سر جھکا کر بستر کی طرف جانے لگا۔ ابو نے کہا۔ "کل سے مغرب کے وقت گھر آجایا کرو۔"

جوتے اتار کر بستر پر لیٹ گیا۔ میرے گھر والوں کو ہزار روپے کی ملازمت سے جتنی خوشی ہوئی تھی اتنا ہی وہ خوفزدہ ہو رہے تھے۔ میں بھی دل میں تسلیم کر رہا تھا کہ ان سے جھوٹ بولنے لگا ہوں اور گھر کے دستور کے خلاف چلنے لگا ہوں۔ میں دن کو گیارہ بجے سو کر اٹھا۔ جبکہ فجر کی اذان کے وقت چھوٹے بہن بھائی بھی اٹھ جاتے ہیں۔ وہ سب مجھے تعجب سے دیکھ رہے تھے۔ گھر میں پہلی بار ایسا ہوا تھا۔ میں نے جھینپ کر کہا۔ "جاؤ یہاں سے' کیا میں کوئی عجوبہ ہوں؟"

امی نے آنگن میں مسالہ پیستے ہوئے کہا۔ "بچے بھی حیران ہیں اور بڑے بھی' یہ کیسی ملازمت ہے جو تمہیں گھر میں آدھے دن تک سلائے رکھتی ہے؟"

مجھے یاد آیا' میں ہزار روپے والی ملازمت کی خوشخبری سنا چکا ہوں اور کام کے وقت گھر سے باہر نہ جا کر آرام سے سو رہا ہوں۔ میں بستر سے اٹھ کر باہر جانے کے لئے تیار ہونے لگا۔ جھوٹ بول کر پھنس گیا تھا۔ درخشاں نے ملازمت دلانے کا وعدہ کیا تھا۔ کوئی ضروری نہیں تھا کہ اس کا باپ مجھے نوکری سے لگا دیتا۔ اگر نوکری مل بھی جاتی تو ایک ہزار بہت بڑی رقم ہوتی ہے۔ سرکاری ملازمین ترقی کرتے کرتے بڑھاپے میں ایک ہزار روپے کی تنخواہ تک پہنچتے ہیں۔ ایسی صورت میں ملازمت نہ ہوئی تو میں گھر والوں کو کہاں سے ہزار روپے لا کر دوں گا۔

اسکول میں باقاعدہ پڑھائی نہیں ہو رہی تھی۔ امتحانات کے نتیجے کا انتظار ہو رہا تھا۔ طلبا اور طالبات ایک دوسرے سے ملنے آتے تھے۔ درخشاں انتظار کر رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی بولی۔ "کہاں رہ گئے تھے؟ میں تو اب مایوس ہو کر جانے والی تھی۔"

درخشاں اتنی دیر سے انتظار کر رہی تھی۔ جوانی میں جوانی ہمارا انتظار کرتی ہو تو خوشی ہوتی ہے۔ پیار کے جذبات مچلتے ہیں۔ عجیب بات ہے ماں نے ساری رات انتظار کیا مگر کوئی جذبہ نہیں جاگا۔ کوئی خوشی یا کوئی اخلاقی حس پیدا نہیں ہوئی۔ جذبے بھی نئے اور پرانے ہوتے ہیں۔ ماں پرانی ہو گئی تھی۔ کبھی ردی کی ٹوکری میں کوئی گمشدہ چیز تلاش کروں گا تو وہاں ممتا پڑی ملے گی۔

یہ باتیں جوانی مین سمجھ میں نہیں آتیں۔ درخشاں نے پوچھا۔ "درزی کے پاس

گئے تھے؟"

"دوپہر کو جاؤں گا۔"

"اور دوپہر کب ہوگی۔ ایک بجا ہے۔ ابھی چلو اپنا سوٹ لو اور حلیہ بدلو۔"

میں اس کے ساتھ کار میں بیٹھ کر ٹیلر ماسٹر کے پاس آیا۔ سوٹ تیار تھا' وہ بولی "میری کار میں جاؤ نکٹائی اور جوتوں کے ساتھ اسے پہن کر آؤ۔"

ہم پھر کار کی پچھلی سیٹ پر آگئے۔ میں یہ سوچ کر پریشان ہوگیا کہ وہ بھی میرے گھر جا رہی ہے۔ کوٹھی کے مقابلے میں ہمارا گھر چھوٹا سا تھا۔ چار کمرے اور بڑے سے آنگن والا مکان بھی درخشاں کے وجود کے سامنے حقیر سا لگ رہا تھا۔ پھر یہ کہ گھر کے تمام افراد معمولی سا سوتی لباس پہن کر رہتے تھے۔ درخشاں سے ان کا تعارف کراتے ہوئے شرم محسوس ہوتی۔ بیچارے میرے گھر والے بہت غریب تھے۔ میں بہت امیر تھا' ایک نیا سوٹ پہننے جا رہا تھا۔

میں نے پوچھا۔ "کیا تم بھی میرے گھر چلو گی؟"

اس نے کہا۔ "ڈرائیور کہہ رہا تھا کہ تمہارے علاقے میں ٹین کی چھت والے مکانات اور اونچی نیچی ٹوٹی پھوٹی سڑکیں ہیں' گرد بہت اڑتی ہے۔ کیا میرا میک اپ خراب ہو جائے گا؟"

"ہاں' تم ادھر نہ جاؤ تو بہتر ہے۔"

ڈرائیور نے اسے کوٹھی کے سامنے اتار دیا۔ میں نے اطمینان کی سانس لی۔ گھر کی طرف جاتے ہوئے میں کار چلانا سیکھتا رہا تھا۔ کار چلانے کا یہ دوسرا دن تھا۔ میں نے گھر پہنچ کر غسل کیا۔ زندگی میں پہلی بار شیمپو سے سر کے بال دھوئے' مہنگے سامان سے شیو کیا۔ سوٹ پہن کر لباس پر خوشبو اسپرے کی تو پورا کمرا مہک اٹھا۔ ابو ڈیوٹی سے گھر آئے۔ دروازے پر کار دیکھ کر حیران رہ گئے۔ اندر آکر مجھے نئے سوٹ میں دیکھا' حیرانی اور بڑھ گئی۔ انہوں نے پوچھا۔ "لڑکی والے دیکھنے آرہے ہیں یا خود کو دکھانے جا رہے ہو؟"

میں نے دروازے کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ "میرا ایک ضروری اپائنٹ منٹ ہے۔"

امی نے کہا۔ "بیٹے! کیا تم تہذیب بھول گئے ہو۔ کیا یہ چھوٹی سی بات تمہیں یاد

نہیں ہے کہ بچے نئے کپڑے پہن کر بزرگوں کو سلام کرتے ہیں؟"

"امی آپ چھوٹی چھوٹی سی بات پکڑتی ہیں۔ لیجئے سلام عرض ہے۔ اسلام علیکم۔"

امی نے سلام کا جواب دیا۔ ابو نے پوچھا۔ "یہ کیسی ملازمت ہے کہ تمہیں کار لینے آتی ہے اور دولہا بنا کر لے جاتی ہے؟"

"میں واپس آکر باتیں کروں گا۔ مجھے دیر ہو رہی ہے۔"

"واپس آکر سچ بولنا۔ میرا تجربہ کہتا ہے' تم غلط دھندے میں پڑ گئے ہو۔"

"یہ غلط ہے ابو!"

"تو پھر دوسرا تجربہ کہتا ہے' چھوٹے گھروں سے لڑکیاں سولہ سنگھار کرکے نکلیں یا لڑکے' اس کا ایک ہی مطلب ہوتا ہے کہ ان کے دام لگ گئے ہیں۔ تمہارے قیمتی سوٹ پر لکھا ہوا ہے کہ تم برائے فروخت ہو۔"

میں نے بے اختیار گردن جھکا کر اپنے سوٹ کو دیکھا۔ جیسے سچ مچ وہاں لکھا ہوا ہو۔ میرے اندر کے چور نے کہا کہ میری مٹھی میں دبے ہوئے الفاظ لباس پر رقم ہو گئے ہیں۔ میں جلدی سے نظریں چرا کر باہر آگیا۔ کار میں بیٹھ کر کوٹھی کی طرف جاتے ہوئے سوچنے لگا۔ دنیا کے ہر ماں باپ بوڑھے ہو کر بوڑھی اور گھسی پٹی باتیں کرتے ہیں۔ وہ عروج اور کامرانی کا شارٹ کٹ راستہ نہیں جانتے اس لئے خواہ مخواہ تنقید کرتے ہیں۔

جب میں کوٹھی کے ڈرائنگ روم میں آیا اور درخشاں نے مجھے دیکھا تو تھوڑی دیر تک خوش ہو کر دیکھتی رہ گئی پھر میرے چاروں طرف گھوم کر نظریں ڈالتی ہوئی بولی "میں نے خیالوں میں تمہیں بارہا دیکھا تھا اور سوچا تھا تمہارے بدن پر قیمتی' سلیقے کا لباس ہوگا تو تم سپنوں کے شہزادے لگو گے۔ میں بہت خوش ہوں' میں نے بے ڈھب پتھر کو تراش کر ہیرا بنایا ہے۔"

میں نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔ "آج آئینہ دیکھ کر یقین ہوگیا کہ تم مجھے دل و جان سے چاہتی ہو۔ مجھے اپنی سطح پر لانا چاہتی ہو۔ اس کے لئے ایک احسان اور کرو۔ اپنے ڈیڈی سے کہہ کر کوئی اچھی سی ملازمت دلا دو۔"

وہ اپنا ہاتھ چھڑا کر بولی۔ "یہ قیمتی سوٹ پہن کر اور میرے برابر کھڑے ہو کر

چھوٹی باتیں نہ کرو۔ ہمیشہ محکوم رہنے والے لوگ نوکری کرتے ہیں۔"

"تم کیا چاہتی ہو؟ مجھے کیا کرنا چاہئے؟"

"تمہیں کچھ کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟"

"تو پھر زندگی کیسے گزرے گی؟"

"میرے ساتھ گزارتے رہو۔"

"اور میرے گھر والے؟"

"میں اپنے گھر والوں کو بیچ میں نہیں لارہی ہوں تم کیوں لارہے ہو؟"

"اس لئے کہ گھر والوں کی ذمہ داریاں لڑکوں پر ہوتی ہیں لڑکیوں پر نہیں' کیونکہ وہ بیاہ کر جاتی ہیں۔ تم بیاہ کر میرے ساتھ جاؤ گی۔"

وہ ہنسنے لگی۔ پھر ہنستے ہنستے میرے شانے پر ایک ہاتھ مارا اور صوفے پر گر پڑی۔ میں خود کو احمق سمجھ رہا تھا اور سمجھنا چاہتا تھا کہ ہنسانے والی کون سی احمقانہ بات کہہ دی ہے۔

وہ بولی۔ "بہت بدذوق ہو۔ حسن ہے' محبت ہے' عیش و عشرت ہے' ایسے میں کوئی بیوقوف شادی کے لئے نہیں سوچتا۔ تم سمجھتے ہو میرے ڈیڈی تم سے میری شادی کردیں گے۔ نان سینس! میں تو بیاہ کر یو کے یا اسٹیٹس جاؤں گی۔ تمہارے جیسے کو تو ڈیڈی نوکر بھی نہیں رکھیں گے۔"

ایسا جوتا کبھی کسی نے نہیں مارا جیسا اس نے مارا تھا۔ میں تلملا گیا۔ ایک دم سے چیخ کر بولا۔ "یو شٹ اپ! کیا تم نے میری انسلٹ کرنے کے لئے یہ کپڑے پہنائے ہیں؟ کیا تم مجھے اتنا گرا ہوا سمجھتی ہو کہ میں تمہارے باپ کا نوکر بن کر رہوں گا؟"

"تم ہی میرے باپ سے نوکری چاہتے تھے۔ پھر انسلٹ کیوں سمجھ رہے ہو۔"

"تم نے کیا سمجھ کر مجھ پر مہربانی کی ہے؟"

"میں تمہیں چاہتی ہوں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں آسمان ہوں اور تم زمین' میں دل سے مجبور ہوں۔ جب تک آزاد رہوں گی تمہارا ساتھ نہیں چھوڑوں گی۔"

"اور جب ساتھ چھوڑوگی تو گھر کا رہوں گا' نہ گھاٹ کا۔ میں میٹرک کا رزلٹ آنے سے پہلے مستقبل کے لئے جدوجہد کرنا چاہتا ہوں اور تم مجھے کنوئیں کا مینڈک بنا رہی ہو۔"

"تمہارے سامنے ایک بہت بڑی دنیا ہے۔ جاؤ اور دیکھو' کون تمہاری قدر کرتا ہے۔ اسکول کے تمام ٹیچر اور ہیڈ ماسٹر کہتے ہیں کہ تم صوبے بھر میں اول آؤ گے۔ اس دنیا میں تمہاری قابلیت کی کیا قیمت لگے گی۔ مجھے بتاؤ' میں اس سے زیادہ تمہیں دوں گی۔"

"میں اپنی غریبی اور محتاجی دور کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے لئے جتنی دولت کی ضرورت ہوتی ہے' وہ میں کمانا چاہتا ہوں۔ کسی طرح بھی کمانا چاہتا ہوں۔"

"کسی طرح بھی کمانا چاہتے ہو؟"

"ہاں' کسی طرح بھی۔"

"ٹھیک ہے' کچھ تو میں نے بھی سمجھ لیا ہے کہ دولت کے لئے تم غیرت کو نظر انداز کردیتے ہو۔ کوئی بھی لڑکی تمہیں قیمتی کپڑے پہنادے' کار میں سیر کرادے تو تم ایک مرد کی غیرت کو ہی نہیں پہلی محبوبہ کو بھی بھول جاتے ہو اور دوسری سے محبت کا دم بھرنے لگتے ہو۔"

"یہ جھوٹ ہے' میں نے ثمینہ سے محبت نہیں کی تھی' اس کے لئے ہمدردی اور افسوس کیا تھا۔ تم پر اس لئے پیار آیا کہ تم نے اس کے جانے کا دکھ مٹادیا۔ رہ گئے یہ قیمتی کپڑے تو اس کے لئے میں نے خود کو بیچا نہیں ہے۔ اس کے لئے صرف تمہارا ممنون رہتا ہوں۔"

"کیسی ممنونیت؟ کیا رشتہ ہے مجھ سے؟ اگر میں بیوی ہوتی تب بھی ایک مرد کی غیرت گوارا کرتی ہے کہ وہ عورت سے رقم لے کر جھوٹی شان دکھائے؟"

میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ میرے چہرے سے ظاہر ہونے والی ندامت جواب بن گئی تھی۔ میں نے کوٹ اتارتے ہوئے کہا۔ "میں کل سے اپنے اندر لڑ رہا ہوں اور خود کو جھوٹی تسلیاں دے رہا ہوں کہ بے غیرت نہیں ہوں۔ میرے ماں باپ قدامت پسند اور اصولوں کے غلام ہیں۔ وہ وقت کے ساتھ بدل نہیں سکتے۔ میں آنے والے کل کا سورج اپنے ہاتھوں سے لینے کے لئے خود کو بدل رہا ہوں۔ بس ایک ہی بات کو بھولتا رہا کہ کامرانی کا سورج بے غیرتی کے افق سے طلوع ہو رہا ہے۔"

میں نے کوٹ اتار کر اس کے قدموں میں پھینک دیا۔ پھر جوتے اور جرابیں اتارنے لگا۔ وہ بولی۔ "اس قدر جوش میں آنے سے پہلے یاد کرو' تم نے کہا تھا کہ کسی

طرح بھی دولت کمانا چاہتے ہو۔ اس کوٹھی میں جو شان و شوکت دیکھ رہے ہو' اس سے بھی زیادہ تمہیں حاصل ہو سکتا ہے۔ ابھی فیصلے کا وقت ہے جوش میں آکر چلے جاؤ گے تو پچھتاؤ گے۔"

میں نے اندر ایک بنیان اور پاجامہ پہنا ہوا تھا اوپر سے شرٹ اور پتلون اتار کر پھینکتے ہوئے کہا۔ "میں اپنی محنت سے دولت حاصل کروں گا۔"

"محنت بوڑھا کرتی ہے۔ دولت جوان بناتی ہے۔ تم یہ بات بڑھاپے میں سمجھو گے۔ جوانی میں یہ سمجھ لو کہ بے غیرتی سے دولت ملتی ہے۔ اس بے غیرتی کو مٹھی میں بند رکھو گے' مٹھی کبھی نہیں کھولو گے تو کوئی تمہیں بے غیرت نہیں سمجھے گا۔"

میں نے مٹھی کھول دی۔ پھر ہتھیلی فضا میں بلند کرتا ہوا وہاں سے دوڑتا ہوا کوٹھی کے باہر آیا۔ وہ پیچھے آتے ہوئے بولی۔ "رک جاؤ۔ مضحکہ خیز لگ رہے ہو۔ لوگ کیا سوچیں گے؟"

تھوڑی دیر پہلے میں شاندار قیمتی سوٹ میں وہاں آیا تھا۔ اب بنیان پاجامہ پہنے ننگے پاؤں دوڑتا جا رہا تھا۔ ڈرائیور اور وہاں کے ملازم حیرانی سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ کوٹھی کے احاطے سے نکل کر گلی میں آیا۔ پھر اسی طرح آہستہ آہستہ دوڑتا ہوا شاہراہ پر پہنچ گیا۔ دوڑتے وقت میری مٹھی بند ہو گئی تھی۔ ہمیں اپنی غلطی کو یا اپنی بے عزتی کو چھپانا آتا ہے۔ میں نے دوڑتے وقت اپنی بند مٹھی سے دنیا والوں کو سمجھایا کہ میری بے عزتی نہیں ہوئی ہے۔ کسی نے میرے کپڑے نہیں اتارے ہیں' میں تو اسپورٹس مین ہوں۔ شام کو جوگنگ کرتا جا رہا ہوں۔

گھر پہنچا تو امی' ابو' بھائی بہنیں سب مجھ شدید حیرانی سے تکنے لگے۔ میں آنگن میں پہنچ کر بری طرح ہانپ رہا تھا۔ امی پنکھا جھلنے لگیں' ابو نے پوچھا۔ "کیا ہوا؟ اس حلیے میں کہاں سے آ رہے ہو؟"

میں جواب دینا چاہتا تھا مگر ناک اور منہ سے سانسیں لے رہا تھا۔ ہانپنے کے باعث الفاظ ادا نہیں ہو رہے تھے۔ امی نے کہا۔ "اے جی! کیا پوچھ رہے ہو۔ ذرا بچے کو دم لینے دو۔"

"تمہارے بچے نے تو میری ناک میں دم کر دیا ہے۔ یہ اونچے پورے سانڈ کو تم بچہ کہتی ہو!"

میرے سات برس کے ایک بھائی نے پوچھا۔ "بچے نہیں ہیں تو پھر ننگے کیوں ہیں؟"

امی نے اسے گھور کر دیکھا' وہ چپ ہو گیا۔ میں اچانک ہی ابو کے قدموں کے پاس بیٹھ گیا۔ ان کے پاؤں پکڑ کر اپنے بھائی بہنوں سے کہا۔ "جاوید' فاطمہ' آمنہ' پپو! میں تم سب کے سامنے اعتراف کرتا ہوں کہ تمہیں بھی یہ باتیں زندگی بھر یاد رہیں۔ جو ماں باپ ایمان کے پکے اور اصولوں کے سچے ہوتے ہیں' ان کے زندگی گزارنے کا طریقہ کبھی غلط نہیں ہوتا۔ میں ایک غلطی کرنے گیا تھا مگر امی کی دعاؤں سے بال بال بچ کر آیا ہوں۔ میں نے وہ چمک دمک اور قیمتی کپڑے اتار دیئے ہیں۔ ہم کو اسی تہذیب پر چلنا چاہئے جو ہمیں اچھے اور نیک والدین سے ملتی ہے۔"

ابو نے مجھ کو اٹھا کر گلے سے لگاتے ہوئے کہا۔ "میرے بیٹے سے یہ نہ پوچھا کیا ہوا تھا؟ جو گزر گئی سو گزر گئی۔ اس سے بڑی بات کیا ہو گی کہ بیٹے کو غلط راستوں سے لوٹنا آتا ہے۔"

میرے دل و دماغ سے بوجھ اتر گیا تھا۔ صبح سوٹ پہن کر یوں لگ رہا تھا جیسے میں کسی کچرا گھر سے جا رہا ہوں' اب یہی گھر پھر پہلے کی طرح جنت لگ رہا تھا۔ کتنی جلدی بھول گیا تھا کہ یہ گھر ماں کے پاؤں تلے رہتا ہے۔ ہم اکثر بھولنے میں بڑی جلدی کرتے ہیں اور دیر تک بھی کوئی سچائی یاد نہیں آتی۔

رات کے گیارہ بجے دروازے پر دستک ہوئی۔ ابو نے کہا۔ "ایک شریف آدمی دوسرے شریف آدمی کے دروازے پر رات کو دستک نہیں دیتا۔ کوئی ضرورت مند ہو تو الگ بات ہے۔ جا کر دیکھو کون ہے۔"

میں نے آنگن میں آکر باہر کا دروازہ کھولا۔ کار کھڑی ہوئی تھی اور ڈرائیور دروازے کے سامنے تھا۔ اس نے ایک لفافہ دیا میں نے انجان بن کر پوچھا۔ "یہ کیا ہے؟"

"پتا نہیں' بی بی جی نے دیا ہے۔"

میں نے لفافے سے ایک تہہ کیا ہوا چھوٹا سا کاغذ نکالا۔ درخشاں نے لکھا تھا "شریف زبیری! سب سے پہلے تمہیں شرافت کا واسطہ دیتی ہوں۔ ڈرائیور کے سامنے کوئی ایسی حرکت نہ کرنا جس سے میری انسلٹ ہو۔ غور کرو گے تو معلوم ہو گا آج

تمہاری انسلٹ نہیں کی ہے۔ غصہ اور جوش سرد پڑ چکا ہے تو ابھی آجاؤ۔ میں بتانا چاہتی ہوں کہ جو کچھ ہوا وہ کیوں ہوا؟ کوئی بات یونہی تو نہیں ہو جاتی؟ بات سمجھنے کے لئے آجاؤ۔ فقط درخشاں۔ ہاں ہاں' تمہاری درخشاں۔"

میں وہ خط پھاڑ دیتا لیکن اس نے پہلے ہی شرافت کا واسطہ دیا تھا۔ ایسا کرنے سے ڈرائیور کے سامنے اس کی انسلٹ ہوتی۔ میں تھوڑی دیر تک سوچتا رہا۔ پھر گھر کے اندر آیا۔ اپنے کمرے میں آکر ایک تھیلا اٹھایا۔ پھر اس میں شیمپو' کریم' پاؤڈر' شیونگ کا سامان دوسرے نئے جوتے اور جرابیں اور نکٹائیاں وغیرہ جتنی چیزیں میرے لئے خریدی گئی تھیں اور جو میری اوقات سے زیادہ تھیں' وہ سب تھیلے میں ڈال کر باہر آیا پھر ڈرائیور سے کہا "اسے لے جاؤ اور بی بی کو دے دو۔"

اس نے پوچھا۔ "آپ نہیں آئیں گے؟ بی بی جی نے کہا تھا کہ............"

میں نے بات کاٹ کر کہا۔ "ہاں' یہ خط میں لکھا ہے' اگر میں نہ آسکوں تو یہ چیزیں بھیج دوں۔ انہیں لے جاؤ۔"

وہ تھیلا لے کر کار میں بیٹھ کر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے خط اور لفافہ پھاڑ ایک طرف پھینک دیا۔ جب کشتی جلا چکا تھا تو واپس جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

اس رات میں نے خواب دیکھا کہ میں ایک بہت ہی قیمتی کار چلا رہا ہوں۔ میرے پہلو میں ایک حسین شہزادی بیٹھی ہے جہاں جہاں سے میری کار گزرتی ہے لوگ جھک جھک کر سلام کرتے ہیں۔ میں کار ڈرائیو کرتا ہوا ایک عالیشان کوٹھی کے احاطے میں آیا۔ وردی پہنے ہوئے ایک ملازم نے میرے لئے دروازہ کھولا۔ میں حسینہ کے ساتھ کار سے اتر کر کوٹھی کے اندر آیا۔ اس کوٹھی کا ہر کمرا قیمتی سامان سے آراستہ تھا۔ ایک بڑے سے ہال میں چند معزز حضرات ایک بڑی سی میز کے اطراف بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھ کر سب تعظیماً کھڑے ہو گئے۔ میرا سیکریٹری ان سے تعارف کرا رہا تھا کہ وہ مختلف ملوں اور کارخانوں کے مالک ہیں۔ وہاں میں کسی کا کارخانہ خریدنے اور کسی کی مل کا فرسٹ پارٹنر بننے والا تھا۔ ایسے ہی وقت آنکھ کھل گئی۔ فجر کی اذان ہو رہی تھی۔ کہتے ہیں صبح اذان کے وقت جو خواب دیکھو وہ سچ ہوتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ میں نے ایسا خواب کیوں دیکھا؟ نفسیات کی روشنی میں جواب صاف ہے

تحت الشعور میں دبی ہوئی خواہشات خواب میں پوری ہوتی دکھائی دیتی ہیں۔ میں نے بڑے عزم سے غیرت میں آکر درخشاں کو ٹھکرا دیا تھا لیکن دولت مند بننے کی خواہش کو نہیں ٹھکرایا تھا۔ یہ خواہش میرے اندر چھپی ہوئی تھی۔ میں نے جب پہلے دن کار چلانا سیکھا تو اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھ کر برتری اور بڑے پن کا احساس ہوا میرے اندر بڑا آدمی بننے کی بے چینی پیدا ہو گئی تھی۔ بڑا آدمی بننا یا دولت مند بننا بڑی بات نہیں ہے لیکن یہ کیسے بنا جاتا ہے' دولت کس طرح پیدا کی جاتی ہے اس کا کوئی راستہ کوئی طریقہ معلوم نہیں تھا۔

دروازے پر دستک سنائی دی۔ بعض اوقات دولت دروازے پر آکر دستک دیتی ہے اور ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ پچھلی رات بھی میں نے اسے دروازے سے واپس کر دیا تھا۔ ابو ڈیوٹی پر جا رہے تھے۔ واپس آکر مجھ سے بولے۔ "وہی کار آئی ہے؟"

میں نے چھوٹے بھائی سے کہا۔ "جا کر کہہ دو میں گھر میں نہیں ہوں۔"

ابو نے کہا۔ "چھوٹے بھائی کو جھوٹ بولنا سکھا رہے ہو۔ کیا ہم نے کبھی جھوٹ بولنا تمہیں سکھایا ہے؟"

"ابو! میں اس سے ملنا نہیں چاہتا۔"

"تمہارے نہ ملنے کے فیصلے میں کوئی کمزوری ہے اسی لئے روبرو یہ بات کہنے سے کترا رہے ہو۔ کار میں ایک لڑکی بیٹھی ہے کسی کی بہن یا بیٹی دروازے پر آئے تو اسے عزت سے گھر میں لا کر بٹھانا چاہئے۔"

"میں کیسے سمجھاؤں یہ گھر اس کے شایانِ شان نہیں ہے' وہ بڑے باپ کی بیٹی ہے۔"

"تم بہت چھوٹے ہو۔ اس کی دولت کے سامنے سکڑ گئے ہو یہ کیوں بھولتے ہو کہ بڑے باپ کی بیٹی تمہارے غریب باپ کے دروازے پر آئی ہے۔"

میں سر جھکا کر باہر جانے لگا۔ ابو میرے ساتھ آئے لیکن باہر آکر ڈیوٹی پر چلے گئے۔ درخشاں پچھلی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ محلے کے کتنے ہی گھروں کی کھڑکیوں اور دروازوں سے عورتیں جھانک کر دیکھ رہی تھیں۔ وہاں دو دنوں سے ایک قیمتی کار آرہی تھی اور آج ایک امیرزادی بھی نظر آرہی تھی۔ سبھی عورتیں تجسس میں مبتلا

ہو گئی تھیں۔ مجھے عجیب سا لگ رہا تھا۔ میں نے کار کی کھڑکی کے پاس آکر پوچھا۔ "یہاں کیوں آئی ہو؟"

"کیا مجھے نہیں آنا چاہئے تھا؟"

"یہ بات نہیں ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ............ کہ 'اچھا آؤ' گھر کے اندر چلو۔"

وہ دروازہ کھول کر باہر آئی پھر بولی۔ "تمہیں اتنا ایٹی کیٹ تو آنا چاہئے کہ لیڈیز کے لئے مرد کار کا دروازہ کھولتے ہیں۔"

"ابھی میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ پلیز اندر چلو' محلے کی عورتوں نے تو تماشا بنالیا ہے۔"

وہ میرے ساتھ گھر کے دروازے تک آئی پھر رک گئی' پچھلی رات میں نے جو لفافہ اور خط پھاڑا تھا اس کے پرزے ابھی تک نالی میں اور دروازے کے پاس بکھرے پڑے تھے۔ اس نے اپنے مخصوص لفافے کو پہچان لیا تھا۔ مجھے گھور کر دیکھ رہی تھی۔ میں نے کہا۔ "آنکھیں پھر دکھالینا۔ اندر چلو۔"

میں نے دروازہ کھولا وہ اندر آگئی۔ اس نے امی کو سلام کیا' بھائی بہنوں سے بھی سلام کلام ہونے لگا۔ امی نے اسے دعائیں دیتے ہوئے کہا۔ "آؤ بیٹی! کمرے میں چل کر بیٹھو۔"

وہ بولی۔ "میں پھر آؤں گی۔ ابھی آپ کے صاحبزادے کو ملازمت کے لئے ایک دفتر میں لے جانا ہے۔"

میں نے کہا۔ "میں کسی لڑکی کے ذریعے ملازمت حاصل نہیں کروں گا۔"

"ملازمت میرے کہنے سے نہیں ملے گی۔ میں کوئی گورنر کی بیٹی نہیں ہوں۔ تم جہاں بھی جاؤ گے اپنی قابلیت سے ملازمت حاصل کرو گے۔"

امی نے تائید کی۔ "ٹھیک تو ہے۔ بندہ محض ایک وسیلہ ہوتا ہے ورنہ انسان اپنے مقدر اور اپنی قابلیت سے سب کچھ حاصل کرتا ہے۔ تم جاکر دیکھو تو سہی ملازمت کیسی ہے؟"

وہ ہاتھ پکڑ کر دروازے کی طرف کھینچتے ہوئے بولی۔ "بس امی نے کہہ دیا ہے' اب تم انکار نہیں کرسکتے۔"

میں اس کے اس طرح پکڑنے سے جھینپ گیا تھا۔ امی حیرانی سے دیکھ رہی تھیں۔ بہنوں نے شرما کر منہ پھیر لیا تھا۔ ہمارے خاندان کی عورتیں کبھی یہ سوچ بھی نہیں سکتی تھیں کہ فلموں کے باہر بھی ایک لڑکی سب کے سامنے لڑکے کا یوں ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ لے جاسکتی ہے۔ میں نے دروازے پر آکر ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا۔ "کیا کرتی ہو! ہمارے ہاں لڑکیاں اتنی بے باک نہیں ہوتیں۔"

وہ بولی۔ "اس میں حرج کیا ہے؟"

"یہاں تمہاری اونچی سوسائٹی کے لوگ نہیں رہتے۔ لڑکی لڑکے کا ہاتھ پکڑ کر چلے گی تو محلے والے پتھر ماریں گے۔"

میں نے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولا۔ وہ بیٹھ گئی۔ یہی بہتر تھا کہ میں کسی حیل وحجت کے بغیر اس کے ساتھ محلے سے نکل آتا ورنہ وہاں کے بزرگ میرے ابو کا محاسبہ کرتے اور الزام دیتے کہ ان کا بیٹا محلے کے جوان بچوں کو بگاڑ رہا ہے۔ میں کار میں اس کے پاس خاموش بیٹھا رہا۔ اس نے ڈرائیور کو کلفٹن کی طرف چلنے کے لئے کہا۔ پھر مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے اس پر ایک نظر ڈال کر منہ پھیر لیا۔ کچھ راستہ یونہی گزر گیا۔ پھر اس نے چپکے سے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔ میں نے بڑی خاموشی سے ہاتھ ہٹانا چاہا' اس نے مضبوطی سے پکڑ لیا۔ بڑی مجبوری تھی۔ ہاتھ چھڑانے کی کشمکش جاری رکھتا تو ڈرائیو دیکھ لیتا۔ وہ اور بے باک ہو جاتی۔ کمبخت میرے جھجکنے اور شرمانے پر مسکرا رہی تھی۔

ڈرائیور نے اس کے حکم کے مطابق ساحل کے ایک ویران حصے میں گاڑی روک دی۔ اسٹیرنگ سیٹ چھوڑ کر کہیں دور ٹہلنے کے لئے چلا گیا۔ درخشاں نے پوچھا۔ "تمہارا غصہ کب ختم ہو گا؟"

"میں نے غصہ نہیں کیا ہے' فیصلہ کیا ہے تم سے دور رہنے کا۔"

"غصہ ہے اسی لئے تو دور رہنا چاہتے ہو۔"

"حقیقت یہ ہے کہ میں تمہارے راستے پر چل نہیں سکتا۔"

"کیا ساری زندگی اس چھوٹے سے علاقے کے چھوٹے سے مکان میں گزارنا چاہتے ہو؟ مجھ سے یہ نہ کہنا کہ محنت سے دولت کماؤ گے۔ تمہارے باپ اور تمہارے باپ کے باپ نے تمام عمر کی محنت و مشقت کے بعد اپنے بچوں کو کیا دیا ہے؟ تم اپنے

بچوں کو کیا دو گے؟ تمہارے باپ دادا خود غرض تھے کہ انہوں نے شرافت اور محنت کا ڈنکا پیٹ کر تمہیں محتاجی دی۔ آئندہ تم خود غرض بن کر اپنے بچوں کو بھی یہی کچھ دینے والے ہو۔ واہ' کیا دانش مندی ہے!"

"تم بہت عقل کی باتیں کر رہی ہو لیکن میں اتنا عقلمند نہیں بننا چاہتا۔"

"تمہیں عقل سے کام لینا ہوگا۔ تمہیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ میرے بچوں کو محتاج بنا کر رکھو۔"

"بچے!" میں نے چونک کر پوچھا۔ "تمہارے بچے؟"

"صرف میرے نہیں ہم دونوں کے.........."

یہ کہتے ہی اس نے اپنا سر میرے سینے پر رکھ دیا۔ میں سمجھا شرما کر منہ چھپا رہی ہے مگر وہ رونے لگی تھی' یا حیرت! یہ کس قسم کی لڑکی ہے؟ کیا کیا تماشے دکھا رہی ہے؟ اور جو بھی تماشے دکھا رہی ہے اس میں بے باکی اور بے حیائی ہے۔ بھلا ایک کنواری لڑکی نامحرم سے کیا اس طرح ہونے والے بچوں کی بات کرتی ہے؟

میں سوچ رہا تھا مگر اس بے حیائی کے لئے کچھ نہیں کہہ رہا تھا۔ اس کے آنسوؤں نے میری زبان روک لی تھی۔ میں نے پوچھا۔ "کیوں رو رہی ہو؟ کیا تم پاگلوں جیسی حرکتیں نہیں کر رہی ہو؟"

"ہاں' میں رفتہ رفتہ پاگل ہو رہی ہوں۔"

"تمہاری شادی نہیں ہوئی بچے کہاں سے آ گئے؟"

"میں جلد سے جلد شادی کرنا چاہتی ہوں۔ ایک سال کے اندر ماں بننا چاہتی ہوں۔ ایک بچے کے بعد زندہ رہی تو دوسرے بچے کی بھی ماں بنوں گی۔"

"کیا کسی نجومی نے تم سے کہا ہے کہ تم ایک بچے کے بعد زندہ نہیں رہو گی؟"

اس نے پرس میں سے کچھ کاغذات نکال کر دکھاتے ہوئے کہا۔ "نجومی نے نہیں ڈاکٹروں نے کہا ہے۔ مجھے کینسر ہو گیا ہے۔"

میں ایک دم سے اس کی طرف گھوم گیا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ سچ بول رہی ہے۔ میں اس سے تمام کاغذات لے کر باری باری انہیں پڑھنے لگا۔ وہ کہہ رہی تھی "کوئی لڑکی خواہ وہ کتنی ہی ماڈرن ہو' ایک ہی دن میں کسی محبوب کے اتنے قریب نہیں آئے گی جتنی کہ میں آ چکی ہوں۔ اس کی یہی وجہ ہے کہ میں جلد سے جلد تمہیں

اپنانا چاہتی ہوں۔ ایک برس میں جتنی خوشیاں سمیٹ سکتی ہوں' سمیٹ لینا چاہتی ہوں۔ میری زندگی بس اتنی سی رہ گئی ہے کہ تمہاری مٹھی میں آ جائے۔ کسی اور کی مٹھی میں جانا ہوتا تو میں تمہارے پیچھے نہ پڑتی۔"

"مجھ میں ایسی کیا بات ہے؟"

وہ رونے لگی' میں نے کاغذات ایک طرف رکھے پھر اس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "حوصلہ رکھو ہماری دنیا میں ایک ایسی کینسر کی مریضہ گزری ہے جو سو سال تک زندہ رہی۔ انسان اپنے حوصلے سے موت کو شکست دیتا ہے۔"

"مجھے کسی غیر کے ساتھ سو سال کی نہیں' تمہارے ساتھ بس ایک برس کی زندگی چاہئے۔"

اب سمجھ میں آیا کہ وہ اندر ہی اندر مجھے کتنی شدت سے چاہتی ہے۔ پچھلے تین دنوں میں میرے پیچھے پڑ گئی تھی۔ مجھے جلد از جلد حاصل کر لینا چاہتی تھی۔ گزرتا ہوا ہر لمحہ اسے دھمکیاں دیتا جا رہا تھا اور میڈیکل رپورٹ بتا رہی تھی کہ دھمکیاں ہر حال میں پوری ہوں گی۔

اس نے کہا۔ "مجھ سے میرا مرض چھپایا جا رہا تھا لیکن مجھے معلوم ہو گیا۔ اب میں مختصر سی زندگی میں جھوٹ نہیں بولوں گی۔ دراصل مجھے چوری کرنے کی عادت ہے۔ جب بھی بڑی رقم کی ضرورت ہوتی ہے میں کبھی ڈیڈی اور کبھی ممی کا سیف کھول کر رقم نکال لیتی ہوں۔ ایک ہفتہ پہلے رقم نکال رہی تھی تو یہ میڈیکل رپورٹ نظر آئی۔ اس پر اپنا نام پڑھ کر تفصیل سے اسٹڈی کی تو آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے اسی لمحے کھلے ہوئے سیف کے سامنے میری جان نکل رہی ہے میں مر رہی ہوں۔"

وہ پھر رونے لگی' میں نے اسے قریب کھینچ لیا۔ اسے تھپکتے ہوئے کہا۔ "اس طرح روتی رہو گی تو کیا عمر بڑھ جائے گی؟ موت سے کون بچ سکتا ہے۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ تم سے پہلے میں مر جاؤں۔"

اس نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا پھر کہا۔ "ایسی بات زبان پر نہ لاؤ۔ موت کیا ہوتی ہے یہ مجھ جیسی کوئی کینسر کی مریضہ ہی سمجھتی ہے۔ اللہ کرے تم ہزاروں سال تک جیو۔ میری زندگی کا یہ آخری برس بھی تمہیں مل جائے۔"

"ایک بات بتاؤ۔ جب تم مجھے اتنا چاہتی ہو تو کل تم نے میری انسلٹ کیوں کی؟"

وہ چند لمحے تک سوچتی رہی پھر بولی۔ "میں تمہیں نویں جماعت سے چاہتی آرہی ہوں۔ تمہیں کئی بار اپنی طرف متوجہ کیا مگر تم عام سے انداز میں دو چار باتیں کرکے گزر گئے۔ تمہیں شاید پتا نہ ہو' اسکول میں تین لڑکیاں اور ہیں جنہیں تم سے یہی شکایت ہے۔ ان تینوں میں ایک ثمینہ تھی۔"

اس نے ثمینہ کا نام لے کر مجھے دیکھا۔ "میں حیران ہوں کہ ثمینہ بھی مجھے چاہتی تھی اور مجھے اس کا علم نہ ہو سکا۔ بہرحال آج دل کی گہرائیوں سے کہتا ہوں کہ مجھے تم سے محبت ہے' صرف تم سے۔"

"پھر اس روز اسکول میں ثمینہ کا پتا پوچھتے کیوں پھر رہے تھے۔"

"میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ اپنے کئے پر پچھتا رہا تھا۔ میرا ضمیر کہہ رہا تھا' میری وجہ سے اس کا ایک سال برباد ہوا ہے۔ مجھے اس سے اور کوئی لگاؤ نہیں تھا۔"

ایسا کہتے وقت ثمینہ کا حسین چہرہ نگاہوں میں تھا۔ آنکھیں اسے پھر روبرو دیکھنا چاہتی تھیں لیکن زبان کسی گہرے لگاؤ سے انکار کر رہی تھی۔ اکثر ہم سمجھنا نہیں چاہتے کہ ہم حقیقتاً دہرے مزاج کے حامل ہیں۔ یہ بھی چاہتے ہیں' وہ بھی چاہتے ہیں۔ محبت اور ضرورت دونوں سے انکار نہیں ہوتا۔ میں نے محبت کو اندر چھپایا ہوا تھا۔ باہر سے ضرورت کو گلے لگا رہا تھا۔ اکثر لوگ انسانی نفسیات کی اس پیچیدہ سچائی کو تسلیم نہیں کریں گے۔ اندیشہ ہے کہ تسلیم کرنے سے دوغلے کہلائیں گے۔

بہرحال میں نے درخشاں کو گلے لگایا کیونکہ وہ مرنے والی تھی۔ اسے ایک پیار کرنے والے ساتھی کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔ اللہ بہتر جانتا ہے' میں اسے فریب نہیں دے رہا تھا۔ ایک لڑکی جو زندگی ہار رہی ہو' اسے فریب دینا محض ذلالت ہے۔ اگر میرے اندر کہیں ثمینہ چھپی ہے تو چھپی رہے' میں درخشاں سے انصاف کرنے میں دانستہ کوتاہی نہیں کر رہا تھا۔

وہ بولی۔ "کل میں نے تمہاری انسلٹ نہیں کی۔ ٹھنڈے دماغ سے سوچو تو تمہیں آئینہ دکھایا۔ میں دولت سے کھیلتی ہوں۔ میرے لئے ایک محبت کرنے والا سچا دوست نہیں مل سکتا' ملے گا تو میری دولت کے حوالے سے مجھے پیار کرے گا۔ پھر ایک

ٹریجڈی سامنے آئی کہ میری زندگی مختصر ہے' ایسی صورت میں تو کوئی چاہنے والا مل ہی نہیں سکتا تھا۔"

"تم ایسا کیوں سوچتی ہو؟ کیا مجھے طعنے دے رہی ہو؟"

"نہیں' کل میں نے طعنے دیئے تھے تم پر بہت غصہ آیا تھا' میں نے اپنی رقم سے تمہارے لئے سوٹ سلوائے' ضرورت کی مہنگی چیزیں خرید کر دیں' تم نے بے غیرتی سے قبول کرلیں۔ جب تک تم سوٹ پہن کر سامنے نہیں آئے' میں دل کو بہلاتی رہی کہ شاید تمہاری غیرت جاگنے والی ہے اور تم میری چیزیں میرے منہ پر مارنے والے ہو۔ مگر تم پہن کر آگئے۔ صاف ظاہر ہو گیا کہ تم میری دولت سے محبت کرتے ہو۔ مجھے اپنی توہین کا شدت سے احساس ہوا۔ میں جو نویں جماعت سے تمہیں چاہتی تھی' ایک پل میں نفرت کرنے لگی۔ تم کپڑے اتار کر گئے تو میں نے ملازموں کے خیال سے تمہیں رکنے کو کہا۔ مگر دل نے کہا' اچھا ہے چلے جاؤ' میری زندگی سے نکل جاؤ' مجھے کبھی کوئی سچائی سے چاہنے والا نہیں ملے گا۔"

اس نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا' میں نے سر جھکا لیا۔ وہ میرے بازو سے لگ کر بولی "لیکن میں دل سے مجبور تھی۔ پہلے تو روتی رہی پھر آپ ہی آپ تمہارے حق میں سوچنے لگی۔ خود کو سمجھانے لگی کہ تم غیرت مند اور خود دار ہو۔ صرف میرے دیئے ہوئے لباس کو نہیں' مجھ میں چھپی ہوئی دولت مند لڑکی کو بھی ٹھکرا کر گئے ہو۔ آدھی رات کو جب ڈرائیور باقی سامان واپس لایا تو یقین ہو گیا کہ تمہارا ضمیر بیدار ہو چکا ہے۔"

میں نے کہا۔ "واقعی' تم نے مجھے آئینہ دکھا دیا تھا۔"

وہ بولی۔ "میں رات بھر کبھی جاگتی رہی کبھی سوتی رہی اور کبھی سوچتی رہی کہ اپنا مرد اپنا ہی ہوتا ہے۔ اس میں بہت سی اچھائیاں ہوتی ہیں تو ایک آدھ برائی بھی اس میں لازمی ہے جو عورت فراخدلی سے اسے تسلیم نہیں کرتی' وہ محبت کے مارے تسلیم کرلیتی ہے۔ ہمارے لئے فرار کا راستہ نہیں ہے اسے قبول کرنا ہی پڑتا ہے۔ اپنی دنیا میں بس یہی ایک مرد ایسا ہوتا ہے جو نکاح قبول کرانے کے بعد ساری زندگی اپنی عادتیں قبول کراتا رہتا ہے۔ سچ تو یہی ہے کہ کل رات ہی تمہیں دل سے قبول کرلیا' جان سے قبول کرلیا۔ ویسے بھی میڈیکل رپورٹ کہتی ہے ایک برس' فقط ایک برس۔

ایسے میں تمہاری اچھائی برائی دیکھنے کا وقت کہاں ہے؟ تمہارے ساتھ جو وقت بھی گزر جائے غنیمت ہے۔"

وہ میرے بازوؤں میں آگئی۔ ہم بڑی دیر تک خاموش رہے' زبان سے خاموش رہے' مگر ہماری خاموشی بولتی رہی۔ پھر میں نے کہا۔ "میں تمہاری ہر خوشی پوری کروں گا۔ تمہیں ایک لمحے کے لئے بھی اداس نہیں ہونے دوں گا لیکن ہمیں سنجیدگی سے سوچنا اور سمجھنا ہے کہ ہم نئی زندگی کیسے شروع کریں؟"

اس نے پوچھا۔ "پرابلم کیا ہے؟"

"ایک نہیں کئی پرابلمس ہیں۔ پہلی بات یہ کہ شادی سے پہلے مجھے اپنے پیروں پر کھڑے ہونا چاہئے۔ دوسری بات یہ کہ تمہارے والدین مجھے تمہارے لئے قبول کریں گے یا نہیں؟ تیسری بات یہ کہ تم میرے چھوٹے سے گھر میں رہنا پسند کرو گی؟"

"تم ایسے مسائل پیدا کرو گے تو میں ایک ہی دن میں مرجاؤں گی۔"

"پلیز مرنے کی بات نہ کرو۔"

"تم کون سی جینے کی بات کررہے ہو۔ پتا نہیں تمہیں پیروں پر کھڑے ہونے کے لئے کتنے برس لگ جائیں۔ پھر میں کہاں رہوں گی؟"

"روزگار کے بغیر میں تمہارے اخراجات کیسے برداشت کروں گا؟"

"میرے پاس کیا کمی ہے کہ تم اخراجات کی فکر کررہے ہو۔"

"یعنی میں تم سے رقم لیا کروں۔ پھر وہی بے غیرتی دکھاؤں؟"

"پہلے کوئی مقصد نہیں تھا اس لئے وہ بے غیرتی تھی۔ اب ایک باقاعدہ پلاننگ ہوگی۔ میں رقم لگاؤں گی اور تم ورکنگ پارٹنر بن کر کاروبار کرو گے۔ جب تمہیں محنت کا صلہ ملے گا تو وہ غیرت اور خودداری والی بات ہوگی۔ تم میرے کام بھی آؤ گے اور تمہارا ضمیر بھی مطمئن رہے گا۔"

اس کی بات دل کو لگ رہی تھی۔ ایسا کاروبار میں ہوتا ہے ایک کا سرمایہ ہوتا ہے دوسرے کی محنت اور ذہانت' یوں باہمی تعاون سے کاروبار فروغ پاتا ہے۔

میں نے پوچھا۔ "مگر ہم کاروبار کیا کریں گے؟"

"میں بزنس مین کی بیٹی ہوں۔ ایک بنیادی بات تم سے کہتی ہوں۔ ہم جو بھی کریں وہ کسی تیسرے کو معلوم نہ ہو۔ کاروبار کا راز کھلے گا تو ساری رقم ڈوب جائے

گی۔"

"مگر کاروبار تو کھلے عام ہوتا ہے۔ اس میں رازداری کہاں ہوتی ہے؟"

"تم کوئی کاروبار بتاؤ جو رازداری کے بغیر منافع بخش ہو۔"

"مجھے تو کوئی تجربہ نہیں ہے۔ یوں سمجھ لو موٹر گاڑیوں کے اسپیئر پارٹس وغیرہ۔"

"تمہیں کیا پتا اسپیئر پارٹس میں کتنا غیر معیاری مال معیاری بتا کر اور بیرونی ممالک کی چھاپ لگا کر فروخت کیا جاتا ہے۔ ہمارے ملک میں کوئی بھی کاروبار خالص نہیں ہے۔ سگریٹ پان کی دکان میں بھی جب تک چھپا کر چرس نہ بیچی جائے' منافع ڈبل نہیں ہوتا۔"

"کیا ہمیں بھی بے ایمانی کرنی ہوگی؟"

"نہیں کرو گے تو میرا سرمایہ ڈبو دو گے اور شرافت کی تسبیح پڑھتے ہوئے اپنے چھوٹے سے ڈربے میں چلے جاؤ گے جسے تم گھر کہتے ہو۔"

"تمہارے ذہن میں کوئی کاروبار ہے؟"

"سرمایہ ہے تو کوئی بھی کاروبار ہوسکتا ہے لیکن اس سے پہلے تمہیں تجربہ کرنا چاہئے۔ بزنس میں ہیرا پھیری اور الٹ پھیر کے ہتھکنڈے سیکھنے چاہئیں اور یہ سمجھنا چاہئے کہ کم سے کم رقم لگا کر زیادہ سے زیادہ منافع کیسے حاصل کیا جاتا ہے۔"

"یہ سب سیکھنے میں خاصا وقت لگے گا۔ مہینے اور سال گزر جائیں گے۔"

"تم بہت ذہین ہو' جو میں سکھانا چاہتی ہوں اسے چند دنوں میں سیکھ لو گے۔"

"تم کیا سکھانا چاہتی ہو؟"

"میرا ایک جما جمایا کاروبار ہے۔ تم دو چار روز میں اسے اچھی طرح سمجھ لو گے۔"

"وہ کاروبار کیا ہے؟"

"میں تمہیں رازدار بنانے سے پہلے سمجھادوں گی کہ کامیاب لوگ اپنی بہت سی باتیں چھپا کر رکھتے ہیں۔ میں تمہیں اپنا سمجھ کر بتا رہی ہوں۔ پٹیل پاڑہ میں ایک خفیہ اڈا ہے' جہاں سٹہ کھلایا جاتا ہے۔"

"یہ سٹہ کیا ہوتا ہے؟"

"اس کھیل میں ایک سے لے کر نو نمبروں تک کسی ایک نمبر پر رقم لگائی جاتی ہے۔ جیتنے والا مال دار ہو جاتا ہے ہماری رقم نہیں لگتی۔ جتنی رقم آتی ہے اس میں سے کچھ جیتنے والے کو دیتے ہیں۔ باقی اپنا منافع ہوتا ہے۔"

"یہ تو جوا ہے۔ غلط دھندا ہے۔"

"تم پھر غلط اور صحیح کے چکر میں پڑ رہے ہو۔"

"ابو ایسے کام کی اجازت نہیں دیں گے۔"

"تم باپ کی انگلی پکڑ کر مجھ سے محبت کرنے اور شادی کرنے آئے ہو۔ کیا ایک برس کے لئے بھی میری بات نہیں مانو گے؟"

وہ مجھ سے لگ گئی۔ پھر مجھے پیار سے جھکانے لگی۔ میں نے کہا۔ "تم تو ایک اسٹوڈنٹ ہو۔ پھر یہ سٹے کا دھندا کیسے کر رہی ہو؟"

"میں نہیں کرتی ہوں۔ بھروسے کا ایک ملازم کر رہا ہے' میں چاہتی ہوں میرا کاروبار تم سنبھالو۔"

"کیا یہ دھندا تمہارے ڈیڈی کے سائے میں چل رہا ہے؟"

"تم اتنا ہی سمجھو' جتنا تمہارا تعلق ہے۔"

"کیا مجھ پر بھروسا ہے؟"

"ہے۔ جس دن تم مجھ پر بھروسا کرو گے میں اس دن سے کچھ نہیں چھپاؤں گی۔ سب کچھ بتا دوں گی۔"

"میں تم پر بھروسا کرتا ہوں۔"

"پھر میری بات کیوں نہیں مانتے؟ ایسا کرو' آج ایک دن ہمارے اڈے پر جاؤ۔ سٹے کا کھیل سمجھو۔ آج کا آدھا منافع تمہیں ملے گا۔"

میں پس و پیش میں تھا۔ وہ بولی۔ "کوئی ضروری نہیں ہے کہ تم ہر بات اپنے گھر والوں کو بتاؤ۔ تم انہیں یہ نہیں بتا سکتے کہ ابھی کار کی پچھلی سیٹ پر میرے ساتھ اس طرح وقت گزار کر آئے ہو۔ جب ایک بات چھپا سکتے ہو تو دوسری بات بھی چھپا سکتے ہو۔"

درخشاں کی اس بات نے مجھے قائل کیا۔ ہم گھر والوں سے اور خصوصاً بزرگوں سے چھپ کر بہت کچھ کرتے ہیں اور یوں اپنا کام بھی ہوتا ہے اور بزرگوں کا ادب لحاظ

بھی قائم رہتا ہے۔

ہم واپسی پر کوٹھی میں گئے۔ اس نے ایک ادھیڑ عمر کے شخص کو بلا کر تعارف کرایا۔ "یہ مسٹر شریف زبیری ہیں اور یہ مسٹر داؤد ہیں۔ سٹے بازی کے منتظم ہیں۔ مسٹر داؤد! آج سٹے کا نمبر شریف صاحب بتائیں گے۔"

میں نے کہا۔ "میں تو کچھ جانتا نہیں۔ نمبر کیا بتاؤں گا؟"

اس نے کہا۔ "دراصل رات کو ظاہر کرنے والا نمبر ہم پہلے ہی طے کر لیتے ہیں۔ جیسے آج رات ہم نمبر تین کا اعلان کریں گے۔ سٹہ کھیلنے والے اپنے اندازے کے مطابق مختلف نمبر پر رقم لگا رہے ہیں اور ان نمبروں کے ٹکٹ خرید رہے ہیں۔ ہم نے تین نمبر کے ٹکٹ بہت کم جاری کئے ہیں تاکہ یہ ٹکٹ خریدنے والے کم ہوں اور ہمیں کم سے کم رقم تقسیم کرنی پڑے۔"

درخشاں اور داؤد مجھے سمجھاتے رہے اور میں سمجھتا رہا۔ بار بار درخشاں کو دیکھ کر سوچتا رہا۔ تھوڑی سی زندگی رہ گئی ہے پھر بھی دولت کمانے کی ہوس نہیں جاتی۔ داؤد کے جانے کے بعد میں نے پوچھا۔ "اتنی دولت کیا کرو گی؟"

اس نے مجھے دیکھا۔ میرے چہرے پر نظریں ڈال کر کہیں کھو گئی۔ پھر بولی۔ "مجھے دولت نہیں' ایک بچہ چاہئے۔ میں ماں بننے کے بعد مرنا چاہتی ہوں اور زیادہ سے زیادہ دولت اپنے بچے کے لئے چھوڑنا چاہتی ہوں۔"

میں اس کا یہ جذبہ دیکھ کر اس رات غلط دھندے میں چلا گیا۔ خفیہ اڈے کا ایک بڑا ہال سٹہ کھیلنے والوں سے بھرا ہوا تھا داؤد نے اعلان کیا تھا کہ مسٹر شریف زبیری کی مٹھی بند ہے۔ اس بند مٹھی میں وہ نمبر ہے جو آپ کے مقدر کا دروازہ کھولنے والا ہے۔ آدھے گھنٹے بعد شہر کے تمام کاؤنٹر بند ہو جائیں گے۔ ٹکٹوں کی فروخت بند ہو جائے گی تو مسٹر شریف زبیری کی مٹھی کھل جائے گی۔

اس رات آدھے گھنٹے کی دیر اس لئے کی جا رہی تھی کہ توقع کے خلاف چار نمبر کے ٹکٹ صرف پچاس عدد فروخت ہوئے تھے اور ہم جو تین نمبر ظاہر کرنے والے تھے وہ ہمارے حساب کے مطابق تین سو فروخت ہو گئے تھے۔ داؤد نے آ کر مجھے چپکے سے کہا "اگر آپ نمبر چار کا اعلان کریں تو ہمارا منافع بڑھ جائے گا۔"

میں نے کہا۔ "میری مٹھی میں نمبر تین کی پرچی ہے۔ اسے لوگوں کے سامنے بدلا

نہیں جاسکتا۔ یہ شور مچائیں گے کہ گھپلا ہو رہا ہے۔"

اس نے مشورہ دیا۔ "باتھ روم جانے کا بہانہ کرو۔ پھر وہاں جاکر نمبر بدل دو۔"

"لوگ احمق نہیں ہیں۔ نمبر بتانے کے بعد ہی مجھے یہاں سے جانے دیں گے۔"

داؤد چلا گیا۔ ٹھیک آدھے گھنٹے بعد میں نے تمام مجمع کو بند مٹھی دکھاتے ہوئے کہا "آپ کو اس مٹھی کے کھلنے کا انتظار ہے اور انتظار کی گھڑیاں گزر چکی ہیں۔ اچھی طرح آنکھیں کھول کر دیکھیں' اس مٹھی سے نمبر کھل رہا ہے۔"

میں نے مٹھی کھول دی۔ وہ خالی تھی۔ لوگوں نے مختلف انداز میں حیرانی کا اظہار کیا۔ میں تین نمبر کی پرچی پہلے ہی فرش پر گرا کر اس پر کھڑا ہو گیا تھا۔ میں نے کہا۔

"تقدیر ہماری مٹھی میں ہوتی ہے۔ لکی نمبر میری انگلیوں میں ہے۔"

میں نے چار انگلیاں دکھائیں۔ جنہوں نے اس نمبر کا ٹکٹ خریدا تھا' وہ اچھل پڑے۔ باقی مایوس ہو کر جانے لگے۔ ایک آدھ نے اعتراض کیا۔ "آج نمبر پرچی پر کیوں نہیں لکھا ہے؟"

میں نے چار انگلیاں دکھا کر کہا۔ "جس ہاتھ سے نمبر لکھا جاتا ہے اس ہاتھ میں پہلے سے چار نمبر موجود ہو تو لکھنے کی کیا ضرورت ہے؟"

رقم ہارنے والے کچھ لوگوں نے تھوڑی سی بحث کی پھر چلے گئے۔ داؤد نے آکر کہا۔ "بی بی جی کا فون ہے؟"

میں نے دفتری کمرے میں آکر ریسیور اٹھاتے ہوئے کہا۔ "ہیلو درخشاں!"

وہ چہک کر بولی "تم نے تو کمال کر دیا۔ ابھی داؤد نے مجھے بتایا ہے کہ تم نے بڑی چالاکی سے نمبر تبدیل کیا ہے۔ فوراً آؤ۔ ابھی منافع کی رپورٹ آنے والی ہے۔"

میں رات کے گیارہ بجے کوٹھی میں آیا۔ وہ تنہا تھی۔ میں نے پوچھا۔ "ڈیڈی کہاں ہیں؟"

"سوئٹزرلینڈ گئے ہیں۔"

میں نے حیرانی سے پوچھا۔ "وہ تمہیں تنہا چھوڑ گئے ہیں؟"

"اس میں حیرانی کی کیا بات ہے۔ میں کوئی بچی نہیں ہوں ویسے وہ بڑے چالاک بن رہے ہیں۔ میری لاعلمی میں ڈاکٹر سے کنسلٹ کرنے گئے ہیں کہ میرا علاج مستقل سوئٹزرلینڈ میں ہو گا یا اپنے ہی ملک میں۔"

ہماری باتوں کے دوران داؤد نے آکر نوٹوں سے بھرا ہوا بریف کیس لاکر درخشاں کے سامنے سینٹر ٹیبل پر رکھا اور ایک کاغذ دیتے ہوئے کہا۔ "یہ چھتیس ہزار ہیں۔ آج زبردست منافع ہوا ہے۔"

درخشاں نے مجھ سے کہا۔ "دیکھو آج پہلے ہی دن تم نے کیا کمال کیا ہے۔ داؤد! آدھا منافع اٹھارہ ہزار روپے شریف صاحب کو دے دو۔"

پہلے تو مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ جب یقین آیا تو سر گھومنے لگا۔ مجھے اٹھارہ ہزار روپے مل رہے تھے۔ میں نے اور میرے گھر والوں نے کبھی یک مشت اٹھارہ ہزار روپے نہیں دیکھے تھے۔ اتنی رقم کمانے میں پتا نہیں کتنی عمر گزرتی ہو گی۔ میں نے ایک رات میں بلکہ ایک منٹ میں نمبر تبدیل کر کے یہ رقم حاصل کی تھی۔

درخشاں نے جب وہ رقم داؤد سے لے کر مجھے دی تو میرے دونوں ہاتھ کانپ رہے تھے۔ یکبارگی میری دنیا بدل گئی۔ میرا دل' میرا دماغ اور میرے نظریات بدل گئے۔ میں احمق تھا' جو اتنی دولت سے انکار کر رہا تھا۔ پتا نہیں کب سے میرے اندر دولت مند بننے کی خواہش بارود کی طرح بھری ہوئی تھی اور جو اٹھارہ ہزار کا بٹن دباتے ہی پھٹ پڑی تھی۔

درخشاں نے داؤد کو جانے کا حکم دیا۔ پھر اس کے جانے کے بعد کہا۔ "میری ایک بات یاد رکھو۔ آج سے ملنے والی کمائی کو مٹھی میں بند رکھو۔ اپنے سائے کو بھی نہ بتاؤ کہ کتنی دولت ہے اور یہ کیسے آتی ہے؟ جب تک مٹھی بند رہے گی' تم شریف' مہذب اور معصوم کہلاتے رہو گے۔"

میں اس کے قریب آکر بیٹھ گیا۔ وہ بولی۔ "اب جاؤ۔"

"تم تنہا ہو۔ مجھے کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں ہے۔"

"روکنے ٹوکنے والی شرافت اور تہذیب ہے۔ غیر قانونی دھندا کرنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم بے شرم بن جائیں اور شادی سے پہلے اخلاق اور تہذیب سے گر جائیں۔ میں دوغلی باتیں کر رہی ہوں۔ مگر یہاں سر اٹھا کر جینے کے لئے یہی کچھ کرنا پڑتا ہے۔"

"ٹھیک ہے لیکن ہماری شادی کب ہو گی' کیسے ہو گی؟"

"ماں باپ سے چھپ کر ہو گی۔"

میں نے چونک کر پوچھا۔ "کیا کہہ رہی ہو؟"
"سمجھنے کی کوشش کرو۔ میرے والدین کبھی تمہیں داماد نہیں بنائیں گے اور تمہارے والدین میرے جیسی بہو کو برداشت نہیں کریں گے۔ میں ایک برس کے لئے اتنی مخالفتیں کیوں مول لوں۔ چُپ چاپ ازادواجی زندگی گزار کر کیوں نہ گزر جاؤں۔"

میں کچھ دیر کے لئے بھول گیا تھا کہ وہ کچھ عرصے کی مہمان ہے۔ بزرگوں کی مخالفتوں کا سامنا کرتے کرتے اس کی زندگی تمام ہوجائے گی۔ میں نے کہا۔ "تمہیں خوش رکھنے کے لئے میں کچھ بھی کرسکتا ہوں۔ ہمارا چپ چاپ نکاح ہوجائے گا' چوری چھپے ازدواجی زندگی بھی گزار لیں گے۔ مگر کیا اپنے بچے کو بھی دنیا والوں سے چھپائیں گے؟"

"آہ!" اس کے دل سے آہ نکلی۔ وہ خلا میں تکنے لگی جیسے ایک مسکراتے ہوئے پھول جیسے بچے کو دیکھ رہی ہو۔ پھر وہ دور کہیں سے بولی۔ "شاید میں اسی کے لئے ابھی تک زندہ ہوں' وہ میرے اندر گھوم رہا ہے۔ کبھی اِدھر کبھی اُدھر الٹ پلٹ رہا ہے۔ جب تک اسے پیدا نہیں کروں گی' اسے ہاتھوں میں نہیں اٹھاؤں گی' تب تک کینسر اور موت سے لڑتی رہوں گی۔"

سنا تھا' ہر کنواری کے دل میں ایک مرد اور ایک بچے کی آرزو ہوتی ہے لیکن درخشاں جیسی شدید آرزو رکھنے والی کوئی دوسری لڑکی نہیں دیکھی۔ میں نے طے کرلیا کہ اس کی ہر آرزو پوری کروں گا۔ میں اس کے بریف کیس میں اپنے حصے کی رقم لے کر گھر پہنچا۔ رات کے دو بج گئے تھے۔ امی جاگ رہی تھیں دروازہ کھولنے سے ابو کی بھی آنکھ کھل گئی۔ امی نے کہا۔ "آج پھر تم نے دیر کردی۔"
ابو نے گھڑی دیکھ کر پوچھا۔ "تم کیا کرتے پھر رہے ہو؟"
میرے ہاتھ میں بہت بڑی طاقت تھی۔ میں نے منٹوں میں یہ طاقت حاصل کی تھی اس لئے نہایت مستحکم لہجے میں کہا۔ "اب میں انگلی پکڑ کر چلنے والا بچہ نہیں رہا' جوان ہوگیا ہوں۔ دنیا کی اونچ نیچ کو سمجھنے لگا ہوں۔ آپ مجھ پر بھروسا کریں اور مجھے اپنے طور پر زندگی گزارنے دیں۔"
ابو نے مجھے بڑے دکھ سے دیکھا پھر سر جھکا لیا۔ امی ایک طرف ہٹ گئیں۔ میں

ان کے درمیان سے گزر کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ وہاں رات گزار کر دوسری صبح امی کو اخراجات کے لئے ایک ہزار روپے دینا چاہے۔ انہوں نے محبت سے کہا۔ "میرا بیٹا لاکھوں میں کھیلتا رہے مگر یہ روپے اپنے ابو کے ہاتھ میں دو۔"
"امی! وہ پولیس والوں کی طرح انکوائری کریں گے' کہاں سے آئے اتنے روپے؟ کیا کام کرتے ہو؟ کہاں جاتے ہو؟ آدھی رات کے بعد کیوں آتے ہو؟"
"بیٹا! ذرا غور کرو۔ ان تمام سوالوں کے جواب درست ہوں تو خاندانی شرافت سلامت رہتی ہے۔ جوابات سے کترانے کا مطلب ہے کہ تمہارے دل میں چور ہے۔"

"چور نہیں ہے یہ پرانی اور نئی نسل کا درمیانی خلا ہے۔ ہمارے سوچنے سمجھنے اور زندگی گزارنے کے طریقے مختلف ہوگئے ہیں اور ایسا اس لئے ہوا ہے کہ ہم نوجوان وقت کے ساتھ چلتے ہیں اور آپ لوگ وقت سے بہت پیچھے رہ جاتے ہیں۔"
"میں ایک سیدھی سادی عورت ہوں' تمہارے فلسفے کا جواب نہیں دے سکوں گی۔ تم اپنے ابو سے بات کرو۔"
میں گھر سے چلا آیا' وہ ساری رقم بینک میں جمع کردی۔ اسی شام داؤد ایک قاضی صاحب کو لے کر آیا۔ موصوف نے ہمارا نکاح پڑھانے کے پانچ ہزار روپے لئے پھر ہمیں ازدواجی رشتے میں منسلک کرکے چلے گئے۔ وہ رات میں نے درخشاں کے ساتھ کوٹھی میں گزاری۔ میں وہ مسرتوں بھری رات کبھی نہیں بھولوں گا۔ مہندی نہیں تھی' سرخ جوڑا نہیں تھا' پھولوں بھری سیج نہیں تھی لیکن ارمانوں کا بستر تھا اور جذبوں کے پھول کھلتے رہے تھے۔ وہ میری جوانی کی پہلی کمائی تھی میں خوب کماتا رہا' خوب لٹاتا رہا۔

دوسرے دن گیارہ بجے تک سوتا رہا پھر وہاں سے گھر گیا تو سب میرے لئے پریشان بیٹھے ہوئے تھے۔ امی نے رو رو کر اپنا برا حال کرلیا تھا۔ ابو میرے دوستوں کے گھر پوچھ آئے تھے۔
میں نے کہا۔ "میں کسی میلے میں کھو جانے والا بچہ نہیں ہوں۔ میں اسی طرح کبھی آیا کروں گا اور کبھی غیر حاضر رہا کروں گا۔"
ابو نے پوچھا۔ "اور اس سے زیادہ نہیں بتاؤ گے کہ کیا کرتے پھر رہے ہو؟"

"کوئی ایسا کام نہیں کر رہا ہوں جس سے آپ کو شرمندگی ہو جب ہم بچے تھے تو آپ ہم سے کچھ باتیں چھپاتے تھے کیونکہ ہر بات بچوں کو نہیں بتائی جاتی۔ آج میں جوان ہوں اور جوان کچھ باتیں بزرگوں سے چھپاتے ہیں کیونکہ اس عمر کی ہر بات بزرگوں کو نہیں بتائی جاتی۔"

وہ غصے سے اٹھ کر میری طرف بڑھتے ہوئے بولے۔ "میرے سامنے لفاظی کرتے ہو۔ بات کو گول مول کر کے حقیقت کو چھپا رہے ہو۔ ہمیں نادان اور خود کو دانا سمجھ رہے ہو۔ میں بتاؤں کہ دانا کون ہے؟"

انہوں نے تمام بچوں سے دوسرے کمرے میں جانے کو کہا۔ پھر ان کے جانے کے بعد دانت پیستے ہوئے دھیمی مگر پتھر جیسی سرگوشی میں بولے۔ "تم انتہائی ذلیل اور آوارہ ہو۔ ان بوڑھی آنکھوں کی بینائی اتنی ہے کہ میں تمہاری قمیض پر ہونٹوں کی سرخی اور کسی کے سر کا ٹوٹا ہوا بال دیکھ رہا ہوں۔"

انہوں نے میرے بازو کو پوری قوت سے جکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے اور کپکپاتے ہوئے کہا۔ "بے غیرت! جا چلا جا' تو کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ کیا تو نہیں جانتا میرے گھر میں جوان بیٹیاں ہیں' تیری بے حیا قمیض کو دیکھ کر میری معصوم بچیوں کی آنکھیں ننگی ہو جائیں گی۔ جا' بھاگ جا یہاں سے۔"

انہوں نے دھکا دیا میں بھاگ کر باہر آگیا۔ ان کی زبان پر میری جوان بہنوں کے بارے میں ایسی باتیں آگئی تھیں جو مجھے باہر آکر بھی پتھر کی طرح لگ رہی تھیں۔ اندر سے امی کے رونے کی آواز آرہی تھی اور ابو انہیں ڈانٹ کر خاموش رہنے کو کہہ رہے تھے۔ میں سر جھکا کر وہاں سے جانے لگا۔ مجھے اس حلئے میں گھر نہیں آنا چاہئے تھا۔ مگر گیارہ بجے دن تک سوتے رہنے کے باعث سوچا تھا کہ گھر والے پریشان ہوں گے' مجھے اب سیدھا گھر جا کر ہی غسل کرنا اور لباس بدلنا چاہئے۔ یوں مجھ سے حماقت ہوگئی تھی۔ ابو کی تیز نظروں نے میری چوری پکڑ لی ایک خیال آیا کہ انہیں اپنی شادی کی بات بتادوں پھر سوچا درخشاں نے منع کیا ہے۔ اس رئیس زادی کے طور طریقے ایسے تھے کہ وہ میرے بزرگوں کو پسند نہ آتی اور میرے بزرگ اس کے مزاج پر گراں گزرتے۔ میں نے درخشاں کے پاس آکر یہ باتیں بتائیں۔ اس نے کہا۔ "پلیز ابھی کسی کو اپنی شادی کی خوشخبری نہ سنانا۔ یہ بات میرے والدین تک پہنچے گی تو مصیبت آجائے

گی۔ ہمیں جدا کر دیا جائے گا۔ وہ مجھے علاج کے بہانے ملک سے باہر لے جائیں گے' میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔"

اس کی باتوں میں اور اداؤں میں محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ جیسے جیسے دن گزر رہے تھے' میں اس کی ذات میں گم ہوتا جا رہا تھا۔ ہر شام سٹے کا نمبر مٹھی میں بند کر کے جاتا تھا اور آدھی رات تک ہزاروں روپے کما کر لاتا تھا۔ درخشاں نے پہلے دن منافع میں آدھا حصہ دیا تھا مگر روزانہ اتنی آمدنی نہیں ہوتی تھی۔ بیس ہزار کی آمدنی میں سے دس ہزار پولیس والوں' ٹکٹ بیچنے والوں اور دلالوں کو دیئے جاتے تھے۔ پانچ ہزار درخشاں رکھتی تھی' دو ہزار مجھے دیتی تھی اور باقی تین ہزار ہونے والے بچے کے نام جمع کئے جاتے تھے۔

دو ہفتے بعد ایک پولیس افسر نے اچانک اڈے پر چھاپا مارا۔ داؤد اور دوسرے ایجنٹ بچ کر نکل گئے' میں پھنس گیا۔ روزانہ ہزار دو ہزار کی آمدنی نے یہ سوچنے کا موقع ہی نہیں دیا تھا کہ کبھی ہاتھوں میں ہتھکڑی بھی لگ سکتی ہے۔ میں نے افسر سے التجا کی۔ "پلیز ہتھکڑی نہ لگاؤ مجھے ایسے ہی لے چلو۔ میری عزت کا خیال کرو۔"

"یہ دھندا کرتے وقت عزت کا خیال نہیں آتا تھا؟ ہم تو قانون کے مطابق تمہیں تھانے لے جائیں گے۔"

میں نے کہا۔ "مجھے ایک فون کرنے کی اجازت دیجئے۔"

افسر مجھے سپاہی کے ساتھ دفتری کمرے میں چھوڑ کر باہر گیا سپاہی نے کہا۔ "ہتھکڑی تو ضرور لگے گی۔ اگر یہ نہیں چاہتے تو دو ہزار دو۔ میں صاحب کو سمجھا دوں گا۔ تمہیں عزت سے تھانے لے جائیں گے۔"

میں نے ریسیور اٹھا کر درخشاں سے رابطہ قائم کیا۔ پھر کہا۔ "ہیلو درخشاں!"

وہ بولی۔ "میں ابھی فون کرنے والی تھی۔ داؤد نے سب کچھ بتا دیا ہے' تم فکر نہ کرو۔ میں تھانے آرہی ہوں۔"

"مگر یہ مجھے ہتھکڑی لگا کر لے جانا چاہتے ہیں۔"

"ایسے وقت میں عقل سے کام کرو۔ ان کی جیب گرم کرو' سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

میں نے ریسیور رکھ کر دو ہزار دے دیئے۔ وہ مجھے ہتھکڑی کے بغیر تھانے لے

آئے۔ ایک حوالات کا دروازہ کھول کر اندر دھکیل دیا۔ اندر نیم تاریکی تھی۔ تھانے کے دفتری حصے سے برائے نام روشنی آ رہی تھی۔ چونکہ پہلی بار ایسا ہو رہا تھا اس لئے بری طرح بے عزتی کا خیال ستا رہا تھا۔ ابو اور امی کی بوڑھی نصیحتیں یاد آ رہی تھیں۔ ایسا سب کے ساتھ ہوتا ہے 'مصیبت کے وقت اللہ یاد آتا ہے یا باپ۔ اس لئے خطرے کے وقت بے اختیار زبان کہتی ہے "ارے باپ رے........."

میں نے حوالات کی تاریکی میں کھڑے ہو کر سوچا۔ میں کیا کر رہا ہوں؟ کہاں سے چلا تھا' کہاں پہنچ گیا ہوں؟ میرے باپ دادا کبھی ایسی جگہ نہیں آئے۔ میں نے حوالات میں آنے کا راستہ کیوں بنایا؟ ابھی گھر والوں کو معلوم نہیں ہوا تھا۔ ابو تو شرم سے مر جائیں گے' سچ مچ مر جائیں گے۔ اپنی بے عزتی اور میری بدمعاشی برداشت نہیں کر پائیں گے۔

میں بہت پچھتا رہا تھا' مگر یہ پچھتاوا بہت شدید نہیں تھا۔ اس کے ساتھ یہ بھی فکر تھی کہ اڈے میں جو نقد دس ہزار روپے رکھے ہوئے تھے وہ پولیس افسر نے لے لئے تھے۔ اس کے بعد بھی مجھ سے دو ہزار وصول کئے تھے۔ سب ملا کر ہمیں بارہ ہزار کی چوٹ دے رہا تھا۔ پھر یہ بھی فکر تھی کہ وہ کمبخت ہمارا اڈا بند کرا دے گا ہماری آمدنی ختم کر دے گا۔ مجھے ہر رات کم از کم دو ہزار ملا کرتے تھے۔ اب تک میرے اکاؤنٹ میں چالیس ہزار روپے سے زیادہ رقم جمع ہو گئی تھی۔ میں دھیرے دھیرے دولتمند بن رہا تھا۔ ایسے میں گرفتار ہونے کے بعد شرم تو آ رہی تھی لیکن اندھی آمدنی کو چھوڑنے کا خیال تک نہیں آ رہا تھا۔ ابھی میں ستاروں سے آگے جانا چاہتا تھا۔

بڑی دیر ہو گئی' درخشاں وعدے کے مطابق تھانے میں نہیں آئی۔ بعد میں پتا چلا وہ پولیس افسر سے سودے بازی میں مصروف تھی۔ افسر ایف آئی آر درج کرنا چاہتا تھا۔ درخشاں نے کہا۔ "آپ کو کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ صبح کورٹ کھلتے ہی مسٹر شریف کی ضمانت کرا لوں گی۔ عدالت میں مسٹر شریف کا بیان ہو گا کہ آپ اچانک چھاپا مار کر اس اڈے سے پچاس ہزار نقد اور پندرہ کلو چرس لے گئے ہیں۔"

افسر نے کہا۔ "یہ جھوٹ ہے' مجھے اڈے سے صرف دس ہزار نقد ملے ہیں اور یہ میں اپنی رپورٹ میں لکھوں گا۔"

"وہ تمہاری رپورٹ ہو گی مسٹر! لیکن اقبال جرم کرنے والے مسٹر شریف کا

بیان درست تسلیم کیا جائے گا۔ اگر تم نے پچاس ہزار روپے اور پندرہ کلو چرس جمع نہ کرائی تو بے ایمان افسر کہلاؤ گے۔ عدالت میں تمہارا ہی محاسبہ ہو گا۔ بہتر ہے سمجھوتا کر لو۔ جو بارہ ہزار تمہارے پاس ہیں انہیں غنیمت جانو اور مسٹر شریف کو رہا کر دو۔ ہمارا وعدہ ہے آئندہ اڈے کی طرف نہیں آؤ گے تو تمہارا معقول بھتا تمہارے پاس پہنچتا رہے گا۔"

آخر معاملہ طے ہو گیا۔ اس نے مزید پانچ ہزار لئے پھر مجھے حوالات سے باہر نکال دیا۔ پولیس اسٹیشن کے باہر درخشاں کار میں بیٹھی ہوئی تھی۔ میں اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ داؤد کار ڈرائیو کرنے لگا۔ میں نے کہا۔ "میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایسی بے عزتی ہو گی۔"

وہ بولی۔ "جذباتی نہ بنو' کوئی بے عزتی نہیں ہوئی ہے۔ دولت حاصل کرنے کے لئے عقل کی ضرورت ہوتی ہے۔ تمہیں اس دھندے میں غنڈے' بدمعاشوں اور پولیس والوں سے نمٹنے کے طریقے معلوم ہو رہے ہیں۔ جب تم صحت مند رہنے کے لئے بیماریوں سے لڑتے ہو' زندہ رہنے کے لئے موت سے لڑتے ہو تو پھر پولیس سے کیوں ڈرتے ہو۔ تم دیکھ رہے ہو میں ایک گھنٹے کے اندر تمہیں حوالات سے نکال کر لے آئی ہوں۔ میں عورت ہوں' تم مرد ہو مرد۔"

میں پھر مرد بن گیا۔ پولیس کے بڑے بڑے افسروں سے دوستی کرنے لگا۔ ان کی دوستی کچھ مہنگی پڑتی تھی۔ نگران کے تعاون سے جرائم کی دنیا کے نئے نئے باب کھلتے جاتے تھے۔ میں نے صرف چھ ماہ میں فیصلہ کیا کہ سٹہ' شراب' چرس اور اسمگلنگ کا دھندا تو کچھ بھی نہیں ہے' زیادہ سے زیادہ دولت کے ساتھ زیادہ سے زیادہ عزت اور شہرت کمانا چاہئے۔ اس کے لئے میں نے لیڈر بننا شروع کر دیا۔

میں نے ایک چھوٹے سے علاقے میں بہت سے پلاٹ خریدے۔ ایک بڑے پلاٹ پر اپنے لئے مکان بنوایا۔ دوسرے پلاٹوں پر کپڑے سلائی کرنے کے لئے پندرہ سلائی مشین منگوائیں ایک پلاٹ پر جوتے چپلوں کا کارخانہ کھولا۔ ایک اور پلاٹ پر قالین بننے کی کھڈیاں لگوائیں۔ وہاں کے غریب لوگوں کو ان تمام کارخانوں میں روزگار سے لگایا۔ عورتیں سلائی کڑھائی کے کام میں لگ گئیں۔ ہر طرف میرا چرچا ہونے لگا۔ کیا مرد کیا عورتیں سب ہی میرے گن گانے لگے۔

اس میدان میں کامیابی حاصل کرنے میں دو برس لگے۔ ابھی تو میں ایک برس کی روداد سنا رہا ہوں۔ اس ایک برس میں درخشاں کے پاؤں بھاری ہو گئے۔ وہ خوشی سے دیوانی ہو گئی۔ اسے جیسے دنیا کی دولت مل گئی تھی۔ جس دن لیڈی ڈاکٹر نے حاملہ ہونے کی تصدیق کی' اسی دن سے اس نے دو تجربہ کار نرسوں کو معقول تنخواہ پر رکھ لیا۔ وہ باری باری دن رات ڈیوٹی کے مطابق کوٹھی میں حاضر رہتی تھیں۔ میں نے اس خوشی میں قریب آنا چاہا تو وہ دور ہو گئی کہنے لگی۔ "میں کمزور ہو گئی ہوں' کیا تمہیں میری صحت کا خیال نہیں ہے۔"

وہ اچھی خاصی صحت مند تھی۔ میں نے ایک مہنگے علاقے میں فلیٹ کرائے پر لیا تھا۔ کوٹھی میں اس کے والدین آ چکے تھے۔ وہ دن کو آتی تھی شام کو چلی جاتی تھی۔ ماں بننے کی تصدیق ہوئی تو دوسرے دن نہیں آئی۔ تیسرے دن اس کا فون آیا۔ اس نے کہا۔ "میں بڑی الجھن میں ہوں۔ ڈیڈی مجھے ملک سے باہر لے جانے کی ضد کر رہے ہیں۔ وہاں میرا علاج کرانا چاہتے ہیں۔"

"درخشاں! تم ماں بننے والی ہو' تمہیں میرے پاس رہنا چاہئے۔"

"مگر علاج ضروری ہے۔ اب میں خود غرض ہو کر سوچ رہی ہوں کہ تم سے دور رہ کر بھی مجھے اپنے بچے کے لئے تھوڑی سی اور زندگی مل جائے تو مجھے دور رہنا چاہئے۔"

"تم میرے پاس کیوں نہیں آ رہی ہو؟"

"مجھ پر پابندی لگائی گئی ہے۔ کل مجھ پر دورہ پڑا تھا۔ ڈاکٹر نے مشورہ دیا ہے' مجھے تنہا چھوڑا جائے۔"

"میں تمہیں کبھی تنہا نہیں چھوڑوں گا۔ وقت آگیا ہے درخشاں! اپنے والدین کو شادی کی بات بتا دو۔"

"میں نہیں بتاؤں گی۔"

"بچہ کیسے چھپاؤ گی؟"

"اسی لئے تو ملک سے باہر جا رہی ہوں۔ وہاں صرف ممی ساتھ ہوں گی۔ ماں آسانی سے بیٹی کی رازدار بن جاتی ہے' وہ میری زندگی کے آخری ایام میں میرے بچے کو میری گود میں رہنے دیں گی۔ باپ ایسا ہرگز نہیں کرے گا۔"

"میں تو اب صاحبِ حیثیت سمجھا جاتا ہوں' کیا تمہارے ڈیڈی اب بھی مجھے قبول نہیں کریں گے؟"

"نہیں۔ وہ تمہارے دشمن بن جائیں گے۔ وہ بہت خطرناک ذرائع کے مالک ہیں۔ تمہیں اور تمہارے گھر والوں کو خاک میں ملا دیں گے۔"

"میں ان کے خوف سے تمہیں نہیں چھوڑوں گا۔"

"تمہیں خوف نہیں ہے مجھے تو ہے۔ میں تمہیں چھوڑ دوں گی۔"

"ممی اور ڈیڈی کی پابندیوں نے تمہارے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں چھین لی ہیں۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں کل صبح آنے کی کوشش کروں گی۔ تم مجھ سے الگ ہو جانے کے لئے خود کو ذہنی طور پر آمادہ رکھو۔"

اس نے ریسیور رکھ دیا۔ مجھے یہ حرکت بہت ناگوار گزری۔ میری بیوی میرے بچے کی ماں بننے کے بعد بھی وہی امیر زادی تھی۔ اپنی باتیں منواتی تھی اور اپنی بات کہہ دینے کے بعد دوسروں کی کوئی بات نہیں سنتی تھی۔ عجب شاہانہ مزاج تھا۔ کل بچے کی خوشخبری سنائی تھی آج علیحدگی کی بات کر رہی تھی۔ ملک سے باہر جانے کا مطلب یہی تھا کہ وہ واپس نہ آتی۔ موت اسے لوٹنے نہ دیتی۔

میں فلیٹ کو لاک کر کے احمد نگر کے علاقے میں آیا جہاں ظاہری شرافت کی زندگی گزارنے کے لئے میں ایک مکان اور کئی کارخانے بنوا رہا تھا۔ ابھی یہ سب کچھ ابتدائی مراحل میں تھا۔ درخشاں اگرچہ خود سر اور متلون مزاج تھی تاہم اس نے مجھے جینے کا گُر سکھا دیا تھا۔ میری مٹھی بند رہتی تھی۔ کوئی نہیں جان سکتا تھا کہ میری آمدنی کے ذرائع کیا ہیں اور ایسی صورت میں تو کوئی نہیں پوچھتا جب مجھ جیسا آدمی غریبوں کے علاقے میں کسی حد تک لوگوں کو روزگار مہیا کر رہا ہو۔ یہ کہاوت بھی ہے اور حقیقت بھی کہ چیلے جو داؤ سیکھتے ہیں وہی اپنے استاد پر آزماتے ہیں۔ میں نے بھی درخشاں پر کئی داؤ آزمائے تھے۔ اس کی آمدنی میں ہیرا پھیری کرتا رہا اور اس بات کی اسے ہوا نہیں لگنے دی کہ کالا دھن کہاں جمع کر رہا ہوں۔ اس نے تو مٹھی بند رکھنے کے فوائد بتائے تھے جبکہ میری مٹھی قدرتی طور پر بند رہتی تھی۔ اس کے اندر کوئی انسانی آنکھ نہیں جھانک سکتی تھی۔

میں اس علاقے میں ایک معمولی سی کار میں آتا تھا۔ قیمتی کار گیراج میں چھوڑ دیتا تھا کیونکہ چھوٹے علاقے کے راستے ناہموار تھے اور گرد اڑتی رہتی تھی۔ احمد نگر کے ایک راستے سے گزرتے وقت اچانک یوں لگا جیسے میں نے اسے دیکھا ہو۔ میں نے فوراً ہی کار روک کر کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ گرد بہت زیادہ تھی۔ جسے میں دیکھنا چاہتا تھا' وہ دھندلا گئی تھی۔ راستے کے کنارے چلتی آرہی تھی' اس کی ایک جھلک عقب نما آئینے میں دکھائی دی تھی۔ پھر گرد نے اسے چھپالیا تھا۔

میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ آہستہ آہستہ گرد چھٹ رہی تھی۔ پھر وہ صاف نظر آنے لگی۔ میرا دل دھک سے رہ گیا وہ بھی آگے بڑھتے بڑھتے چھم سے رک گئی۔ وہ ثمینہ تھی۔ میرے ہاتھوں سے کٹی ہوئی پتنگ جو نہ جانے کن فضاؤں میں بھٹکتی رہی تھی۔ ہوا کے رخ بدلنے سے پھر میری طرف آرہی تھی۔ میں نے بچپن میں کبھی پتنگ نہیں لوٹی۔ اب لوٹنے کو جی چاہنے لگا۔ وہ ایسی ہی تھی اسے دیکھتے ہی جوانی کے پر نکل آتے تھے۔

میں نے خوش ہو کر مخاطب کیا۔ "ثمینہ! تم؟"

"آ......... آپ یہاں رہتے ہیں؟"

"ہاں وہ سامنے میرا مکان بن رہا ہے اور تم؟"

اس نے ہاتھ سے ایک طرف اشارہ کیا۔ "میں اس گلی میں رہتی ہوں۔"

"لاہور سے کب آئیں؟ میرے اندر احساسِ جرم پیدا کر کے چلی گئیں۔ مجھے صفائی کا موقع نہیں دیا۔"

اس نے پوچھا۔ "کیسا احساسِ جرم؟"

"میری وجہ سے تمہاری تعلیم کا ایک سال برباد ہوگیا۔"

"آپ الٹی باتیں کررہے ہیں۔ آپ نے تو میری زندگی بدل دی ہے۔ مجھے صحیح طور پر تعلیم حاصل کرنے کا صحیح راستہ دکھایا ہے۔ معلوم ہوتا ہے آپ کو میرا خط نہیں ملا۔"

"خط؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔ "کیا تم نے مجھے خط لکھا تھا؟"

"ہاں' لاہور جانے سے پہلے ایک خط لکھ کر درخشاں کو دیا تھا۔ اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ خط آپ کو پہنچا دے گی۔"

میرے دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ ایک تو درخشاں کے نام سے یاد آیا کہ اب میں ثمینہ کی چاہت کے لئے کنوارہ نہیں رہا ہوں۔ دوسرے یہ چونکا دینے والی بات تھی کہ اس نے ثمینہ کا خط مجھ سے چھپالیا تھا یا ضائع کردیا تھا۔ یہ سراسر کمینگی تھی۔ مجھے اس پر غصہ آنے لگا۔ ثمینہ نے کہا۔ "لوگ ہمیں دیکھ رہے ہیں' کیا آپ میرے گھر چلیں گے؟"

"ضرور' یہ میرے لئے خوشی کی بات ہے۔ تم گلی میں چلو میں کار ایک طرف کھڑی کر کے آتا ہوں۔"

وہ جانے لگی۔ کار کو ایک طرف سائے میں لے جاتے وقت میرا عجیب حال تھا۔ میری دھڑکنیں شور مچارہی تھیں کہ یہی ہے' یہی ہے میری نوجوانی کی پہلی پسند' میری محبت کی پہلی سانس' میری وہ پہلی دشمن ہے جو میری لاعلمی میں اندر ہی اندر مجھے محبت سے ہی چھینتی' جھپٹتی' پکڑتی اور جکڑتی رہی اور مجھے خبر نہ ہوئی۔ میں سمجھتا رہا' یہ میری دنیا' میری زندگی سے اور میرے اندر سے نکل گئی ہے۔ میں نے درخشاں سے نئے سوٹ نہیں سلوائے تھے۔ محبت کا کفن سلوایا تھا۔ مگر محبت تو محبت ہی ہوتی ہے' وہ کفن پھاڑ کر چلی آئی تھی۔

میں گلی میں آیا' وہ دروازے پر کھڑی ہوئی تھی۔ میں اس کے پیچھے کمرے کے اندر آیا۔ ایک ادھیڑ عمر کی عورت اور ایک مرد مجھے خوش آمدید کہنے کے انداز میں مسکرا رہے تھے۔ میں نے انہیں سلام کیا' ثمینہ نے بتایا وہ اس کے ماموں اور ممانی تھے غریب تھے' ان پڑھ تھے۔ میرے سامنے احساسِ کمتری میں مبتلا تھے دو چار باتیں کرتے وقت جھجکتے رہے پھر وہاں سے چلے گئے۔ میں نے پوچھا۔ "تم اسکول چھوڑ کر کیوں چلی گئی تھیں۔ کیا تمہارے والد کا ٹرانسفر ہوگیا تھا؟"

"ہاں' میں یہاں ماموں کے پاس رہتی تھی۔ جب لاہور گئی تو ابو بہت بیمار تھے۔ ایک ہفتے بعد ہی ان کا انتقال ہوگیا۔"

"اوہ خدایا! تم نے تو بڑے دکھ اٹھائے ہیں۔ تمہاری امی کہاں ہیں؟"

"اتنی بڑی دنیا میں ماموں کے سوا کوئی نہیں ہے۔ باقی جتنے ہیں وہ محض نام کے رشتے دار ہیں۔ ریلوے میں ابو کے ستر ہزار روپے جمع تھے۔ وہ مجھے مل گئے ہیں۔ ماموں نے انہیں بینک میں رکھوا دیا ہے۔ میں چاہتی تھی ماموں وہ خرچ کریں۔ آخر وہ

میرے اخراجات کب تک برداشت کریں گے۔ میں تعلیم جاری رکھنا چاہتی ہوں مگر وہ اپنی محنت سے سب کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ میں سوچتی ہوں کہ کہیں ملازمت کروں اور پرائیویٹ پڑھ کرامتحان دوں۔ میں یہ سب اس لئے کہہ رہی ہوں کہ آپ کے پاس دسویں جماعت کے تمام کوئچن آنسر ہوں گے۔ اگر آپ وہ مجھے کچھ دنوں کے لئے دے دیں تو میں انہیں اپنی کاپی میں لکھ لوں گی۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "تمہیں دسویں کا پورا کورس بھی مل جائے گا اور ملازمت بھی۔ میں یہاں عورتوں کے لئے سلائی کا کارخانہ قائم کررہا ہوں' تم اس کی انچارج رہو گی۔"

وہ خوش ہو کر بولی۔ "اوہ! آپ نے تو ایک پل میں سارے مسائل حل کردیئے۔"

"خوش ہونے سے پہلے سوچ لو' تمہیں بہت سی ذمے داریاں سنبھالنی ہوں گی۔ میں نے غریب عورتوں کو روزگار فراہم کرنے کے لئے یہ کام شروع کیا ہے۔ مجھے کپڑے خریدنے' سلائی کرانے اور انہیں مارکیٹ میں پہنچانے کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔"

"آج سے میں معلومات حاصل کروں گی۔ آپ کی فطرت میں نیکی رچی بسی ہے۔ آپ نے امتحان حال میں مجھے صحیح راستہ دکھایا اور یہاں غریبوں کی بھلائی کررہے ہیں۔"

ماموں چائے اور ناشتا لے کر آئے۔ وہ کھانے پینے کا وقت نہیں تھا لیکن ثمینہ کے سامنے زیادہ دیر بیٹھنے کے لئے کچھ نہ کچھ چباتا رہا اور چائے پیتا رہا۔

میں نے پوچھا۔ "درخشاں تمہاری سہیلی تھی؟"

"ہاں بڑی تیز لڑکی تھی۔ منٹوں میں کسی کو بھی دوست بنالیتی تھی۔ مجھے تو پتا ہی نہ چلا' اس نے کیسے مجھ سے دوستی کرلی ہماری صرف ایک ہفتے کی دوستی تھی اور میں نے بھروسا کرکے اسے وہ خط دیا تھا۔ میں نے بڑی بھول کی۔ کسی پر اتنی جلدی بھروسا نہیں کرنا چاہئے۔"

"کیا وہ خط ایسا تھا کہ بھروسے کے بغیر دینا نہیں چاہئے تھا؟"

اس نے فوراً ہی سر جھکالیا۔ اس کے رخساروں پر حیا کا رنگ جھلک رہا تھا۔ پتا

نہیں اس نے خط میں کیا لکھا تھا۔ درخشاں نے اس پیغام کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ اس نے ٹکڑے ٹکڑے کردیئے تھے یا اسے جلادیا تھا۔ وہ تحریر جل مری تھی لیکن بین السطور جو بات تھی' وہ زندہ تھی اور ثمینہ کے رخساروں پر دمک رہی تھی۔

میں سمجھ رہا تھا کہ درخشاں نے ایسی اوچھی حرکت کیوں کی تھی۔ وہ مجھے چاہتی تھی اس لئے ثمینہ کو کانٹا سمجھ کر ہمارے درمیان سے نکال پھینکا تھا۔ میں نے سوال کیا "کیا درخشاں کسی لڑکے کو چاہتی تھی؟"

ثمینہ نے کہا۔ "وہ تو کچھ عجیب سی تھی۔ لڑکیاں اپنے اپنے بوائے فرینڈ کی باتیں کرتی تھیں اور وہ ایک بچے کا خواب دیکھتی تھی۔ کہتی تھی مجھے عشق اور رومانس سے وحشت ہوتی ہے' مجھے توبس ایک بچے کی آرزو ہے۔ تمام لڑکیاں اس کی بات پر ہنستی تھیں۔ کیا یہ عجیب بات نہیں ہے۔ ایک لڑکی نے بتایا کہ درخشاں نے نویں جماعت میں داخلہ لیا تھا تب سے وہ ایک بچے کی آرزو کرتی آرہی تھی۔"

یہ بات درست ہوسکتی تھی۔ درخشاں میری چاہت کی قسم کھاتی تھی اور کہتی تھی کہ وہ نویں جماعت سے مجھے چاہتی رہی ہے۔ جبکہ لڑکیوں کے بیان کے مطابق وہ نویں جماعت سے ایک بچے کی آرزو کرتی آئی ہے۔

یہ بات اس لئے بھی درست ہوسکتی تھی کہ اب اسے بچہ مل رہا تھا' وہ ماں بننے والی تھی اور مجھ سے دور جانا چاہتی تھی۔ گویا اس نے محض بچے کے لئے مجھے اپنایا تھا۔ وہ عشق کی ماری نہیں تھی ممتا کی ماری تھی۔

میں ثمینہ اور اس کے ماموں ممانی کو اپنے پلاٹ پر لایا اور کہا۔ "تم یہاں کی پلاننگ کرو کہ سلائی کے کارخانے کی چاردیواری کیسی ہوگی۔ عورتیں پردے میں رہ کر کس طرح کام کریں گی۔ سلائی مشینوں کے علاوہ اور کن چیزوں کی ضرورت ہوگی۔ تم پورا بجٹ اور پلان بناؤ گی تو میں اس کے مطابق رقم دیتا جاؤں گا۔ ساری رقم تمہارے ہاتھوں سے خرچ ہوگی اور اس کا حساب بھی تم رکھو گی۔ اپنی سہولت کے لئے کسی اکاؤنٹنٹ کو ملازم رکھ لو۔"

میری باتوں سے اور میری فراخدلی سے ماموں ممانی متاثر ہورہے تھے۔ ثمینہ کے متعلق یقین تھا کہ وہ بہت پہلے سے متاثر ہے۔ میں کاروباری معاملات پر باتیں کرنے کے بہانے شام تک اس کے ساتھ رہا۔ واپسی پر کار ڈرائیو کرتے ہوئے بے

اختیار گنگنا رہا تھا اور آپ ہی آپ مسکرا رہا تھا۔ ابھی معلوم نہیں تھا۔ وہ میری زندگی میں پھر سے آئی ہے تو ہمیشہ کے لئے آکر رہے گی یا خواب کی طرح گزر جائے گی۔ میں اس سلسلے میں اطمینان سے سوچنا چاہتا تھا۔ ابھی تو اس کی آمد گدگدا رہی تھی اور میں خوش ہو رہا تھا۔

فلیٹ میں آکر بھی ایک بے خودی سی طاری رہی۔ اس نے میرے دل میں دھڑکنوں کا اور دماغ میں خیالوں کا میلہ لگا دیا تھا۔ اس میلے میں جہاں دیکھو وہاں ثمینہ دکھائی دیتی تھی۔ گویا دوسری ہستی نہیں تھی۔ جس طرح معبد میں صرف معبود ہوتا ہے اسی طرح دل کے کعبہ میں وہی ایک صنم تھا۔ حد ہو گئی کہ درخشاں بھی یاد نہیں آئی۔

رات کو بستر پر کروٹیں بدلتے بدلتے پتا نہیں کب نیند آگئی۔ میں نے خواب میں اسے دیکھا وہ شرماتے شرماتے آرہی تھی اور آتے آتے شرما رہی تھی۔ وہ اسکول لائف میں اس قدر حسن و شباب سے مالا مال نہیں تھی۔ اب ہو گئی تھی۔ جب کوئی لڑکی آرزوؤں کی انگلی پکڑ کر آتی ہے تو اسی طرح ہری بھری اور مدھ بھری ہو جاتی ہے

میں نے پوچھا تم کہاں گئی تھیں؟

وہ بولی۔ "میں آنکھ مچولی کھیل رہی تھی۔ آج بھی تمہارے سامنے نہ آتی مگر پوچھنے آئی ہوں، کیا میرے سامنے اپنی مٹھی کھولو گے؟"

میں نے اپنی بند مٹھی دیکھی پھر ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "اس میں کچھ نہیں ہے۔ یہ خالی ہے۔"

"مجھ سے محبت کرتے ہو اور مجھ سے جھوٹ بولتے ہو۔ جب کچھ نہیں ہے تو اسے کھولتے کیوں نہیں ہو؟"

"یہ میری پیدائشی عادت ہے۔"

"یہ ہر انسان کی پیدائشی عادت ہے۔ وہ کچھ نہ کچھ ضرور چھپاتا ہے۔ تمہیں میری قسم ہے مجھ سے نہ چھپاؤ۔"

میں نے اس کی قسم سے مجبور ہو کر مٹھی کھول دی۔ اس کے کھلتے ہی درخشاں باہر آگئی۔ ہونے والا بچہ ظاہر ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی ثمینہ نے مجھ سے منہ پھیر لیا۔ حالانکہ اس کے بعد اور بہت کچھ ظاہر ہونے والا تھا کہ میں کون ہوں؟ شریف ہوں یا شرافت کے پردے میں کالے دھندوں سے کالا دھن جمع کرتا ہوں؟ میں نے مٹھی بند

کر کے پوچھا۔ "تم نے منہ کیوں پھیر لیا؟"

وہ جانے لگی میں نے آواز دی۔ "رک جاؤ۔ میری طرف دیکھو، میری بات سنو۔" وہ نہیں سن رہی تھی۔ نہیں رک رہی تھی۔

میں پکار رہا تھا اس کے پیچھے جا رہا تھا لیکن وہ آگے جا کر گہری تاریکیوں میں گم ہو گئی۔ میں نے چونک کر دیکھا کہ چھت نظر آرہی تھی۔ پنکھا تیزی سے گردش کر رہا تھا۔ دور سے آنے والی فجر کی اذان سنائی دے رہی تھی۔ کہتے ہیں اذان کے وقت جو خواب دیکھو وہ سچا ہوتا ہے۔ یعنی ثمینہ کو اپنی سچی روداد سناؤں گا تو وہ مجھ سے مایوس ہو کر پھر میری زندگی سے نکل جائے گی۔

میں بستر پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اگر خواب سچا ہوتا تو یہ خواب نہیں تھا۔ میں نے خود کو سمجھایا کہ میں جاگ رہا تھا۔ سوچ کی اتنی گہرائی میں ڈوبا ہوا تھا جہاں خواب اور بے خوابی کا فرق نہیں رہ جاتا۔ آدمی جب سوچتے سوچتے چونکتا ہے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ جاگ رہا تھا یا سو رہا تھا۔

میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا۔ اگر یہ خواب تھا تو مجھے عقل سے کام لینا ہوگا۔ یہ میرے حق میں بہتر ہوا کہ درخشاں نے ہماری شادی کی بات چھپائی تھی۔ نہ اس کی زبان کھلے گی نہ میں کبھی ثمینہ سے اس کی کوئی بات کروں گا۔

میں غسل وغیرہ سے فارغ ہو کر ہوٹل میں ناشتا کرنے آیا سوچنے لگا کتنی ہی باتیں میرے حق میں ہیں۔ ایک تو ہماری شادی کی بات خود درخشاں ہی چھپاتی رہے گی۔ دوسری بات یہ کہ وہ زیادہ عرصہ تک میرے اور ثمینہ کے درمیان حائل نہیں رہے گی۔ وہ کسی دن مرنے ہی والی تھی۔ ایک محبوبہ کی خاطر بیوی کی زندگی اور موت کا حساب کرنا سراسر بدمعاشی ہے۔ کیا پتا اس سے پہلے مجھے موت آجاتی لیکن میری موت کے مقررہ ایام نامعلوم تھے اور درخشاں کے معلوم تھے لہٰذا جو بات معلوم ہو اس کا حساب کیا جاتا ہے۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی کہ ڈاکٹر میڈیکل رپورٹ کے ذریعے موت کا حساب کرے تو کوئی بات نہیں، شوہر کرے تو مطلب پرست بدمعاش کہلائے، البتہ یہ مانتا ہوں کہ ثمینہ کو دوبارہ دیکھنے اور اس سے ملنے کے بعد مجھے اپنی پیاری بیوی کی موت کا خیال ستا رہا تھا۔

میں ناشتا کر کے فلیٹ میں آیا۔ یہ خیال آرہا تھا کہ ثمینہ اور اس کے ماموں ممانی

سے مراسم بڑھتے جائیں گے تو وہ میرے والدین سے ملنا چاہیں گے۔ میں ہر ماہ ایک آدھ بار ان سے ملنے جاتا تھا۔ ابو صرف سلام کا جواب دیتے تھے مجھ سے بات نہیں کرتے تھے۔ امی بڑی محبت سے باتیں کرتی تھیں۔ مگر میں اپنی کمائی سے کچھ دینا چاہتا تو لینے سے انکار کردیتی تھیں۔ تمام بہن بھائی مجھے دیکھ کر ایسے خوش ہو جاتے تھے جیسے عید آئی ہو۔ میں ان کے لئے قیمتی کپڑے اور ضروریات کی چیزیں خرید کرلے جاتا تھا۔ پہلی بار ابو نے ان چیزوں پر غصہ دکھایا لیکن وہ میرے گھر سے نکل جانے کے بعد کچھ ٹوٹ سے گئے تھے۔ آخر میں بڑا بیٹا تھا۔ مجھ سے محرومی کا صدمہ تو ضرور ہوگا۔ امی نے انہیں سمجھایا تھا وہ اپنے بھائی بہنوں کے لئے لاتا ہے۔ آپ کے لئے لائے تو بے شک آپ انکار کریں۔ اگر آپ ذرا ذرا سی بات پر اعتراض کریں گے تو وہ کبھی کبھی آنے والا پھر کبھی نہیں آئے گا۔

شاید ابو کے دل میں بھی یہی اندیشہ تھا۔ وہ مجھ سے بولتے نہیں تھے مگر دور سے دیکھ تو لیتے تھے۔ انہوں نے پھر کبھی اعتراض نہیں کیا۔ یہ بھی نہیں پوچھا کہ کون سی کمائی سے یہ چیزیں لائے ہو۔ جب میں نے انہیں توڑ ڈالا تھا اور انہوں نے ٹوٹ جانے کا کرب برداشت کرلیا تو اب رفتہ رفتہ سب کچھ برداشت کرسکتے تھے اور کرتے جارہے تھے۔

کال بیل کی آواز سنائی دی۔ میں نے فلیٹ کا دروازہ کھولا' درخشاں کھڑی ہوئی تھی میں نے کہا۔ "خوب انتظار کراتی ہو۔"

وہ اندر آکر بولی۔ "تمہیں کیا پتا ہے' میں کتنے مسائل میں الجھی ہوئی ہوں۔ کل رات امی نے میرے کمرے میں "نی فال" نامی دوا دیکھ لی۔ مجھ سے بولیں' یہ تو حاملہ عورتیں استعمال کرتی ہیں۔ اسے تم نے کیوں رکھا ہے؟"

وہ صوفے پر بیٹھ گئی میں نے پوچھا۔ "تم نے کیا جواب دیا؟"

"میں باتیں بنا کر انہیں ٹال سکتی تھی لیکن انہیں اپنا رازدار بنالیا۔ وہ ہمارے رشتے اور بچے کی باتیں سن کر پریشان ہوگئی ہیں۔ وہ بھی ڈیڈی سے بہت ڈرتی ہیں۔ رات دیر تک مجھے سمجھاتی رہیں کہ یہ رشتہ ختم کردو۔ وہ مجھے ملک سے باہر لے جائیں گی وہاں بچے کے متعلق سوچا جائے گا۔"

وہ ذرا چپ ہوئی پھر ایک گہری سانس لے کر بولی۔ "میں نے ممی کو قسم دی ہے'

ان سے وعدہ لیا ہے کہ بچہ میرے بعد بھی سلامت رہے گا۔"

میں نے پوچھا۔ "تمہیں اتنی شدت سے بچے کی آرزو کیوں ہے؟"

اس نے مجھے خالی خالی نظروں سے دیکھا۔ اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر غائب دماغ ہوگئی۔ میں نے اپنا سوال دہرایا تو چونک کر بولی۔ "پتا نہیں۔ ممی کہتی ہیں میں ایب نارمل ہوں۔"

"تمہاری ممی کہتی ہیں رشتہ ختم کردیا جائے' تم کیا کہتی ہو؟"

"یہ مجھ سے پوچھ رہے ہو؟ تمہیں خود سمجھنا چاہئے۔ ہمارا رشتہ قائم رہا تو مصیبتیں اور پریشانیاں بڑھتی جائیں گی۔ میں وقت سے پہلے مرجاؤں گی۔ کیا تم مجھے تھوڑی سی زندگی نہیں دوگے؟"

"یعنی ہمیں ہمیشہ کے لئے علیحدگی اختیار کرلینا چاہئے؟"

"کیا فرق پڑتا ہے' ویسے بھی میں مرنے کے بعد جدا ہو جاؤں گی۔ کیا اس وقت تم میرے ساتھ قبر میں جاؤ گے؟ جب نہیں جاؤ گے تو ابھی جدا ہو جاؤ۔"

میں نے ناگواری سے کہا۔ "کوئی شوہر اپنی بیوی کے ساتھ اور کوئی بیوی اپنے شوہر کے ساتھ قبر میں نہیں جاتی اور یہ دلیل دے کر موت سے پہلے علیحدگی اختیار نہیں کرتی۔"

"میں سب کی نہیں اپنی بات کررہی ہوں۔"

"تم مجھے اپنی زندگی سے نکالنے کی بات کہہ کر میری انسلٹ کررہی ہو۔"

اگرچہ درخشاں مجھ سے علیحدہ ہو کر میرے دل کی مراد پوری کررہی تھی' میرے اور ثمینہ کے ملاپ کے لئے راستہ صاف کررہی تھی لیکن ان لمحات میں یہ سوچ کر غصہ آرہا تھا کہ اس کی نظروں میں میری کوئی حیثیت نہیں تھی۔ میں ایسا گدھا تھا جسے ماں بننے والی گدھی بھول جایا کرتی ہے۔ یہ میری توہین تھی کہ درخشاں مجھ سے محبت نہیں کرتی تھی۔ مجھے محض ضرورت سمجھ کر اپنی زندگی میں لائی تھی۔ پھر ضرورت پوری ہوتے ہی گیٹ آؤٹ کہہ رہی تھی۔

اس نے کہا۔ "اس میں توہین کی کوئی بات نہیں ہے۔ صرف مرد بن کر نہیں' ہمدرد بن کر سوچو' تم نے ایک مرنے والی کی آخری خواہش پوری کی ہے۔"

میں نے جواب دینے کے لئے منہ کھولا۔ وہ ہاتھ اٹھا کر بولی۔ "بات بڑھاؤ گے تو

بڑھتی جائے گی۔ تمہیں کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ میں بھی جان سے گزر جاؤں گی۔"

"تم گزر جاؤ گی بچہ تو میرے پاس رہے گا۔"

وہ ایک دم سے گھبرا کر بولی۔ "نہیں۔"

"انکار کیوں کر رہی ہو؟ کیا وہ میرا بچہ نہیں ہے؟"

"آں..........ہاں ہاں' تمہارا ہے مگر اسے بھول جاؤ۔"

"کیوں بھول جاؤں؟"

"تم نے کہا تھا' آخری دنوں میں میری ہر بات مانتے رہو گے میں ابھی کہہ چکی ہوں کہ یہ میری آخری خواہش تھی جو پوری ہو رہی ہے' کیا تم پوری نہیں ہونے دو گے؟"

"تم ساری زندگی بچے کو کلیجے سے لگائے رکھو۔ میں اس کا مطالبہ نہیں کروں گا۔ لیکن تمہارے بعد اسے باپ کے پاس رہنا چاہئے۔"

"ہاں اصولاً یہی ہونا چاہے لیکن میرے پاس سے وہ بچہ تمہارے پاس جائے گا تو ہماری شادی اور ازدواجی رشتے کی بات کھل جائے گی اور میں یہ راز اپنے ساتھ اس دنیا سے لے جانا چاہتی ہوں۔ ممی نے وعدہ کیا ہے کہ ملک سے باہر جانے کے بعد ڈیڈی کو سمجھائیں گی اور وہاں سے اعلان کریں گی کہ میری شادی برادری کے ایک رئیسِ اعظم سے کر دی گئی ہے۔ دس ماہ بعد ظاہر کیا جائے گا کہ میں ماں بن چکی ہوں۔"

"یہ تو محض اعلان ہوگا۔ تمہاری بیماری تمہیں دوسری شادی کا موقع نہیں دے گی۔ میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تمہارے بعد بچہ کہاں جائے گا؟"

"میں اس کے لئے ایسے انتظامات کر کے جاؤں گی کہ وہ بچپن سے بڑھاپے تک کسی کا محتاج نہیں رہے گا۔ عیش و آرام سے رہا کرے گا۔ اسے میرے والدین کی سرپرستی حاصل ہوگی میں ان کی اکلوتی بیٹی ہوں میرے بعد وہ اپنے نواسے یا نواسی کو ہی تمام محبت' دولت اور جائیداد دیں گے۔"

یہ بات دل کو لگ رہی تھی کہ ایک دن میرا بچہ ارب پتی کہلائے گا۔ اس کے ماں باپ مجھے قبول نہیں کریں گے۔ یہ بھی میرے لئے بہتر تھا۔ اب تو میری ایک ہی خواہش تھی کہ ثمینہ مجھے قبول کرے۔

درخشاں نے کہا۔ "ابھی بچہ دنیا میں نہیں آیا ہے۔ تم نے اسے دیکھا نہیں ہے'

اسے گود میں نہیں لیا ہے' ابھی کوئی گہرا لگاؤ پیدا نہیں ہوا ہے' تم بہ آسانی اس سے دست بردار ہو سکتے ہو۔ اس کے بدلے میں تمہیں ایسی چیز دوں گی جسے حالات نے تم سے چھین لیا تھا۔"

"تم کس کی بات کر رہی ہو؟"

اس نے اپنے پرس میں سے ایک تہہ کیا ہوا کاغذ نکالا پھر مجھے دکھاتے ہوئے کہا "ثمینہ۔ یہ خط تمہیں ثمینہ نے لکھا ہے۔"

اگر ثمینہ سے ملاقات نہ ہوئی ہوتی تو میں اس خط کو پا کر خوشی سے دیوانہ ہو جاتا۔ یہ مان گیا کہ درخشاں زبردست چالباز ہے۔ اس خط کو ایک خاص وقت کے لئے چھپا رکھا تھا اور اب بڑے ڈرامائی انداز میں اسے پیش کر رہی تھی۔ میرے سامنے بچھڑی ہوئی محبوبہ کا چارا ڈال کر میرا بچہ لے جانا چاہتی تھی۔

درخشاں نے مجھے خاموش دیکھ کر پوچھا۔ "کیا تمہیں ثمینہ کے ذکر سے خوشی نہیں ہوئی؟"

"بہت خوشی ہوئی ہے۔ تمہاری بے مروتی دیکھ کر سوچتا ہوں اسے کیوں بھلا دیا تھا۔ اب تو وہ بھی مجھے بھول چکی ہوگی۔ اس کاغذ پر پڑی ہوئی شکنیں بتا رہی ہیں کہ یہ خط بہت پرانا ہے۔"

"بے شک بہت پرانا ہے مگر محبت کبھی پرانی نہیں ہوتی۔ پچھلے برس امتحان ادھورا چھوڑ کر جاتے وقت مجھ سے کہہ گئی تھی کہ ایک خط دے گی' کیا میں اسے تمہارے ہاتھوں میں پہنچا دوں گی۔ میں نے اسے یقین دلایا تھا۔ دوسرے دن وہ خط لکھ کر دے گئی' میں نے اسے بڑی حفاظت سے چھپا کر رکھا تھا۔"

"تم مجھ سے محبت نہیں کرتی تھیں' ثمینہ سے کوئی حسد جلاپا نہیں تھا' پھر تم نے ایسا کیوں کیا؟ اور آج اسے کیوں پیش کر رہی ہو؟"

"اس لئے کہ آج مجھے بچے کی اور تمہیں ثمینہ کی ضرورت ہے۔ تمہیں مجھ سے بچی محبت نہیں تھی۔ ثمینہ سے دونوں جہاں ملیں گے۔"

میں نے وہ خط لیا پھر اسے کھول کر پڑھا۔ اسے شروع کرتے ہی اسکول کے برآمدے میں پہنچ گیا۔ ایک برس پہلے اس نے مجھے مخاطب کیا تھا۔ لکھا تھا۔

"زبیری صاحب! میں آپ کو شریف صاحب کہہ کر مخاطب کرنا چاہتی تھی لیکن

زبیری لکھ گئی۔ پتا نہیں کس بات نے مجھے آپ کو شریف کہنے سے روک دیا۔ ویسے شریف نہ لکھنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ بدمعاش ہیں۔ کل اسکول کی باؤنڈری میں ایسی ہی ایک بات میں نے آپ سے کہی تھی کہ آپ سے نفرت نہ کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں آپ سے محبت کرتی ہوں۔ آدمی اچھا ہو کسی قابل ہو تو اسے پسند کیا جاتا ہے۔ کل میں نے جو کہا' وہ درست تھا لیکن اب یہ درست ہے کہ پسند کے پیچھے کوئی جذبہ چھپا ہوتا ہے جو سمجھ میں نہیں آتا۔ اس جذبے کو ذرا سی شہ مل جائے تو وہ محبت میں بدل جاتا ہے۔ آپ نے امتحان ہال میں وہ بلیک میلنگ والی تحریر پھاڑ کر ثابت کردیا ہے کہ آپ واقعی ذہین ہیں اور قابلِ محبت ہیں۔

"میں لاہور جارہی ہوں۔ ابو بہت بیمار ہیں۔ آپ سے وعدہ کرتی ہوں آئندہ علم کو سمجھ کر حاصل کروں گی۔ دن رات محنت کرکے اگلے سال اسکول میں داخلہ لوں گی اور محنت کے جذبے سے جب بھی کتابیں کھول کر پڑھوں گی اور کاپیاں کھول کر لکھوں گی تو آپ بہت یاد آیا کریں گے۔ بس ایک اندیشہ ہے سوچتی ہوں کہیں دیر نہ ہوجائے۔ جب آپ کو یاد کرتی واپس آؤں تو آپ بھول چکے ہوں یا آپ کی دنیا بدل چکی ہو۔ فقط ثمینہ..........."

میں نے خط کو تہہ کرکے جیب میں رکھا۔ میں اسے بھولا تو نہیں تھا مگر ہاں اس کے اندیشے کے مطابق میری دنیا بدل چکی تھی' حالات بدل چکے تھے' رشتے بدل چکے تھے اور اب پھر دوسرے طور سے بدلنے والے تھے۔ درخشاں نے اس خط کے ذریعے مجھ پر زبردست حملہ کیا تھا۔ اس میں ثمینہ کا اعترافِ محبت پڑھ کر میری بے چینی بڑھ گئی تھی۔ میں ہر قیمت پر اسے اپنی شریکِ حیات بنانا چاہتا تھا۔ کسی ضد بحث کے بغیر درخشاں کو طلاق دے سکتا تھا اور بچے کو اس کی ماں کے پاس ہی چھوڑ سکتا تھا۔ جس بچے کو دیکھا ہی نہیں تھا' اس کے لئے تڑپ نہیں سکتا تھا۔ عیاش لوگ ایسے ہی کتنے بچے نہ جانے کتنی عورتوں کی گود میں چھوڑ دیتے ہیں۔ ان کا کوئی حساب کوئی شجرہ نہیں ہوتا۔ ایک میرے بچے سے بھلا کیا فرق پڑ جاتا؟

درخشاں نے پرس میں سے ایک اسٹامپ پیپر نکال کر مجھے دیتے ہوئے کہا۔ "طلاق لکھ دو اور یہ کہ بچے کے لئے نہ کبھی دعویٰ کرو گے نہ قانونی چارہ جوئی تمہاری طرف سے ہوگی۔ میں اس پر لکھ دوں گی کہ مہر کی رقم وصول کرلی ہے اور میرا تم پر

کوئی دعویٰ نہیں رہے گا۔"

میں نے سارے اسٹامپ پیپر کو دیکھا۔ یہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ سینے میں ماں کا دل رکھنے والی طلاق حاصل کرنے کے لئے ثمینہ کو اپنی متبادل بنا کر پیش کرے گی۔ دیکھا جائے تو ثمینہ لاہور نہیں گئی تھی۔ کہیں گم نہیں ہوئی تھی درخشاں نے اسے اپنی مٹھی میں رکھا ہوا تھا اور اب اس نے بالکل صحیح وقت پر مٹھی کھولی تھی۔

بہرحال طلاق ہوگئی۔ وہ طلاق نامہ پرس میں رکھ کر اٹھتے ہوئے بولی۔ "میں اس پر دو گواہوں کے دستخط کراؤں گی۔ پھر اس کی نقل تمہارے پاس بھیج دوں گی۔"

اس نے دروازہ کھول کر جانے سے پہلے مجھے دیکھا۔ پھر بڑے ہی سچے لہجے میں بولی۔ "میں نے تمہارے لئے دولت کمانے کے راستے کھول دیئے ہیں۔ یہ کچھ بھی نہیں ہے تم نے مجھ پر جو احسانات کئے ہیں انہیں میں کبھی نہیں بھلاؤں گی۔ خدانخواستہ کبھی کوئی برا وقت آپڑے تو داؤد سے کہہ دینا' مجھے خبر ہوجائے گی۔ میں تمہیں اپنی دنیا کی کسی بھی دلدل سے نکالنے کی طاقت رکھتی ہوں۔ وش یو گڈ لک۔"

وہ چلی گئی اسے طلاق لینے کا ایک ذرا دکھ نہ ہوا۔ مجھ سے بچھڑتے وقت اس کی آنکھ سے ایک آنسو نہ ٹپکا۔ اپنے خون سے تخلیق ہونے والے بچے کو خیرات میں دے کر میرے سینے سے کوئی ہُوک نہیں اٹھی۔ یہ تو وہی جانتی ہے کہ اس نے کس خود غرضی کے تحت ایسا کیا۔ میں اپنی بات جانتا ہوں۔ میں ایک نئی عورت حاصل کرنے اور ایک نئی زندگی شروع کرنے کے لئے ایسا کررہا تھا۔ کسی گھسی پٹی' پرانی چیز کو ہٹانے کے بعد ہی اس کی جگہ نئی چیز آتی ہے۔ پرانے جوتے اتارنے کا دکھ نہیں ہوتا۔ اس کے متبادل نئے جوتے پہننے کی خوشی ہوتی ہے۔

میں اپنی قیمتی کار میں احمد نگر کے چھوٹے سے علاقے میں آیا وہاں یہ بات پھیل رہی تھی کہ میں بہت دولت مند ہوں اور مقامی بے روزگار عورتوں مردوں کے لئے کارخانے قائم کررہا ہوں۔ اس علاقے میں پانی اور بجلی لانے کے لئے متعلقہ شعبوں اور اعلیٰ حکام سے رابطہ کررہا ہوں۔ وہاں کے بوڑھے' جوان' شریف اور بدمعاش سب ہی مجھ سے ملنے آتے تھے۔ اس روز بڑی سی قیمتی کار دیکھ کر میرے اطراف اور زیادہ بھیڑ لگ گئی۔ لوگ اپنے اپنے مسائل سنانے لگے۔ میں ان سے ہمدردی کرتا رہا اور یقین دلاتا رہا کہ جلد ہی بیشتر مسائل حل کردیئے جائیں گے۔ ثمینہ اپنے مکان کی

چھت پر کھڑی ہوئی تھی اور میری مقبولیت اور نیک کاموں میں میری مصروفیت دیکھ کر خوش ہو رہی تھی۔

لوگوں کے رخصت ہونے کے بعد میں اس کے گھر میں آیا وہ اپنے طور پر سلائی کے کارخانے کے لئے منصوبہ اور بجٹ بنا چکی تھی۔ اسے میرے سامنے پیش کر کے تفصیل سمجھانے لگی' میں نے کہا۔ "یہ منصوبہ مجھے پسند ہے' اس کے لئے تمہیں فیلڈ ورک کرنا ہو گا۔ شہر کے بڑے بڑے دکانداروں اور ڈیلروں سے ریڈی میڈ کپڑوں کے آرڈر حاصل کرنے ہوں گے۔ میرے ساتھ کار میں چلو اور ان سے سپلائی کا آرڈر حاصل کرو۔"

وہ ذرا چپ رہی پھر عاجزی سے بولی۔ "آپ برا نہ مانیں' میرا آپ کے ساتھ جانا مناسب نہیں ہے۔"

"کیوں مناسب نہیں؟"

"دنیا والے باتیں بنائیں گے۔"

"اگر ہم دنیا والوں سے ڈریں گے تو یہ کام کیسے ہو گا؟"

"یہ میری ذمے داری ہے' میں کرلوں گی لیکن ایسا کوئی قدم نہیں اٹھاؤں گی جس کے نتیجے میں لوگ ماموں ممانی پر انگلی اٹھائیں۔"

"میں نہیں چاہتا کہ فیلڈ ورک کے لئے تم بسوں میں دھکے کھاتی پھرو۔ تم جب تک مناسب لباس اور میک اپ میں اور کسی گاڑی میں ڈیلروں سے ملنے نہیں جاؤ گی' وہ تم سے متاثر نہیں ہوں گے۔ بڑا آرڈر حاصل کرنے کے لئے اپنی شخصیت میں بڑا پن لانا ہو گا۔ میری دوسری کار تمہارے پاس رہے گی۔ ایک ڈرائیور بھی رہے گا۔"

"اس طرح اخراجات بڑھ جائیں گے۔"

"یہ سب کچھ کاروبار میں استحکام پیدا کرنے کے لئے کیا جا رہا ہے۔ میں تمہارے ساتھ کسی پبلک پلیس میں نہیں جاؤں گا۔ ماموں ممانی کی عزت کا خیال رکھنا میرا فرض ہے۔ میں تمہیں کبھی شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔"

وہ میرے حسنِ سلوک سے خوش ہو رہی تھی۔ دراصل میں نے اس عرصے میں لڑکیوں کو خوش کرنے کا ہنر سیکھ لیا تھا اور یہ ہنر کسی سے سیکھا نہیں تھا۔ مجھے مچھلیوں کے شکار کا شوق ہے۔ اس شوق میں ساحل پر بیٹھ کر کانٹا پھینک کر انتظار کرنا پڑتا ہے۔ کبھی

تو صبح سے شام ہو جاتی ہے اور ایک مچھلی بھی نہیں پھنستی۔ یہ شکار صبر تحمل اور یقین کی پختگی دیتا ہے کہ صبر کرتے رہو جب چارا اچھا لگایا ہے اور کانٹا اچھی جگہ ڈالا ہے تو مچھلی ضرور پھنسے گی۔

وہ مجھے رخصت کرنے کار تک آئی تو اس کا دروازہ بند کرتے وقت اس کے دوپٹے کا ایک سرا پھنس گیا۔ میں نے خیال نہیں کیا' اسے بھی خبر نہ ہوئی۔ میں نے ڈیش بورڈ سے نوٹوں کی گڈیاں نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "تمہارے بجٹ کے مطابق یہ آدھی رقم یعنی پچاس ہزار روپے ہیں۔ انہیں اکاؤنٹ میں رکھ لو۔"

وہ انکار میں ہاتھ ہلا کر بولی۔ "ابھی اتنی رقم کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ ضرورت کے مطابق چیک دیا کریں۔"

میں جانتا ہوں کہ کاروبار میں چیک کے ذریعے لین دین ہونا چاہئے لیکن میں اتنی بڑی رقم دکھا کر اسے متاثر کر رہا تھا۔ یہ تاثر دے رہا تھا کہ میں ایسی بڑی رقمیں یکمشت ادا کر سکتا ہوں۔ اگرچہ وہ دولت کے پیچھے بھاگنے والی لڑکی نہیں تھی تاہم ایک اچھے کمانے کھانے والے جیون ساتھی کی حیثیت سے اس کے دل میں میری جگہ مستحکم ہوتی جا رہی ہو گی۔

میں نے رقم ڈیش بورڈ میں واپس رکھ کر کار اسٹارٹ کی خدا حافظ کہہ کر کار کو آگے بڑھایا۔ دوسرے ہی لمحے اس کی چیخ نکل گئی۔ میں نے عقب نما آئینے میں دیکھا اس کے بدن پر دوپٹہ نہیں تھا۔ وہ اپنے سینے پر دونوں ہاتھوں کی قینچی بنائے چیختے ہوئے شباب کو چھپانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے اپنے مکان کی طرف بھاگ رہی تھی۔ میں نے کار روکی دروازہ کھولا تو پتا چلا کہ اس کا دوپٹہ پھنس کر میرے ساتھ آ رہا تھا۔

میں وہ دوپٹہ لے کر دروازے پر آیا۔ وہ دروازے کے پیچھے چھپی ہوئی تھی۔ وہاں سے جھانک کر مجھے دیکھا پھر چھپ گئی ایک ہاتھ باہر نکال کر بولی "لائیے" میں نے دوپٹہ اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔ "ابھی میں امی ابو سے جا کر کہوں گا دوپٹہ شریر ہو گیا ہے' اسے ہمارے گھر لے آئیں۔"

اس نے ایک زوردار آواز کے ساتھ دروازہ بند کر دیا۔ میں مسکراتا ہوا وہاں

سے سیدھا اپنے گھر آیا۔ امی اور بچے مجھے دیکھ کر خوش ہوگئے۔ میں نے چارپائی پر آرام سے بیٹھ کر پوچھا۔ "امی! کیا مجھے اس گھر میں کبھی جگہ نہیں ملے گی؟"

امی نے بڑے دکھ سے مجھے دیکھا پھر کہا۔ "بیٹا! ہم تمہارے ہیں' یہ گھر تمہارا ہے۔ تم اپنے ابو کے مزاج کو سمجھتے ہو انہیں صاف صاف بتادو کہ تم کیا کرتے ہو اور کہاں رہتے ہو' تمہارے طور طریقے ان کے مزاج کے مطابق ہوں گے تو وہ پھر سے تمہیں گلے لگالیں گے۔"

یہ میں نے پچھلے روز ثمینہ سے ملتے ہی سوچ لیا تھا کہ ابو کو جھوٹ سچ کے ذریعے قائل کرنا ہوگا اور گھر واپس آکر خاندانی طور طریقوں کے مطابق زندگی گزارنی ہوگی ورنہ ثمینہ جیسی خاندانی اور خوددار لڑکی سے شادی نہ ہوسکے گی۔ میں نے کہا۔ "شام کو آکر ابو سے باتیں کروں گا لیکن ابھی آپ سے ایک ضروری بات ہے۔"

ایسا کہتے وقت میں شرمانے لگا انہوں نے مسکرا کر پوچھا۔ "اچھا! ضروری بات کچھ ایسی ہے کہ کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔"

میری بہن فاطمہ نے کہا۔ "امی! میں سمجھ گئی ہوں۔"

امی نے ڈانٹ کر کہا۔ "تُو چپ رہ' دادی اماں نہ بن۔ اسے بولنے دے۔"

میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "وہ بہت نیک اور سمجھدار ہے۔ خاندان بھی اچھا ہے ویسے آپ اور ابو ان سے مل کر فیصلہ کریں گے۔"

امی اور بہنیں کرید کرید کر ثمینہ کے متعلق پوچھنے لگیں۔ میں کچھ بتاتا رہا کچھ ٹالتا رہا۔ پھر شام کو آنے کی بات کہہ کر داؤد کے پاس آیا۔ اس سے کہا۔ "مجھے اپنی دوسری گاڑی کے لئے کوئی ایماندار اور عمر رسیدہ ڈرائیور چاہئے' کیا آج بندوبست ہوجائے گا؟"

"میں پوری کوشش کروں گا۔ تمہاری ٹیکسیوں کے ڈرائیوروں سے بھی معلوم کروں گا۔ آپ رات کو لکی نمبر کا اعلان کرنے آرہے ہیں؟"

"ہاں' آؤں گا۔ میرے ڈرائیوروں کو خبر پہنچادو کہ وہ شام پانچ بجے ہمارے پاپوش والے مکان کے سامنے گاڑیاں لے کر آجائیں۔"

"وہ شام کو پہنچ جائیں گے۔"

"ایک اور کام ہے۔ ملک سے باہر ایسے ڈیلروں سے رابطہ ہوسکتا ہے جو ریڈی

میڈ گارمنٹس کا اچھا خاصا آرڈر دیتے ہیں؟"

"جی ہاں' میں بی بی جی سے بات کروں گا۔"

میں وہ تمام دن مصروف رہا۔ ثمینہ کو اپنی دلہن بنانے کے لئے بھاگ دوڑ کرتا رہا۔ شام کو گھر پہنچا تو چار ٹیکسیاں دروازے کے پاس گلی میں کھڑی تھیں۔ میں نے آنگن میں آکر ابو کو سلام کیا۔ انہوں نے جواب دیا پھر کہا۔ "یہ ٹیکسیوں کے ڈرائیور تمہیں پوچھ رہے تھے۔"

"میں نے انہیں آپ سے ملانے کے لئے بلایا ہے۔ آپ ذرا باہر چلیں ان سے پوچھ گچھ کریں۔ یہ بتائیں گے چاروں ٹیکسیاں میری ہیں۔ آپ ان کے کاغذات بھی پڑھ لیں وہ تمام کاغذات میرے نام ہیں۔"

وہ باہر آئے انہوں نے ڈرائیوروں سے طرح طرح کے سوالات کیے۔ کاغذات دیکھے جب مطمئن ہوگئے تو میں نے ڈرائیوروں کو رخصت کردیا' وہ گھر میں آکر بولے۔ "تمہارے پاس اتنی گاڑیاں خریدنے کے لئے رقم کہاں سے آگئی؟"

میں اس سوال کے لئے پہلے سے تیار تھا۔ انہیں جواب دیا۔ "میں نے ایک رئیسِ اعظم کی بیٹی سے شادی کی تھی۔"

سب نے مجھے چونک کر دیکھا۔ ابو نے ناگواری سے کہا۔ "جب شادی کرلی ہے تو یہاں کیا لینے آئے ہو؟"

"خدا کے لئے آپ پہلے میری پوری باتیں سن لیں۔ وہ مجھے گھر داماد بنانا چاہتے تھے' مجھے یہ پسند نہیں تھا۔ اسی لئے اس روز ان کے کپڑے ان کے منہ پر مار کر آپ کے قدموں میں آگیا تھا۔ پھر آپ نے دوسرے دن دیکھا............ اس رئیس اعظم کی بیٹی یہاں آئی تھی اور مجھے ساتھ لے گئی تھی۔ میں اس کے باپ کے پاس گیا تو انہوں نے کہا' میں واقعی ایک خوددار نوجوان ہوں اور اپنے والدین کا سعادت مند بیٹا ہوں۔ اس کے باوجود انہوں نے مجھے اپنی بیٹی کی ضد سے مجبور ہوکر بلایا تھا۔ وہ مجھ سے ہی شادی کرنا چاہتی تھی۔"

ابو نے چڑ کر کہا۔ "اور تم نے شادی کرلی۔"

امی نے کہا۔ "توبہ ہے' آپ پہلے اس کی پوری بات تو سن لیں۔"

میں نے کہا۔ "اس لڑکی کے باپ نے کہا وہ میرے والدین سے مجھے چھین کر گھر

داماد بنانا نہیں چاہتے ہیں۔ ان کی ایک مجبوری ہے۔ اگر میں کچھ عرصہ کے لئے گھر داماد بننا پسند کرلوں تو وہ مجھے اپنی بیٹی کے بارے میں ایک بہت بڑا راز بتائیں گے۔ میں نے کہا' پہلے آپ وہ راز بتائیں۔ انہوں نے کہا' پہلے میں قسم کھاؤں کہ یہ راز میں اپنے والدین کو بھی نہیں بتاؤں گا اور اس کے لئے مجھے اپنے والدین کی قسم کھانی ہوگی۔ البتہ ایک یا ڈیڑھ برس بعد میں والدین کو وہ راز بتا سکوں گا۔"

امی نے کہا۔ "پندرہ مہینے گزر چکے ہیں اب تو بتا سکتے ہو۔"

"ہاں' ان کی صاحبزادی کو کینسر ہوگیا تھا۔"

امی نے گھبرا کر پوچھا۔ "کینسر؟"

"جی ہاں۔ انہوں نے یہ بات بیٹی سے چھپائی تھی' صرف مجھے بتایا تھا اور کہا تھا ان کی بیٹی زیادہ سے زیادہ ایک برس تک جئے گی۔ وہ مجھے بہت چاہتی ہے اس لئے ان کی خواہش تھی کہ اس کی زندگی کے آخری سال میں دن رات اس کے ساتھ رہوں اور کہیں نہ جاؤں۔ یہ سن کر میرے ضمیر نے کہا۔ مجھے اس کی زندگی کے آخری دنوں میں مایوس نہیں کرنا چاہئے۔ اس کی ہر بات مان کر اسے آخری سانس تک خوش رکھنا چاہئے۔ اب آپ ہی بتائیں' اس بیچاری کو موت آرہی تھی۔ کیا ایسے میں اس کا دل توڑ کر اسے وقت سے پہلے مار ڈالتا؟"

امی نے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "بیٹے! تم نے بہت نیکی کا کام کیا ہے؟"

میں نے ابو سے کہا۔ "میں آپ کی اور امی کی قسم کھا چکا تھا اس لئے آپ دونوں سے بھی حقیقت چھپاتا رہا۔ میرے سسر نے یہ بات راز میں رکھ کر دانشمندی کی تھی۔ ان کی صاحبزادی کو دم توڑتے وقت بھی کینسر کے مرض کا پتا نہ چل سکا۔ اگر پتا چل جاتا تو وہ بہت پہلے ہی خوف یا صدمے سے مرجاتی۔"

ابو نے میرے شانے کو تھپکتے ہوئے کہا۔ "مجھے تم پر فخر ہے تم نے ہم سے بات چھپا کر قسم بھی پوری کی اور ایک مرنے والی کو آخری وقت تک خوش رکھا لیکن تمہیں سسرال والوں سے یہ سب کچھ نہیں لینا چاہئے تھا جو تمہارے پاس ہے۔"

"میں نے اپنے سسر سے ایک پیسہ بھی نہیں لیا ہے۔ میری بیوی نے اپنی موت سے پہلے ہی اپنے حصے کی تمام دولت اور جائیداد میرے نام لکھ دی تھی۔ یہ اس کی

آخری خواہش تھی' کیا میں یہ ساری دولت اٹھا کر پھینک دیتا؟"

ابو کا دل صاف ہوگیا۔ امی نے کہا۔ "ہائے میری بہو میرے بیٹے کو جان سے زیادہ چاہتی تھی' میں اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا بھی نہ دے سکی!"

ان کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ مرنے والی کے لئے کچھ افسوس تو ہونا ہی تھا جبکہ وہ ابھی زندہ تھی۔ یہ کہانی گھڑنے میں زیادہ سر کھپانا نہیں پڑا تھا کیونکہ یہ آدھی سچی تھی۔ کینسر والی بات سچ تھی۔ اس کی موت قریب آرہی تھی۔ شاید وہ ابھی تک بچے کی لگن میں زندہ تھی۔ دوسرا سچ یہ تھا کہ میں نے اس کے باپ سے سسرالی مال سمجھ کر ایک پیسہ بھی نہیں لیا تھا۔ سٹے بازی کے پہلے دن سے اب تک اس کا کام کرتا رہا تھا اور اپنا حصہ وصول کرتا رہا تھا۔ پھر یہ دانشمندی کی تھی کہ ٹیکسیاں خرید لی تھیں۔ احمد نگر میں چھوٹے چھوٹے کارخانے قائم کر رہا تھا اور یہ سب کچھ میری شرافت کے سائن بورڈ کے طور پر تھا۔

والدین نے مجھے دل سے قبول کرلیا تھا۔ میرے لئے گھر کے دروازے کھل گئے تھے۔ دوسرے دن وہ احمد نگر جاکر ثمینہ کو دیکھنے اور اس کے بزرگوں سے ملنے والے تھے۔ میں رات کو سٹے کا نمبر بتانے اڈے پر آیا تو داؤ نے ایک کاغذ دیتے ہوئے کہا۔ "یہ بی بی جی نے دیا ہے۔"

میں نے اسے کھول کر دیکھا درخشاں نے لکھا تھا۔ "شریف! مندرجہ ذیل پتوں پر رابطہ کرو اور ریڈی میڈ ملبوسات کے نمونے تیار کرو۔ ان ڈیلروں کے ایجنٹ تمہارے پاس آئیں گے۔ میں نے تمہارے لئے سنگاپور اور بنکاک کے ڈیلروں کو فون کردیا ہے' کل مڈل ایسٹ کے ڈیلروں سے بھی فون پر کہہ دوں گی۔"

اس کاغذ پر سنگاپور' بنکاک اور مشرق وسطیٰ کے کئی ممالک کے ڈیلروں کے پتے درج تھے۔ میں حیران تھا کہ آخر وہ یا اس کا باپ دنیا کے کتنے ممالک تک پہنچ رکھتا ہے؟ میں صرف اتنا جانتا تھا کہ شہر میں سٹے اور جوئے کے بے شمار اڈے داؤ جیسے ایجنٹ چلاتے ہیں اور درخشاں کا باپ چرس اور افیون کا سب سے بڑا سپلائر ہے لیکن سوسائٹی میں اس کا نام' اس کی عزت اور شہرت اتنی ہے کہ کوئی اس پر کیچڑ نہیں اچھال سکتا۔ اس کی یہی عزت اور بلند مقام دیکھ کر میں نے بھی لیڈر بننے کا فیصلہ کیا تھا۔

دوسرے دن میں اپنے تمام گھر والوں کو کار میں بٹھا کر احمد نگر لے گیا۔ میرے

بہن بھائی بہت خوش تھے۔ اتنی مہنگی گاڑی میں پہلی بار بیٹھنا نصیب ہوا تھا۔ داؤد نے پچھلی رات ہی ایک ڈرائیور سے بات کرلی تھی۔ وہ دوسری گاڑی ڈرائیو کرتا ہوا ہمارے ساتھ ثمینہ کے گھر تک آیا۔ امی نے اپنی ہونے والی بہو کو دیکھتے ہی اس کی بلائیں لے کر خوشی کا اظہار شروع کردیا۔ وہ شرما کر پردے میں چلی گئی۔ میں نے سوچا وہ ابھی سے پردہ کرے گی تو گڑبڑ ہو جائے گی۔ ایک تو آنکھوں کی پیاس نہیں بجھے گی' دوسرے کاروباری معاملات میں رکاوٹ ہوگی۔ میں نے کہا۔ "امی آپ نے تو آتے ہی رشتے کی بات شروع کردی' اب ثمینہ پردہ کرنے لگے گی۔"

"پردہ تو کرنا ہی چاہئے۔ میں نے دیکھتے ہی سمجھ لیا ہے' خاندانی شرافت ہے اس بچی میں۔ میں تو بات پکی کرکے جاؤں گی۔ تم چھوٹے بھائی کو ڈرائیور کے ساتھ بھیج کر ابھی پانچ دس سیر مٹھائی منگواؤ۔"

"میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ بات پکی ہو جائے لیکن اسے پردہ نہیں کرنا چاہئے۔ ورنہ کاروباری معاملات میں پریشانی ہوگی۔"

"کیا تم بہو کو کاروبار میں گھسیٹ رہے ہو؟"

"اس میں حرج ہی کیا ہے۔ آج کل لڑکیاں دفتروں' ملوں اور کارخانوں میں کام کررہی ہیں۔ ثمینہ تو عورتوں کی سلائی کا کارخانہ سنبھالے گی۔"

ابو نے کہا۔ "بے شک اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اپنے ذاتی کاروبار کے لئے دوسروں پر بھروسا کرنے کے بجائے ہمارے ہی بچوں کو اپنی ذہانت کا اظہار کا موقع دینا چاہئے۔"

"بس ابو کا فیصلہ آخری ہوتا ہے۔"

انہوں نے کہا۔ "لیکن دلہن شادی کے بعد یہ سب کچھ کرے گی' اس سے پہلے وہ تمہارے سامنے نہیں آئے گی۔"

"ابو یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ پردہ کیا ضروری ہے؟"

"میرے سامنے بے حیائی کی باتیں نہ کرو۔ اگر بہو ہماری تہذیب اور رسم ورواج کے مطابق دلہن بن کر نہیں آئے گی تو آئندہ کیا خاک ہمارے طور طریقوں پر چلے گی؟ کیا دلہن کی دیکھا دیکھی تمہاری بہنیں بھی اپنے ہونے والے دلہا کے سامنے نہیں جایا کریں گی؟"

اس بات سے مجھے چپ لگ گئی۔ میں درخشاں کی اونچی سوسائٹی سے آیا تھا۔ مشرقی رسم ورواج کی کوئی اہمیت نہیں دیتا تھا مگر ثمینہ کو پانے کے لئے پھر ایک بار مشرقی رنگ میں خود کو رنگنے کے لئے مجبور ہو گیا تھا۔

اس کے ماموں اور ممانی شاید اتنی جلدی کبھی راضی نہ ہوتے لیکن میری ذات میں ثمینہ کی دلچسپی دیکھ چکے تھے۔ دوسرے رشتے داروں کی اہمیت نہیں تھی کیونکہ انہوں نے ثمینہ کو یتیم ہونے کے بعد پلٹ کر نہیں دیکھا تھا۔ پھر میری امارت کا بھی رعب تھا۔ ایسا رشتہ قسمت سے ہی لڑکیوں کو ملتا ہے۔ اس لئے وہ راضی ہو گئے۔

ہم نے منہ میٹھا کیا۔ ہنستے بولتے شام ہوگئی۔ وہاں تقریباً چار گھنٹے گزرے' اس دوران ثمینہ کی ایک جھلک بھی دکھائی نہیں دی۔ میں گھر والوں کو اپنے پلاٹوں پر لے گیا۔ وہ اپنا کوٹھی جیسا مکان دیکھ رہے تھے' میں بار بار اس گلی کی طرف دیکھ رہا تھا جہاں میری حسین جائیداد کا مکان تھا۔ وہ تو جیسے پاؤں میں مہندی لگا کر بیٹھ گئی تھی' نظر ہی نہیں آرہی تھی۔

میں نے امی کو ایک طرف لے جاکر کہا۔ "یہ کاروبار جلد از جلد ثمینہ کو سنبھالنا چاہئے' آپ شادی کی کوئی قریبی تاریخ مقرر کردیں۔"

"ارے لڑکے باؤلا ہو گیا ہے۔ شادی کیا بچوں کا کھیل ہے۔ ثمینہ کے ماموں نے کہہ دیا ہے' لڑکی تین ماہ بعد دسویں کے امتحان سے فارغ ہوگی تو تاریخ مقرر کی جائے گی۔"

میں جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔

اب تو دل کہیں نہیں لگتا تھا۔ لہٰذا کاروبار میں مصروف ہو گیا۔ بند روڈ پر ایک دفتر قائم کیا' کچھ ملازم رکھے' گارمنٹس کا تجربہ رکھنے والی ایک تعلیم یافتہ خاتون کو سلائی کے کارخانے کا انچارج بنایا۔ جدید طرز کے ملبوسات کے لئے ڈیزائنر رکھے کیونکہ کام شروع ہوتے ہی بیرونی ممالک کے بڑے بڑے ڈیلروں سے رابطہ ہو چکا تھا۔ میرے بھیجے ہوئے نمونے پسند کئے جارہے تھے۔ میں نے ایک دوالیا تاجر سے ایکسپورٹ لائسنس بھی خرید لیا تھا۔ غرضیکہ نئے کاروبار میں کامیابیاں حاصل کرتا جارہا تھا۔

درخشاں زبان کی دھنی تھی۔ اس نے کہا تھا' ہر آڑے وقت پر کام آئے گی

اور وہ کام آرہی تھی۔ کبھی میرے سامنے نہیں آئی تھی لیکن اس نے یا اس کے
باپ نے منسٹروں تک رسائی حاصل کرکے احمد نگر میں پانی اور بجلی پہنچا دی تھی۔
اس علاقے میں ہر طرف میری واہ واہ ہو رہی تھی۔ شریف زبیری زندہ باد کے نعرے
لگنے شروع ہوگئے تھے۔ دوسرے علاقے کے لوگ بھی میرے پاس آکر اپنے مسائل
پیش کرنے لگے یعنی آئندہ انتخابات میں سیاسی جنگ لڑنے کے لئے میرا حلقہ وسیع
ہوتا جارہا تھا۔

ان دنوں میری اور ثمینہ کی زندگی میں پیار بھری دلچسپیاں پیدا ہوگئی تھیں۔ میں
کاروبار اور سیاست میں الجھا رہتا تب بھی اس کا خیال' خوشبو کی طرح میرے حواس پر
چھایا رہتا تھا۔ جب اس کی باتیں یاد آتیں تو اس کے بولنے کے انداز اور آواز کی سرگم
بھی سنائی دیتی تھی اور میں اہم معاملات کو بھول کر اسے نگاہوں کے سامنے چلتے پھرتے
دیکھنے لگتا تھا۔

مشرقی تہذیب کو اپناؤ تو اس کے حسن کا پتا چلتا ہے۔ شادی سے پہلے دلہن کو اسی
لئے چھپایا جاتا ہے کہ اس میں کشش بڑھتی ہے۔ اگر وہ مجھے صبح و شام نظر آتی تو بے
شک محبت کا مزہ آتا لیکن اس کے لئے وہ بے تابی' بے قراری اور تڑپ نہ ہوتی جو
اب تھی۔ میں سوچتا تھا' وہ تنہا ہوگی اور مجھے سوچ رہی ہوگی۔

زندگی آسان ہوگئی تھی۔ معلوم ہوتا تھا اب کوئی پیچیدہ معاملہ ہماری الجھن کا
سبب نہیں بنے گا۔ گھر والوں سے سمجھوتہ ہوگیا تھا۔ وہ بہت خوش تھے۔ میں نے جسے
دل سے چاہا وہ دلہن بن کر آنے والی تھی۔ میں نے کالے دھندے سے خوب کمایا'
جھوٹ فریب سے سب کچھ پالیا۔ یہ سب کچھ پانے کے لئے اگر دعائیں مانگتا تو ہوسکتا
ہے دعائیں قبول نہ ہوتیں اور میں سدا کا بدنصیب رہتا یا پھر اللہ میاں قبول کرنے میں
بڑا ٹائم لگا دیتے۔ میں نے بعض غریبوں اور محتاجوں کے مرنے کے بعد ان کے نام کی
لاٹری نکلتے دیکھی ہے۔

جس طرح حرام کھانے والے ڈکار لے کر شکر الحمد للہ کہتے ہیں اسی طرح
اب میں بھی اللہ کو یاد رکھنا چاہتا تھا۔ میں نے نماز شروع کردی کیونکہ تقریباً لیڈر
بن چکا تھا۔ جلسے جلوسوں میں عوام کے سامنے نماز ضروری ہوتی ہے۔ میری کوشش
تھی کہ رفتہ رفتہ غلط دھندا ترک کردوں۔ جائز کاروبار میں برکت ہو رہی تھی۔ چار

ٹیکسیوں کے علاوہ دو بسیں خرید چکا تھا۔ گارمنٹس کا کام بھی عروج پر تھا۔ حالات بتا
رہے تھے کہ سیدھے راستے پر بھی مستقبل تابناک ہے۔ صراطِ مستقیم پر چلنا کچھ
زیادہ مشکل نہیں ہوتا۔ پچھلی برائیوں سے توبہ کی جاسکتی ہے لیکن جس گٹر سے
دولت حاصل ہوچکی ہو اس دولت کو چھوڑنے اور نئے سرے سے روزگار حاصل
کرنے کی حماقت کوئی نہیں کرتا البتہ حرام کی کمائی کو حلال کرنے کے لئے نیکی پر نیکی
کرتا جاتا ہے لیکن جو غلط ہے اس کا نتیجہ غلط ہی نکلتا ہے۔ ایک بار میں ابو کے
ساتھ' ایک دکان سے کچھ خرید رہا تھا۔ اسی وقت پولیس کی جیپ دکان کے سامنے
رکی۔ ایک ڈی ایس پی سپاہیوں کے ساتھ اندر آیا ایک سپاہی نے میری طرف
اشارہ کرکے کہا۔ "جناب! یہی شریف زبیری ہیں۔"

افسر نے مجھ سے پوچھا۔ "آپ ہی شریف نامی ہیں۔ بڑے نامی گرامی ہیں۔
پولیس کے چھاپے سے پہلے تمہیں خبر ہوجاتی ہے اسی لئے کل اڈے پر نظر نہیں
آئے۔"

میں نے ابو کی موجودگی سے پریشان ہوکر کہا۔ "آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔
دیکھئے' یہ میرے والد ہیں' میں ان کے سامنے کوئی ایسی ویسی بات نہیں کرنا چاہتا۔ اگر
آپ مجھ سے کوئی شکایت لے کر آئے ہیں تو میں آدھے گھنٹے میں تھانے آجاؤں گا۔"

"اگر پہلے ہی آجاتے تو کوئی ایسی بات نہ تھی۔ میں آگیا ہوں تو ہتھکڑی لگا کر لے
جاؤں گا۔"

ابو پریشان ہوکر یہ باتیں سن رہے تھے۔ انہوں نے پوچھا۔ "جناب! میرے بیٹے
نے کیا جرم کیا ہے؟"

"بزرگو! آپ ایک جرم پوچھتے ہیں۔ یہ حضرت تو جرائم کے سب سے بڑے
جراثیم ہیں۔ کیا آپ باپ ہوکر نہیں جانتے؟"

ابو کے چہرے سے صاف عیاں تھا کہ وہ صدمے سے ٹوٹنے والے ہیں۔ انہوں
نے کہا۔ "تم نے کچھ نہیں کیا ہے تو خاموش کیوں ہو۔ اپنے حق میں کچھ بولو۔"

افسر نے کہا۔ "یہ کیا بولے گا! یہاں سٹے کا دھندا یہ چلاتا ہے' پورے شہر میں
چرس اور افیون سپلائی کرنے والا سب سے بڑا ایجنٹ ہے۔"

ابو نے تھرتھر کانپتے ہوئے کہا۔ "بول دو بیٹا! یہ جھوٹ ہے۔"

میں نے افسر سے کہا۔ "پلیز آپ ابو کو صدمہ نہ پہنچائیں' مجھے تھوڑی سی مہلت دیں۔"

وہ میرے ہاتھوں میں ہتھکڑی پہناتے ہوئے بولا۔ "اس باپ کو کیا صدمہ پہنچے گا جو اپنے بیٹے کی مجرمانہ زندگی سے غافل رہا ہے۔"

ابو نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے میرا گریبان پکڑ لیا۔ وہ مجھے جھنجوڑ کر کچھ کہنا چاہتے تھے مگر خود ہل کر رہ گئے۔ ان کے ہاتھوں سے میرا گریبان چھوٹ گیا۔ وہ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح دکان کے فرش پر گر پڑے' میں انہیں اٹھانا چاہتا تھا' افسر نے مجھے آگے چلنے کے لئے دھکا دے کر کہا۔ "آپ کے پاس گاڑی ہے' بزرگ اس میں چلے جائیں گے۔"

"پلیز مجھے ہتھکڑی لگا کر باہر نہ لے جائیں' میری عزت کا سوال ہے۔ میں آپ کو خوش کر دوں گا' اس مہربانی کا صلہ دوں گا۔"

وہ باہر جانے کے لئے دھکا دے کر بولا۔ "میں رپورٹ تیار کرتے وقت تمہاری اس پیش کش کا بھی ذکر کروں گا۔"

وہ سپاہیوں کے ساتھ اس طرح دھکا دیتا ہوا باہر لایا کہ میں پلٹ کر ابو کو نہ دیکھ سکا۔ مجھے گرفتاری کی پرواہ نہیں تھی۔ اس بات کی گھبراہٹ تھی کہ ابو کے سامنے مٹھی کھل گئی تھی۔ اتنی چالاکی سے بہت کچھ چھپانے کے باوجود کچھ نہ کچھ معلوم ہو گیا تھا۔ اب بد نصیبی وارننگ دے رہی تھی کہ میرے بزرگ اور بھائی بہن پھر اپنے محلے کے پرانے گھر میں چلے جائیں گے۔ ان کی نظروں سے گرنے کا مطلب یہ ہوتا کہ ثمینہ سے میری شادی نہ ہوتی۔ اس کے ماموں ممانی جب یہ دیکھتے کہ میرے والدین نے میرا ساتھ چھوڑ دیا ہے تو وہ اپنی بیٹی مجھے نہ دیتے۔

میں پھر ایک بار حوالات میں پہنچ گیا۔ میں نے افسر سے بار بار کہا کہ مجھے ایک فون کرنے دیا جائے لیکن وہ اکڑ رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔ "میں تمہیں فون کرنے نہیں دوں گا۔ تمہیں سرکاری گواہ بناؤں گا۔ صرف اتنا بتا دو کہ ان جرائم کے پیچھے سب سے بڑا مگرمچھ کون ہے؟"

میں نے کہا۔ "میں جرائم کے متعلق کچھ نہیں جانتا۔ مجھے تو یہ بھی پتا نہیں ہے کہ مجرموں کے درمیان چھوٹے بڑے مگرمچھ ہوتے ہیں۔"

"تم فون کرو گے تو کیا مجھے تمہارے ذرائع کا علم نہیں ہو گا؟"

"آپ کو جن لوگوں کا علم ہو گا' وہ بہت معزز ہیں' چونکہ معزز ہیں اس لئے مجھ جیسے عزت دار کی ضمانت دیں گے۔"

"اگر تم عزت دار ہو تو مجھے رشوت کیوں دے رہے تھے؟"

"میں اپنے عزت دار ہونے کا جرمانہ ادا کرنا چاہتا تھا۔"

وہ حوالات سے باہر گیا۔ سپاہی نے سلاخوں والے دروازے پر تالا لگا دیا۔ وہ کمبخت مجھے فون کرنے کی اجازت نہیں دے رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد سپاہی نے آکر دروازہ کھول دیا اور مجھے ساتھ چلنے کو کہا۔ میں اس کے ساتھ افسر کے دفتر میں آیا۔ وہ غصے میں بھرا بیٹا تھا۔ اس نے گھور کر مجھے دیکھا۔ "جائیے' تشریف لے جائیے۔ بھلا آپ جیسے شریف نامی گرامی کو ہم چھوٹے افسر کیا پکڑیں گے۔"

میں نے کہا۔ "ہر نیا افسر فرض شناسی کی دھن میں ایسی ہی غلطی کرتا ہے۔ پھر رفتہ رفتہ لائن پر آ جاتا ہے۔"

میں مسکراتا ہوا پولیس اسٹیشن سے باہر آیا۔ وہاں داؤد کار لے کر آیا تھا۔ اس نے سلام کر کے پچھلا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ "اس نئے افسر نے اچانک ہی آپ پر ہاتھ ڈالا تھا۔ مجھے پہنچنے میں دیر ہو گئی۔ معافی چاہتا ہوں۔"

"کوئی بات نہیں۔" میں پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس کی اس دکان کی سمت راہنمائی کی جہاں میں ابو کو چھوڑ کر آیا تھا۔ یہ جانتا تھا کہ اب پانچ گھنٹوں میں وہ جا چکے ہوں گے۔ پھر بھی میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ میرے گرفتار ہونے کے بعد ان کا ردِعمل کیا تھا۔ ویسے میں نے دکان پر پہنچ کر اپنی وہ کار دیکھی جس میں ابو کے ساتھ وہاں آیا تھا۔ انہوں نے میری اصلیت معلوم ہو جانے کے بعد میری کار میں بیٹھ کر جانا گوارا نہیں کیا تھا۔

دکاندار مجھے دیکھ کر چونک گیا' تعجب سے بولا۔ "انہوں نے چھوڑ دیا؟"

"کیسے نہ چھوڑتے؟ میں نے کوئی جرم نہیں کیا تھا؟"

"مگر یہاں کچھ لوگ آپ کے خلاف بول رہے تھے۔ طنزیہ انداز میں نامی شریف یوں کہہ رہے تھے جیسے نامی بدمعاش کہہ رہے ہوں۔"

"میرے والد یہاں سے کب گئے؟"

"وہ خود کہاں گئے۔ لوگ اٹھا کر لے گئے۔ لوگوں کی باتیں سن کر وہ بے ہوش ہو گئے تھے۔"

"کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ لوگ انہیں کہاں لے گئے ہیں؟"

"اسپتال لے گئے ہوں گے یا قبرستان۔"

میں نے تڑاخ کی زور دار آواز کے ساتھ ایک طمانچہ رسید کیا۔ پھر اس کا گریبان پکڑ کر شوکیس پر جھکا کر زور سے اس کے سر کو پٹخا تو شیشہ ٹوٹ گیا۔ اس کا سر ٹوٹے ہوئے شیشے میں گھس گیا۔ دکان کے ملازم میری طرف آ رہے تھے۔ داؤد نے پستول نکال کر کہا۔ "کسی نے حرکت کی تو گولی مار دوں گا۔"

سب سہم کر پیچھے ہٹ گئے۔ دکان کے مالک کا چہرہ لہولہان ہو گیا تھا۔ میں نے کہا بزرگوں کی شان میں گستاخی کرنے سے پہلے اب سوچ لیا کرنا کہ بدمعاش بھی اپنے ماں باپ کی توہین برداشت نہیں کرتے۔"

میں تیزی سے چلتا ہوا باہر آیا۔ پان والے نے کہا۔ "میں آپ کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ آپ کے والد کو سول ہسپتال چھوڑ کر آ رہا ہوں۔"

ہم اپنی گاڑی میں اسپتال پہنچے۔ کاؤنٹر پر وارڈ نمبر معلوم کیا۔ اس وارڈ میں پہنچے تو ان کا بستر خالی تھا۔ نرس اور وارڈ بوائے نے بتایا' وہ ہوش میں آنے کے بعد ان کی لاعلمی میں بستر سے اٹھ کر چلے گئے ہیں۔ انہیں پورے اسپتال میں تلاش کیا گیا ہے لیکن وہ نظر نہیں آئے۔

میں نے بھی اسپتال میں جگہ جگہ دیکھا۔ پھر اپنی کار تیزی سے ڈرائیو کرتا ہوا احمد نگر آیا' وہاں اپنے کوٹھی نما مکان میں پہنچا اندر میرے مکان میں رونے پیٹنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ باہر لوگوں کی بھیڑ تھی' میرے چھوٹے بھائی نے روتے ہوئے گلے لگ کر کہا۔ "ابو ہمیں چھوڑ کر چلے گئے بھائی جان!"

میرے دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا۔ سینے میں درد اٹھا۔ میں دوڑتا ہوا اندر آیا۔ دوسرے بھائی بہن مجھے دیکھتے ہی دوڑ کر آئے اور لپٹ کر رونے لگے۔ ثمینہ عورتوں کے درمیان بیٹھی ہوئی تھی میرے آتے ہی اس نے گھونگھٹ نکال لیا تھا۔ امی آنسوؤں سے بھرا ہوا چہرہ لے کر میرے پاس آئیں پھر میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچتی ہوئی ایک کمرے میں لے گئیں۔ دروازے کو اندر سے بند کر دیا پھر روتے ہوئے دبی دبی سی

آواز میں کہا۔ "میں بیوہ ہو گئی۔ قصائی بیٹے! تُو نے باپ کو مار ڈالا' تیری ماں بیوہ ہو گئی ہے۔"

وہ دونوں ہاتھوں سے مجھے مارنے لگیں۔ میں چپ چاپ کھڑا مار کھاتا رہا۔ میری آنکھوں سے آنسو بہتے رہے۔ باپ شکوہ کرتے کرتے دنیا سے اٹھ گیا تھا۔ اب ماں اپنی نفرت کا اظہار کر رہی تھی۔ مگر ماں تھی' پہلے اندر سے دروازہ بند کر لیا تھا تاکہ دنیا بیٹے کو قابلِ نفرت نہ سمجھے۔ عجیب ہوتی ہیں یہ مائیں۔ ہاتھوں کی چوڑیاں ٹوٹ گئیں' دل ٹوٹ گیا' اس حالت میں بھی قصائی بیٹے کو جوڑے رکھنا چاہتی تھیں۔

آخر وہ مجھے مارتے مارتے نڈھال ہو گئیں۔ چکرا کر گرنے والی تھیں' میں نے سنبھال لیا۔ دروازہ کھول کر انہیں دونوں بازوؤں میں اٹھا کر کھلی ہوا میں لایا۔ بہنیں ماں کو اس حالت میں دیکھ کر رونے لگیں۔ میں نے تسلی دی کہ گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ انہیں ایک جگہ لٹایا۔ عورتیں منہ پر پانی کے چھینٹے مار کر پنکھا جھلنے لگیں حالانکہ آنگن میں پیڈسٹل فین چل رہا تھا پریشانی اور صدمے میں جس کی جو سمجھ میں آ رہا تھا وہ کرتا جا رہا تھا۔ کوٹھی کے باہر علاقے کے لوگ جمع ہوتے جا رہے تھے۔ ابو کی وفات کے بعد پتا چلا کہ میری شہرت کتنی ہے۔ ان کے جنازے میں ہزاروں افراد شریک ہوئے تھے۔ بازار کی دکانیں بند ہو گئی تھیں۔ میں نے ان کے مکانوں اور دکانوں کو بجلی سے روشن کیا تھا۔ ان کی گلیوں میں پانی کے نلکے لایا تھا اور سڑکیں پختہ کروا رہا تھا۔ ایسے میں وہ میرے غم میں شریک کیوں نہ ہوتے؟

رات نو بجے تدفین کے بعد واپس آیا تو امی آنگن میں جُوڑا کھولے بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان کی سوگواری دیکھ کر دل ٹکڑے ہو گیا۔ میں نے خود سے پوچھا۔ "کیا میں نے ابو کو مارا ہے؟"

"نہیں!" میں نے اپنی حماقت میں سوچا۔ "ابو کو ان کے ایمان' سچائی اور اصولوں نے مارا ہے۔ اولاد گمراہ ہوتی ہے۔ کبھی گمراہی سے راہِ راست پر بھی آ جاتی ہے۔ باپ کو بیٹے کی گمراہی سے جنگ کرنا چاہئے تھا' نہ کہ بے اعتمادی سے مرجانا تھا۔ کیا دوسروں کے باپ اسی طرح مرجاتے ہیں؟"

میں نے امی کے سامنے فرش پر بیٹھ کر کہا۔ "آپ صدمات سے نڈھال ہیں لیکن آپ اس انداز میں سوگ کر رہی ہیں جیسے میں سچ مچ قصائی ہوں۔"

انہوں نے مجھے دکھ بھری نظروں سے دیکھا پھر آنسوؤں سے بھیگے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں دروازے پر کھڑی تھی۔ میں نے دیکھا۔ وہ سڑک کے کنارے بس سے اتر کر آرہے تھے۔ ان میں چلنے کی سکت نہیں تھی مگر وہ ڈگمگاتے سنبھلتے آرہے تھے۔ پھر بھی وہ دروازے تک نہ آسکے اچانک ہی اوندھے منہ گر پڑے۔ میں دوڑتی ہوئی، بچوں کو پکارتی ہوئی ان کے پاس گئی انہیں سہارا دے کر اٹھانا چاہا۔ انہوں نے کہا۔ "نہیں، بچوں کو بلاؤ، شریف کے محل سے نکل آؤ۔ آج میں نے آنکھوں سے دیکھ لیا ہے۔ وہ ہمارے خون میں حرام کا رزق شامل کرچکا ہے۔ نکل آؤ اس محل سے نکل آؤ۔ ہم اپنے گھر، گھر.......... وا.......... واپس.........."

امی بات پوری نہ کرسکیں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ کہنے لگیں۔ "وہ پانچوں وقت کی نمازیں پڑھتے تھے مگر آخری وقت کلمہ نہ پڑھ سکے۔ حرام کے رزق کا صدمہ کرتے کرتے دم نکل گیا۔"

"میں حرام کا رزق کھاتا ہوں نہ کھلاتا ہوں۔ محنت کرتا ہوں، دماغ لڑاتا ہوں، تب رقم حاصل ہوتی ہے۔"

"میرے مجازی خدا نے آخری سانس میں کہہ دیا تھا کہ تمہارے پاس رزقِ حلال نہیں ہے۔ میرے لئے ان کی بات پتھر کی لکیر ہے۔ تم اپنی صفائی پیش نہ کرو۔"

میرے بہن بھائی کپڑوں کی دو گٹھریاں اٹھا کر کمرے سے باہر آئے پھر چھوٹے بھائی نے کہا۔ "امی! چلیں۔"

میں نے چونک کر پوچھا۔ "کہاں چلیں؟ کہاں جارہے ہو؟ ان گٹھریوں میں کیا ہے؟"

امی نے کہا۔ "کھول کر دیکھ لو۔ ان میں صرف ہمارے کپڑے ہیں، تمہاری کمائی کی کوئی چیز نہیں ہے۔"

"آپ مجھے چھوڑ کر نہیں جائیں گی۔"

"تمہارے باپ کا آخری حکم تھا، اس محل سے نکل جاؤ، اپنے گھر واپس جاؤ۔"

"ابو کا حکم کیا غلطی نہیں ہوسکتا؟ وہ انسان تھے، ان سے غلطیاں ہوتی رہی ہوں گی۔"

"بے شک انسان خطا کا پتلا ہے۔ ان سے بھی غلطیاں ہوتی رہیں لیکن ایسی کوئی

غلطی نہیں ہوئی جس سے رزق حرام ہو اور باپ دادا کی تہذیب پر حرف آئے۔"

وہ آنگن کے فرش سے اٹھ گئیں۔ میں نے کہا۔ "میں نے اس علاقے میں دور دور تک عزت اور شہرت حاصل کی ہے۔ آپ نے دیکھا، ابو کے جنازے کو کاندھا دینے ہزاروں لوگ آئے۔ آپ بچوں کو لے کر گھر سے جائیں گی تو لوگ کیا کہیں گے، میری عزت کیا رہ جائے گی؟"

"تمہارے ابو کو کبھی بے عزتی کا خوف نہیں ہوا کیونکہ انہوں نے کام ہی ایسے نہیں کئے۔ تم نے جو کیا ہے وہ تمہارے سامنے ضرور آئے گا۔ میں وہ ماں نہیں ہوں جو تمہارے پاؤں پڑنے سے یہاں رک جاؤں گی کیونکہ تم ہی میرے ایک بیٹے نہیں ہو، میں اپنی بیٹیوں کو عزت سے بیاہنے کے لئے تمہاری چوکھٹ چھوڑ رہی ہوں۔"

میں انہیں روکتا رہا، منت سماجت کرتا رہا لیکن وہ میرے بھائی بہنوں کو لے کر چلی گئیں۔ میں اونچی آواز میں بول نہیں سکتا تھا۔ انہیں غصے اور جبر سے روکنا چاہتا تو محلے والوں کو ماں کی ناراضگی اور گھر چھوڑ کر جانے کا علم ہوجاتا۔ یوں ان کے خاموشی سے چلے جانے کے بعد میں سو طرح کے جھوٹ بول کر محلے والوں کو مطمئن کرسکتا تھا۔

باپ مرگیا۔ ماں نے ساتھ چھوڑ دیا۔ ایک عالی شان کوٹھی بنا کر میں بے گھر تھا۔ کیونکہ جب تک ماں باپ، بہن بھائی اور بیوی بچے نہ ہوں، ایک گھر نہیں بنتا۔ ایک اندیشہ یہ بھی تھا کہ ثمینہ کا رشتہ نہیں ملے گا۔ میں لاکھوں کی جائیداد کا مالک بن رہا تھا مگر رشتوں اور محبتوں سے محروم ہو رہا تھا۔ میں کسی کو بھی دولت کے بل پر بیوی بنا کر بچے پیدا کرسکتا تھا۔ ایک نیا گھر بنا سکتا تھا مگر معزز گھرانا نہیں بنا سکتا تھا۔

دروازے پر دستک سنائی دی۔ میں اٹھ کر دروازے پر آیا پھر اسے کھولا۔ باہر ثمینہ کھڑی ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر خوشی سے مسکرانا چاہتا تھا فوراً یاد آگیا کہ ابو کا انتقال ہوگیا ہے۔ مجھے غم زدہ رہنا چاہئے۔ وہ بولی۔ "روٹیاں تیار ہیں، بھائی سے کہہ دیں ہمارے ہاں سے روٹیاں لے آئے۔ ماموں لے آتے لیکن وہ بیمار ہیں؟"

ہمارے گھر میں ماتم تھا۔ چولھا نہیں جلایا جاتا اس لئے ثمینہ کے گھر سے روٹیاں آنے والی تھیں۔ میں نے کہا۔ "امی میرے بھائی بہنوں کو لے کر پرانے محلے میں چلی گئی ہیں۔ یہاں اب کوئی روٹیاں کھانے والا نہیں ہے۔"

وہ منہ چھپا کر کھڑی ہوئی تھی۔ پوچھنا چاہتی تھی وہ لوگ کیوں چلے گئے مگر شرم سے نہیں پوچھ رہی تھی۔ میں نے کہا۔ "تم سے ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں' شرم و حیا کو بالائے طاق رکھ دو۔ ہم دونوں کو ابھی اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنا ہو گا۔"

وہ بولی۔ "کوئی ہمیں باتیں کرتے دیکھے گا تو کیا کہے گا؟"

"جب تمہیں میری زندگی میں آنا ہی ہے تو ڈرتی کیوں ہو؟"

"پھر بھی لڑکی کو بدنامی سے بچنا چاہئے۔ اس وقت ہماری گفتگو مناسب نہیں ہے۔"

"اسی وقت مناسب ہے۔ میں بہت پریشان ہوں' اگر ابو کے سوم میں امی اور بھائی بہن یہاں نظر نہیں آئیں گے تو لوگ کیا کہیں گے۔"

"آخر وہ کیوں چلے گئے؟"

"میں اپنی بدقسمتی کی روداد چند لفظوں میں نہیں سنا سکوں گا۔ پلیز اندر آجاؤ۔"

وہ راضی نہیں ہو رہی تھی۔ میں نے بڑی مشکلوں سے راضی کیا۔ وہ آنگن میں آکر بیٹھ گئی۔ میں اسے درخشاں سے ہونے والے رشتے کی روداد سنانے لگا۔ یہ بات اس کی توقع کے خلاف تھی کہ میری زندگی میں اس سے پہلے ایک لڑکی آچکی ہے اور میرے بچے کی ماں بھی بن چکی ہے۔ میں نے ثمینہ کے چہرے پر مایوسی کے سائے دیکھے اور جب بتایا کہ طلاق ہو چکی ہے تو وہ اطمینان کی سانس لے کر بولی۔ "درخشاں نے ایسا کیوں کیا؟ مانا کہ وہ ہمارے سامنے بھی ایک بچے کی آرزو کرتی تھی لیکن یہ عجیب سی بات ہے کہ پاؤں بھاری ہوتے ہی اس نے طلاق لے لی؟"

"ہاں' اس نے عجیب حرکتیں کی ہیں۔ اس کے بدلے مجھے دولت ملی ہے۔"

"آپ نے دولت کو دیکھ کر یہ نہیں سوچا کہ اس کے لئے بچہ کیوں ضروری تھا؟"

"کبھی کبھی سوچتا ہوں گھوم پھر کر ایک یہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ جب وہ میری بیوی بن کر آئی تھی تو کنواری نہیں تھی' بیوہ یا مطلقہ تھی۔ پہلے شوہر سے اولاد نہیں ہوئی تھی۔ مجھ سے شادی کر کے اس نے ثابت کر دیا کہ وہ پہلے بھی ماں بن سکتی تھی۔ شوہر بانجھ تھا۔ عورت بانجھ ہونے کا الزام برداشت نہیں کرتی اس نے بھی برداشت نہیں کیا۔"

"تم نے اپنا بچہ اسے دے دیا۔ تمہیں کوئی دکھ نہیں ہوا؟"

"کیسا بچہ؟ میں نے اپنے کسی بچے کی صورت نہیں دیکھی۔ میں تو یہ بھی نہیں جانتا کہ واقعی وہ دنیا میں آنے والا تھا۔ درخشاں کی زبان سے سن کر مان لیا ہے۔"

"کیا درخشاں یاد نہیں آتی؟"

"میں نے کبھی اس سے محبت نہیں کی۔ وہ میری زندگی میں ایک حادثے کی طرح آئی اور گزر گئی۔ ایسے کرداروں کا ذکر چھڑ جائے تو یاد آتے ہیں۔ مگر محبت سے کبھی یاد نہیں آتے۔"

"اب مسئلہ کیا ہے؟"

"میرے والدین کہتے ہیں' میں ناجائز دولت کما رہا ہوں۔ جبکہ میری ٹیکسیاں اور بسیں چل رہی ہیں۔ ان سے جائز آمدنی ہوتی ہے۔"

"لیکن والدین اس ناجائز آمدنی کا حساب کرتے ہیں جو آپ نے بچہ دے کر حاصل کی ہے۔"

"میں نے کسی سے بچے کا ذکر نہیں کیا ہے' صرف تم سے کیا ہے کیونکہ تم سے کوئی جھوٹ بول کر' کوئی بات چھپا کر محبت کی توہین نہیں کروں گا۔ اگر کبھی ایسا کیا تو میرا ضمیر مجھے ملامت کرے گا۔"

اس نے سر جھکا لیا۔ اس بات نے اس کے اندر مسرتیں بھر دی ہوں گی کہ میں محبت کے مارے کبھی اس سے کوئی بات نہیں چھپاؤں گا اور میں اپنی ثمینہ کے معاملے میں ضمیر کی آواز سنتا ہوں۔ ہر بیوی یہی چاہتی ہے کہ اپنا مرد کوئی بات نہ چھپایا کرے اور اس کے ساتھ باضمیر رہا کرے۔ یہ بیچاری بیویاں بڑی جلدی خوش ہو جاتی ہیں۔

وہ بولی۔ "آپ کی والدہ کو آج نہیں جانا چاہئے تھا۔"

"امی ابو کی باتوں پر اندھا یقین کرتی ہیں۔ آج پولیس والوں نے مجھے ابو کے سامنے مجرم کہہ کر گرفتار کر لیا۔ یہ بات ان کے دل کو لگ گئی کہ میری کمائی حرام کی ہے۔"

"کیا آپ گرفتار ہو گئے تھے؟"

"ہاں' جب تھانے پہنچا تو وہاں اصلی مجرم کو گرفتار کر کے لایا گیا تھا۔ اس کا نام بھی شریف تھا۔ اس دھوکے میں مجھے پکڑا گیا تھا۔ پولیس افسر نے ندامت کے ساتھ مجھ

سے معافی مانگی پھر عزت سے رہا کردیا۔"

"امی کو سمجھانا چاہئے کہ آپ مجرم ہوتے تو رہا نہ کئے جاتے؟"

"امی اپنے دماغ سے نہیں ابو کے دماغ سے سوچتی آئی ہیں۔"

"آپ فکر نہ کریں' میں انہیں سمجھا منا کر لاؤں گی۔"

"ذرا سوچو' وہ نہ آئیں تو سوم کے روز لوگ کیا سوچیں گے؟"

"میں آپ کی پریشانی سمجھتی ہوں' میں کل صبح ہی انہیں لے کر آؤں گی۔"

"میں نے گھر والوں سے کہا ہے' درخشاں اب اس دنیا میں نہیں رہی ہے۔ اس کے حصے کی دولت مجھے ملی ہے اور میرا اس پر حق ہے۔"

وہ اٹھ کر بولی۔ "آپ میرے ہاں چل کر روٹی کھائیں۔"

"مجھے بھوک نہیں ہے۔"

وہ دروازے پر جا کر بولی۔ "پھر میں بھی بھوکی رہوں گی۔"

یہ سن کر بڑی خوشی ہوتی ہے کہ ہماری چاہنے والی ہمارے ساتھ بھوکی رہتی ہے۔ میں اس کے گھر گیا' ماموں ممانی سے ملاقات کی۔ روٹی کھانے کے دوران ثمینہ نے انہیں میرے حالات بتائے' ماموں نے کہا۔ "تمہاری امی نے جوش میں آکر گھر چھوڑا ہے۔ اطمینان رکھو سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

میں کھانے کے بعد اپنی کوٹھی میں آیا۔ بستر پر لیٹ کر سوچنے لگا میں نے جس انداز میں دولت حاصل کی ہے اس پر ثمینہ کو اعتراض نہیں ہے۔ میں نے جوئے' سٹے اور منشیات فروشی والی آمدنی کا ذکر نہیں کیا تھا۔ اتنا تو سمجھتا ہوں کہ گھریلو عورتیں ایسے جرائم میں اپنے مردوں کو ملوث نہیں دیکھنا چاہتیں کیونکہ ان سے مرد گمراہ ہوتے ہیں۔ ہاں اگر سوکن کو طلاق دے کر بچہ سوکن کو سونپ کر دولت حاصل کی گئی ہو تو وہ بری نہیں لگتی۔ کیونکہ سوکن سے نجات مل چکی ہوتی ہے اور سوتیلا بچہ بھی میاں کی زندگی سے نکل چکا ہوتا ہے اور یہی باتیں ثمینہ کے اطمینان کا باعث تھیں۔

اس نے دوسری صبح امی کے پاس جا کر انہیں سمجھایا کہ ابو کو میرے بارے میں غلط فہمی تھی۔ میں مجرم نہیں تھا اسی لئے تھانے سے چھوٹ کر آگیا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ ماں کو خوش ہونا چاہئے کہ اس کے بیٹے نے کینسر کی ایک مریضہ کو اس کے آخری دنوں میں خوش رکھا۔ اسی مریضہ کے بعد جو دولت حاصل ہوئی وہ ناجائز نہیں ہے' نیکی

کا صلہ ہے۔

ایک تو ثمینہ نے مدلل باتیں کیں' جن سے امی انکار نہ کر سکیں۔ پھر اوپر سے وہ پتھر تھیں اندر سے تو ماں تھیں' بیٹے کو تنہا چھوڑنے کا دکھ تھا۔ تیسرے یہ خیال بھی تھا کہ ابو کی روح سوم کے روز اسی کوٹھی میں آئے گی' جہاں سے میت اٹھائی گئی تھی لہٰذا وہ بچوں کے ساتھ واپس آگئیں۔

میں نے چالیس دن کے بعد ہی امی کے کانوں میں پھونکنا شروع کردیا کہ وہ بہو لے آئیں۔ ایسا نہ کرتا تو شاید وہ ابو کی برسی منانے کے بعد بہو کے متعلق سوچتیں۔ پہلے تو وہ ٹالتی رہیں کہ ایسی جلدی بھی کیا ہے پھر رفتہ رفتہ قائل ہو گئیں۔ چار ماہ کے بعد ہی ثمینہ دلہن بن کر آگئی۔

جب درخشاں میری زندگی میں پہلی بار آئی تھی تو وہ بیوی تھی' دلہن نہیں تھی۔ میں نے جو پہلی دلہن دیکھی' وہ ثمینہ تھی۔ پورے مشرقی رسم و رواج کے مطابق دلہن کا جو روپ نکھرتا ہے' اسے درخشاں جیسی عورتیں نہیں سمجھ پاتیں' یہ عورتیں بیوٹی پارلر میں دلہن بنتی ہیں۔ ثمینہ ابٹن اور مہندی کی رسموں سے گزر کر پھول کی طرح نکھر گئی تھی۔ ابٹن کی ڈھلی ہوئی مہک اور حنا کی خوشبو نے مجھے مسحور کردیا تھا۔ مجھے صبح تک یقین ہوتا رہا کہ میں نے ایک دلہن جیت لی ہے۔ دلہن کی ایک تعریف یہ ہے کہ وہ بار بار دلی کی طرح اجڑتی ہے اور پھر بھی آباد رہتی ہے۔ بدن کا سونا لٹ جاتا ہے روپ کی چاندی پرائی ہو جاتی ہے پھر بھی وہ دلہن رہتی ہے۔ کیونکہ عورت کو اس کی حیا دلہن بناتی ہے۔ سولہ سنگھار سلامت نہیں رہتے' حیا باقی رہتی ہے۔ میں نے ایک بار اسی برس کی بوڑھی کو دیکھا' کسی بات پر اپنے بوڑھے کے سامنے شرما گئی تھی۔ ان لمحات میں وہ مجھے پہلی رات کی دلہن دکھائی دی۔ ان لمحات میں گیان حاصل ہوا کہ حیا عورت کو بوڑھی نہیں ہونے دیتی' اسے سدا جوان رکھتی ہے۔

ثمینہ نے آکر بڑی خوبصورتی سے گھر کو سنبھالا تھا۔ وہ ہر بات میں امی کی ہاں میں ہاں ملایا کرتی تھی۔ ان کے طور طریقوں پر عمل کرتی تھی۔ میرے بھائیوں کی تعلیم کا خیال رکھتی تھی اور بہنوں کا رشتہ ڈھونڈنے میں لگی رہتی۔ ایک برس بعد اس نے ایک بیٹی کو جنم دیا۔ امی نے اس کا نام آمنہ رکھا۔ میں نے کہا۔ "بڑی بوڑھیوں کے نام ایسے ہوا کرتے ہیں۔ نئے زمانے کے مطابق نام رکھنا چاہئے۔"

"بیٹے صاحب! تم روز بہ روز انگریز بنتے جا رہے ہو۔ ثمینہ کہہ رہی تھی تم اسے امریکا لے جا رہے ہو۔"

"ہم ایک بزنس ٹور پر جا رہے ہیں۔"

"یہ کیا ہوتا ہے؟"

"ہم کاروباری مقصد کے لئے جا رہے ہیں۔ کامیابی ہوگئی تو ہمارا بزنس امریکا تک پھیل جائے گا۔"

تین ماہ بعد میں ثمینہ اور اپنی بیٹی کے ساتھ امریکا گیا۔ سفر کے دوران ایک فرانسیسی خاتون ہمارے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے میری بیٹی کو پیار کرتے ہوئے پوچھا۔ "بے بی کا نام کیا ہے؟"

ثمینہ نے اس کا نام آمنہ بتایا۔ نام نہایت آسان ہے مگر خاتون کے لئے مشکل تھا۔ اس نے نام کی ادائیگی بگاڑتے ہوئے پوچھا۔ "ایمونا؟"

ثمینہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ہاں ایمونا" پھر مجھ سے کہا۔ "ایمونا کہنے سے کتنا اچھا لگتا ہے۔"

میں نے تائید کی۔ "واقعی جدت ہے۔"

اس دن سے ہم نے اپنی بیٹی کو فارن آئیٹم بنادیا۔ اسے ایمونا کہہ کر مخاطب کرنے لگے۔ ہم دیکھ رہے تھے کہ دنیا تیزی سے بدل رہی ہے۔ ہمارے ملک کے دولت مند گھرانوں میں امریکی چھاپ لگ چکی تھی۔ ہم بھی لاکھوں میں کھیل رہے تھے اور جلد ہی کروڑ پتی بننے والے تھے۔ سوچا تھا' واپس آکر سوسائٹی میں کوٹھی تعمیر کرائیں گے اور اونچے طبقے میں رہیں گے۔ اپنے بچوں کو تعلیم و تربیت کے لئے امریکا میں رکھیں گے۔

پے در پے کامیابیاں ہمارے قدم چوم رہی تھیں۔ ہمارے ملک کے ایک بہت بڑے سیاست دان نیویارک میں بیٹھ کر پاکستان کی بساط پر سیاسی چالیں چلتے رہتے تھے۔ میں ان سے ہی ملاقات کے لئے گیا تھا۔ ان کے حواریوں نے انہیں بتایا تھا کہ احمد نگر اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں شریف زبیری کا بول بالا ہے۔ یہ گھوڑا الیکشن میں سب سے آگے رہے گا۔ اس سیاست دان نے گھوڑے کی طرح میری پیٹھ تھپ کر کہا۔ "ہماری پارٹی سے تمہیں ٹکٹ ملے گا۔ بولو کیا چاہتے ہو؟"

میں نے کہا۔ "امریکا کی شہریت اور کوئی چھوٹا سا کاروبار چاہتا ہوں۔"

انہوں نے کہا مجھے رفتہ رفتہ شہریت مل جائے گی۔ البتہ چائنا ٹاؤن میں پٹرول پمپ کے لئے ایک جگہ دلائی اور مالی امداد بھی دی۔ میں نے واپس آکر انتخابی مہم شروع کی۔ میرے حریف میری شہرت اور مقبولیت سے پریشان تھے۔ دوسری سیاسی پارٹیاں بھی مجھے خریدنا چاہتی تھیں۔ داؤد نے مجھے سمجھایا۔ "آپ نے امریکا میں جو سودا کیا ہے' اسی پر قائم رہیں۔ آئندہ آپ کو بے شمار فائدے پہنچیں گے۔"

میں نے اسے حیرانی سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں سودا کرنے امریکا گیا تھا؟"

وہ بولا۔ "ایک ادنیٰ خادم ہوں' میری زبان اتنا ہی بولتی ہے جتنی کہ اجازت دی جاتی ہے۔ یہ بی بی کی آخری خواہش تھی کہ آپ ہم سے کبھی الگ نہ ہوں۔"

"کیا میں جس پارٹی سے منسلک ہوں اس کا تعلق بھی بی بی جی سے ہے؟"

"شاید ہے' ان کے لئے دعا کریں۔ انہوں نے آخری سانسوں میں آپ کو یاد کیا تھا۔ آپ کو بلایا تھا مگر آپ امریکا میں تھے۔"

میں تھوڑی دیر تک سر جھکائے بیٹھا رہا۔ آخر کینسر نے اسے مار ڈالا۔ اس سے مجھے دلی لگاؤ نہیں تھا۔ پھر بھی دل کو اس کی موت کا صدمہ ہوا۔ اس نے اگرچہ بیوی کی محبت کبھی نہیں دی' تاہم دوست کی حیثیت سے اچھے برے وقتوں میں کام آتی رہی۔ میں نے عہد کرلیا کہ اس کی آخری خواہش کے مطابق ایک ہی سیاسی پارٹی کا وفادار رہوں گا۔

وہ مرنے کے بعد بھی مجھ سے بھلائی کرتی رہی۔ اس کے پیچھے جو لوگ تھے' وہ داؤد کے ذریعے ہمیشہ میرے کام آتے رہے۔ الیکشن میں مجھے ووٹوں کی بھاری تعداد سے کامیابی حاصل ہوئی۔ یہاں سے میرا سیاسی کیریئر بننے لگا۔ کبھی کسی شعبے کا اور کبھی کسی شعبے کا منسٹر بننے لگا۔ کبھی اقتدار کی کرسی سے نیچے گرایا گیا' کبھی جیل پہنچایا گیا پھر بھی سیاست کے میدان میں کامیابیاں زیادہ حاصل ہوتی رہیں۔ یہ سب کچھ چند مہینوں یا چند برسوں میں نہیں ہوا۔ یہ میدان مارنے میں تقریباً بیس برس گزر گئے۔

اس عرصے میں میرے بھائیوں اور بہنوں نے اپنا اپنا گھر بسالیا تھا۔ میری بہنیں اونچے خاندانوں میں بیاہی گئی تھیں۔ دونوں بھائی بڑے کاروباری بن گئے

تھے۔ ثمینہ ہر چھ یا سات سال بعد مجھے اپنے بچوں کا باپ بناتی رہی۔ بڑی بیٹی کے
بعد دو اور بیٹے ہوئے تھے۔ امی بہت خوش تھیں۔ میں ان کے سامنے اپنے عروج و
زوال کی مٹھی بند رکھتا تھا۔ انہیں کبھی یہ معلوم نہیں ہونے دیا کہ کس طرح
جھوٹ' فریب اور بے ایمانیوں سے عروج حاصل کرتا ہوں اور جب زوال آتا ہے
تو جیل چلا جاتا ہوں۔ اب میرے ہاتھوں میں ہتھکڑی لگنے سے اور جیل جانے سے وہ
مجھے مجرم نہیں سمجھتی تھیں۔ کیونکہ مشہور معروف لیڈروں میں میرا شمار ہوتا تھا۔
گرفتاری کے وقت لوگ شریف زبیری زندہ باد کے نعرے لگاتے تھے۔ اخبارات
میں میری تصویریں شائع ہوتی تھیں۔ شہر کی دیواروں پر میری رہائی کے مطالبات
لکھے جاتے تھے۔ میری مخالف نئی حکومت مجھ پر منشیات فروشوں کی سرپرستی اور
حکومت کے خزانے کے بیجا استعمال کا الزام لگاتی تھی۔ یہ مقدمات چلتے رہتے تھے۔
میرے جرائم کو ثابت کرنے والی وہ مبارک گھڑی کبھی نہیں آتی تھی۔ مقدمات کا
سلسلہ جاری رہنے کے دوران حکومت بدل جاتی تھی۔ نئی حکومت مجھے جیل سے
باہر لاکر پھولوں کے ہار پہناتی تھی۔ پھر کسی شعبے کا منسٹر بنادیتی تھی۔ یہی ہمارا سیاسی
کیریئر اور یہی ہماری سیاسی تاریخ ہے۔

میں اسکول کے امتحانات میں ہر سال اول آتا تھا۔ اگر یہی کتابوں والی ذہانت
سے کام لیتا تو آج کسی سرکاری نیم سرکاری دفتر میں ہیڈ کلرک ہوتا۔ کیونکہ میرے باپ
کی تنخواہ نے مجھے دس جماعتوں سے آگے پڑھنے نہیں دیا تھا اور ان کی شرافت اور
دیانت مجھے کلرک یا اسکول ماسٹر بناسکتی تھی۔ ذہانت میں جھوٹ شامل ہوجائے تو وہ
ذہانت مکاری کہلاتی ہے۔ یہ درخشاں کا احسان تھا کہ اس نے میری ذہانت سے تھوڑا
جھوٹ فریب شامل کرکے آج مجھے اس اونچے مقام تک پہنچادیا تھا۔

بزرگ حضرات فرماتے ہیں کہ زندگی گزارنے کا طریقہ غلط ہوگا تو مستقبل میں
نتائج بھی غلط اور عبرتناک ہوں گے۔ ان کا یہ فرمان بالکل ہی غلط نہیں ہوسکتا۔ ایسے
نتائج پیش آتے ہوں گے لیکن ہمارے جیسے کامیاب اور کامران لوگوں کے لئے یہ بات
غلط ہے۔ ہمیں اپنے جھوٹ' فریب اور غلط دھندوں کی سزا کبھی نہیں ملتی بلکہ انعام ملتا
ہے۔ میری ایک کوٹھی اور چار کاریں ڈیفنس میں تھیں۔ ایک شاندار کاٹیج مین ہٹن
میں تھا۔ ہماری بیٹی ایمونا مین ہٹن میں اور ایک بیٹا لندن میں زیر تعلیم تھے۔ ثمینہ ان

کی دوری برداشت نہیں کرتی تھی۔ میں سمجھاتا تھا بچوں کے پاس جاکر رہو لیکن وہ مجھے
چھوڑ کر نہیں جاتی تھی۔ ان بیس برسوں میں میں نے اسے اور اس نے مجھے اپنا عادی بنا
لیا تھا۔ پھر یہ کہ وہ مشرقی ماحول کی پروردہ تھی' کسی مغربی ملک میں رہنا نہیں چاہتی
تھی۔ بچوں کے معاملے میں اتنی لچک پیدا کی تھی کہ انہیں موجودہ دور کے مطابق
زندگی گزرنے کی آزادی دے رکھی تھی۔ ہم نہیں چاہتے تھے کہ اونچی سوسائٹی میں
ہمارے بچے بیک ورڈ سمجھے جائیں۔

ثمینہ اپنے بیٹے اور بیٹی کے پاس جاتی رہتی تھی۔ جب بیٹی جوان ہونے لگی تو وہ
فکر مند ہوگئی۔ ہم دیکھتے آرہے تھے کہ مغربی ملکوں میں خصوصاً انگلینڈ اور امریکا میں
پاکستانی لڑکیوں کو بوائے فرینڈ بہت مل جاتے ہیں مگر دلہا نہیں ملتا۔ وہ کبھی مشرقی دلہن کی
طرح سرخ جوڑا نہیں پہنتیں۔ کبھی ابٹن اور مہندی نہیں لگواتیں۔ خوش قسمتی سے
کوئی جیون ساتھی بننے کو راضی ہوجائے تو اس کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر عدالتی
کاغذات پر دستخط کرکے اس کے گھر چلی جاتی ہیں۔ صرف اتنا ہی نہیں' وہ شادی سے
پہلے اپنے ہونے والے یا نہ ہونے والے کو ڈیٹ دیتی ہیں۔ یہی سوچ کر ثمینہ پریشان
ہورہی تھی کہ ہماری بیٹی نے بھی ڈیٹ دینا شروع کیا تو کتنی بے حیائی کی اور ڈوب
مرنے کی بات ہوگی۔

نئے بیمار کو پہلی بار انجکشن لیتے وقت سوئی کی نوک سے ڈر لگتا ہے۔ پھر وہ
مسلسل اسپتال میں رہے تو سوئی کی چبھن کا عادی ہوجاتا ہے۔ ہم نے بھی اپنی بیٹی کو بیمار
تہذیب کے اسپتال میں چھوڑا ہوا تھا۔ وہاں اس کا جو بھی علاج ہوتا وہاں کے دستور
کے مطابق ہوتا۔ ہمارے ڈرنے یا حیا سے مرنے کا اثر اس پر نہ ہوتا۔ ایک بار ثمینہ بیٹی
کو کراچی لائی تھی۔ ارادہ تھا اسے جانے نہیں دے گی۔ یہیں اس کا رشتہ کرے گی
لیکن ایمونا نے ایسی حرکتیں کیں' ایسا کہرام مچایا کہ اسے واپس بھیجنا پڑا۔ وہ امریکا کی
شہری تھی اور ہم ماں باپ اس پر بیجا پابندیاں عائد نہیں کرسکتے تھے۔ وہاں کے قانون
کے مطابق والدین اپنے بچوں کے سامنے بے بس ہوتے ہیں۔ یعنی اس حد تک بے بس
ضرور ہوتے ہیں کہ اپنی پسند کی تہذیب ان کے سر نہیں تھوپ سکتے۔

ایک بار ثمینہ لندن سے آئی میں نے پوچھا۔ "ہمارا بیٹا کیسا ہے؟"
وہ کچھ ناراض سی تھی کہنے لگی۔ "آپ کو تو بچوں سے کوئی لگاؤ نہیں رہا۔ دن

رات سیاست میں پڑے رہتے ہیں۔"

"بھئی تمہاری جیسی ذمے دار ماں ان کے سروں پر موجود ہے تو پھر میری ضرورت کیا ہے؟"

"مجھے ذمے داریاں پوری کرنے کون دیتا ہے؟ ایک مین ہٹن میں جڈی بنیان پہن کر گھومتی ہے۔ دوسرا لندن کی سڑکوں پر کار دوڑاتا پھرتا ہے۔ کسی نہ کسی لڑکی کو لفٹ دیتا رہتا ہے۔"

میں ہنستے ہوئے بولا۔ "اچھا بیٹا بھی جوان ہوگیا ہے۔"

"آپ ہنس رہے ہیں۔ ابھی تو وہ چودہ برس کا ہے۔ ہم نے ایسے ماحول میں اسے پہنچا دیا ہے جہاں عورتیں اوپر نیچے ایک ایک بالشت کا کپڑا لپیٹ کر اتراتی پھرتی ہیں۔ ایسے ماحول میں بارہ چودہ برس کے بچے ہڑبڑا کر جوان ہو جاتے ہیں۔"

"ثمینہ! ہم نے ہر بچے کی پیدائش کے وقت اونچے اونچے خواب دیکھے تھے کہ اپنے بچوں کو ہائی لیول پر رکھنے کے لئے انگلینڈ اور امریکا میں تعلیم دلائیں گے۔ ذرا دیکھو کہ کتنا رعب اور بڑا پن ہے۔ ہم اور ہمارے بچے پاکستان میں کسی سے کمتر نہیں ہیں۔ ہمارے دوست احباب' عزیز رشتے دار ہمارے بچوں کو امریکیوں اور فرنگیوں کے انداز میں انگریزی بولتے دیکھ کر مرعوب ہو جاتے ہیں۔ وہ دیسی نہیں لگتے' چاند ستاروں سے آئی ہوئی دیدہ زیب' پُرکشش مخلوق لگتے ہیں۔"

وہ بولی۔ "ٹھیک ہے' ہماری ہر خواہش پوری ہوئی ہے۔ جب دو بچے تھے تو ہم نے انہیں آسمان کی بلندی دے دی مگر اب آسمان سے کیسے اتاریں؟ وہ جوان ہو گئے ہیں۔ میں مغربی تعلیم دلانا چاہتی تھی مگر وہ مغربی تہذیب کی لپیٹ میں آگئے ہیں۔"

"تو کیا ہوا؟ بچوں کو کون سا یہاں آنا ہے۔ ایک دن ہم بھی وہاں چلے جائیں گے۔"

"کیا اپنا ملک چھوڑ دیں گے؟"

"اس ملک میں رکھا ہی کیا ہے۔ ہم سیاستدان جس طرح اس کا گوشت نوچ نوچ کر کھا رہے ہیں اس طرح تو پاکستان کی ہڈیاں بھی نہیں رہیں گی۔"

میں نے یہ بات عادتاً طنزیہ انداز میں کہہ دی۔ ایسا کہتے وقت ایک ذرا احساس نہیں ہوا کہ میں بھی اپنی ماں کا گوشت نوچ نوچ کر کھا رہا ہوں سوچنے کی بات ہے ماں

نہیں رہے گی تو گود نہیں رہے گی۔ جانے دو گود نہیں رہے گی' امریکا تو رہے گا۔

ایک شام فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اٹھایا' دوسری طرف سے داؤد کی آواز سنائی دی۔ اس نے میری آواز سن کر کہا۔ "سر! آپ سے ضروری باتیں کرنی ہیں کیا ابھی آپ آسکیں گے؟"

"تم کہاں ہو؟"

"میں پتا بتا رہا ہوں آپ کسی سے اس ملاقات کا ذکر نہ کریں۔ جتنی جلدی ممکن ہو' چلے آئیں۔"

اس نے پتا بتایا' میں نے پوچھا۔ "کیا بیمار ہو؟ میں نے کراہنے کی آواز سنی ہے۔"

"بیمار نہیں بری طرح زخمی ہوں' پلیز آپ آجائیں۔"

"میں ابھی پہنچ رہا ہوں۔"

میں نے ریسیور رکھا پھر کوٹھی سے باہر آکر کار میں بیٹھ گیا۔ میں نے یہ پوچھنے میں وقت ضائع نہیں کیا تھا کہ وہ کیسے بری طرح زخمی ہوگیا ہے؟ کس نے اسے زخمی کیا ہے؟ یہ باتیں میں اس کے پاس پہنچ کر معلوم کر سکتا تھا۔ بہرحال میں تیز رفتاری سے ڈرائیو کرتا ہوا کھوکھرا پار کے ایک چھوٹے سے مکان میں پہنچا۔ دروازے پر ایک عورت کھڑی ہوئی تھی' وہ داؤد کے ساتھ رہا کرتی تھی۔ اس نے مجھے اندر بلایا' میں نے ایک کمرے میں آکر دیکھا۔ وہ فرش پر پڑا ہوا اپنے لہو میں تقریباً نہا چکا تھا۔ میں نے دوڑ کر اس کے پاس فرش پر گھٹنے ٹیک کر پوچھا۔ "یہ............ یہ کیسے ہوا؟"

وہ گہری گہری سانسیں لیتا ہوا بولا۔ "ہم جس دھندے میں ہیں اس میں پہلے موت نہیں آتی پہلے شامت آتی ہے۔ مجھے کچھ نامعلوم لوگ پکڑ کر لے گئے تھے۔ پتا نہیں وہ کون سی جگہ تھی۔ وہاں مجھ پر تشدد کرتے رہے اور ہمارے پارٹی لیڈر کی کمزوریاں پوچھتے رہے۔ میں بوڑھا ہوگیا ہوں' ان کا ظلم برداشت نہ کرسکا اپنے لیڈر کی ایک بہت بڑی کمزوری انہیں بتا دی۔"

وہ رک رک کر کراہنے لگا پھر کہنے لگا۔ "انہوں نے ہمارے لیڈر کو بلیک میل کرنا چاہا۔ مگر وہ زبردست فولادی ارادوں کا مالک ہے۔ اس نے مخالف پارٹی کے لیڈر سے کہا' وہ کمزوری ثابت کردو تو میں سیاست چھوڑ دوں گا۔ تمہارے لئے میدان صاف

کردوں گا۔ دشمنوں نے مجھے آزاد کردیا تھا۔ میں جانتا تھا راز فاش کرنے کی سزا مجھے ملے گی۔ ہمارا پارٹی لیڈر مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ میں بھاگتا ہوا یہاں آیا تاکہ پاسپورٹ اور ضروری کاغذات لے کر یہ ملک چھوڑ دوں لیکن یہاں پہنچتے ہی فائرنگ شروع ہوگئی۔ مجھے دو گولیاں لگیں۔ میں گر پڑا۔ گولیاں چلانے والے فرار ہوگئے۔"

میں نے پوچھا۔ "کیا پارٹی لیڈر کو صاحب کہہ رہے ہو؟"

"ہاں' وہ ہمارے تمام دھندوں کے بڑے صاحب تھے اور........... بی بی جی کے شوہر تھے۔"

میں ایک دم سے چونک گیا۔ جلدی سے پوچھا۔ "کیا درخشاں نے مجھ سے طلاق لے کر صاحب سے شادی کی تھی؟"

"آپ سے شادی سے پہلے مطلقہ تھیں۔ انہوں نے صاحب سے طلاق لی پھر آپ سے شادی کی۔ پھر آپ سے طلاق لی' اس کے بعد پھر صاحب سے شادی کرلی۔"

میں ان لمحات میں بچے کو بھول گیا تھا۔ اس لئے پوچھا۔ "یہ کیا چکر ہے۔ درخشاں نے ایسا کیوں کیا؟"

وہ تکلیف سے کراہتے ہوئے بولا۔ "صاحب بانجھ تھے۔ مگر بی بی جی کو جان سے زیادہ چاہتے تھے۔ بی بی جی ان پر جان دیتی تھیں۔ ان کے درمیان دو برس تک بحث چلتی رہی۔ صاحب چاہتے تھے کہ بی بی جی کی گود بھر جائے۔ دونوں میاں بیوی کاروباری ذہن رکھتے تھے۔ انہیں ویسے بھی بے انتہا دولت کا وارث چاہئے تھا۔ تب صاحب نے یہ مشورہ دیا کہ بی بی جی طلاق لے کر عدت کے دن پورے کریں پھر کسی سے شادی کرلیں جب ماں بننے کے آثار پیدا ہوں تو طلاق لے لیں۔ پھر بچے کی پیدائش کے بعد صاحب سے شادی کرلیں۔"

"ہمارے دین میں یہ جائز نہیں ہے کہ جان بوجھ کر کسی خاص غرض کے لئے بار بار طلاقیں لی جائیں اور یوں اپنے سابقہ شوہر کی طرف لوٹا جائے۔"

"دین میں تو غلط دھندے بھی جائز نہیں ہیں' سماجی اور سیاسی زندگی میں ہیرا پھیری' جھوٹ اور فریب کی ممانعت ہے۔ مگر ایسا آپ لوگ کرتے آرہے ہیں اور ایسا اکثر لوگ کرتے رہتے ہیں۔"

"کیا ان میاں بیوی کو یقین تھا کہ میں درخشاں سے شادی کے بعد اسے طلاق

دے دوں گا؟"

"طلاق حاصل کرنے سے پہلے آپ کو غلط دھندوں میں الجھایا گیا۔ غلط دھندا کرنے کے دوران آپ کی تصویریں اتاری گئیں۔ آپ کے آڈیو کیسٹ موجود ہیں۔ بی بی جی نے بتایا تھا کہ آپ دل کے بہت اچھے اور انسان دوست ہیں۔ آپ کی رحم دلی سے کھیلنے کے لئے جھوٹی میڈیکل رپورٹ حاصل کی کہ بی بی جی کینسر کی مریضہ ہیں۔"

"کیا وہ کینسر کی مریضہ نہیں تھیں؟"

"آہ!" اس نے ایک لمبی سانس لی۔ "انہوں نے سوچا تھا اگر آپ ایک کینسر کی مریضہ کی آخری خواہش سمجھ کر اسے طلاق نہیں دیں گے اور اس کے پاس بچہ نہیں رہنے دیں گے تو غلط دھندوں کے ثبوت پیش کرکے آپ کو لمبی مدت کے لئے جیل بھیج دیا جائے گا۔ آپ سزا کاٹ کر باہر آئیں گے تو آپ کو دوسرے الزامات میں جیل پہنچا دیا جائے گا لیکن آپ ان کی توقع سے زیادہ وفادار دوست ثابت ہوئے۔ آپ کی ذات سے انہیں مختلف دھندوں میں زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچتا رہا۔ اس کے عوض انہوں نے آپ کو بھی آسمان پر پہنچا دیا۔"

وہ اکھڑی اکھڑی سانسیں لے رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔ "کیا تمہاری عورت نے ڈاکٹر کو بلایا ہے؟"

"نہیں' اب کسی ڈاکٹر کی ضرورت نہیں رہی۔ میں نے تمہیں اتنا کہنے کے لئے بلایا ہے' مجھے صاحب سے کوئی گلہ نہیں ہے۔ انہوں نے تمام عمر مجھے عزت اور دولت دی۔ مگر اس دھندے میں ذرا سی بے وفائی اور بے اعتمادی جان لے لیتی ہے۔ میری نصیحت ہے' صاحب سے کبھی غداری نہ کرنا۔"

میں نے پوچھا۔ "درخشاں کینسر کی مریضہ نہیں تھی پھر موت کیسے ہوئی؟"

اس نے خالی خالی نظروں سے دیکھا جیسے آنکھوں سے دم نکل رہا ہو پھر وہ اٹک اٹک کر بولا۔ "ہم جھوٹ بولنے والے قدرت کی طرف سے ملنے والی سزا کو سمجھ نہیں پاتے۔ ہم کہتے ہیں ایسا اتفاقاً ہوگیا ہے۔ میں آخری سانسوں میں تسلیم کرتا ہوں کہ ایسا اتفاقاً نہیں ہوا۔ جھوٹ کی سزا ملی۔ بچے کی پیدائش کے بعد انکشاف ہوا' بی بی جی کو سچ مچ کینسر ہے۔ انہوں نے دم توڑنے سے پہلے کہا تھا' میں شریف سے معافی مانگنا چاہتی

ہوں وہ کہاں ہے؟ میرے محسن کو بلاؤ..........."

داؤد نے ایک لمبی سانس چھوڑ دی پھر ساکت ہوگیا۔ میں نے سوچا وہ اٹک اٹک کر بول رہا ہے پھر بولے گا لیکن میری طرح سٹے کا نمبر بولنے والا ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگیا تھا۔ ہم لکی نمبر بتانے والے' موت کا منحوس نمبر نہیں جانتے کہ کتنی تاریخ کو کتنی ساعت میں کتے کی موت مارے جائیں گے۔ شاید میں بھی طبعی موت نہیں مروں گا شاید حرام موت ہوگی۔

مجھے نصیحت حاصل کرنا چاہئے تھی۔ کینسر کا ڈراما پلے کرنے والی کو سچ مچ کینسر ہوگیا تھا۔ جرائم کی دنیا میں رعب اور دبدبے سے زندگی گزارنے والے داؤد کو دوڑا دوڑا کر گولیوں سے چھلنی کیا گیا تھا۔ اس کے باوجود نصیحت نہیں ہوتی۔ میں نے کتنے ہی کالا دھندا کرنے والوں کو ایئر کنڈیشنڈ کمروں میں آرام دہ بستر پر مرتے دیکھا ہے۔

پھر یہ کہ میں صاحب کا وفادار تھا۔ ادھر سے میرے لئے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اور میں یہ ماننے کے لئے تیار نہیں تھا کہ مجھے بھی سزا مل سکتی ہے۔ میں داؤد کی لاش وہیں چھوڑ آیا۔ اسے صاحب کے حکم سے گولی ماری گئی تھی اس لئے میں اس کی آخری رسومات میں شریک نہیں ہوسکتا تھا۔ یہ بھی سزا کم نہیں تھی کہ ساری زندگی کام آنے والے کی لاش کو ایک داشتہ کے رحم و کرم پر چھوڑ گیا تھا۔

ایک صبح ثمینہ نے خوش خبری سنائی کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ میں نے مسکرا کر کہا "تم تو ایسے شرما رہی ہو جیسے پہلی بار ماں بن رہی ہو۔"

وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ "ہماری ایمونا بیس برس کی ہو رہی ہے۔ اولاد جوان ہوجائے تو ہمیں بچے پیدا نہیں کرنے چاہئیں۔ مجھے تو بڑی شرم آ رہی ہے۔ بچے اب بہت سمجھنے لگے ہیں۔"

"تم خواہ مخواہ ایسا سوچتی ہو۔ ہمارے بچے ترقی یافتہ ملکوں میں رہتے ہیں۔ وہاں ہر بات اپنی عمر سے پہلے سمجھ لی جاتی ہے۔"

"میں وہاں کی نہیں' مشرق کی عورت ہوں۔ جو بات شرم کی ہوگی اس پر مجھے شرم ضرور آئے گی۔"

"بھئی' شرم ایسے وقت آنی چاہئے جب جوان بیٹے بیٹی کی شادی ہوگئی ہو اور ان کے ساتھ ساتھ ہم بھی اس عمر میں بچے پیدا کر رہے ہوں۔ ابھی ایسی کوئی بات نہیں

ہے۔"

"ٹھیک ہے' اس کے بعد کوئی اولاد نہیں ہونی چاہئے۔"

یہ خبر رشتے داروں اور دوستوں کو ملی تو سب نے کہا پیشگی مٹھائی کھلاؤ۔ ثمینہ نے کہا۔ "دوست احباب کو کھلانا پلانا دراصل مل بیٹھنے کا ایک بہانہ ہے۔ اس طرح سب یکجا ہو کر ہنستے بولتے وقت گزار لیتے ہیں۔ کیوں نہ رات کے کھانے کا انتظام کیا جائے۔"

ہم ایک چھوٹی سی تقریب کا پروگرام بنا رہے تھے' ایسے میں ایمونا کا فون آیا۔ اس نے بتایا کہ وہ پرسوں یہاں پہنچ رہی ہے۔ ثمینہ کی خوشیاں دوبالا ہوگئیں۔ اس نے کہا۔ "میری جان! تمہارے آنے کی خوشی میں ہم پرسوں ایک چھوٹی سی پارٹی کریں گے اور بے چینی سے تمہارا انتظار کریں گے۔"

جب فون کا سلسلہ منقطع ہوگیا تو میں نے پوچھا۔ "تم نے یہ کیوں کہا کہ اس کے آنے کی خوشی میں پارٹی دی جا رہی ہے؟"

"توبہ ہے۔ فون پر بتانا کیا ضروری ہے کہ ایمونا کی ہونے والی بہن یا بھائی کے لئے پارٹی کا اہتمام کیا جا رہا ہے۔ وہ آئے گی تو میں اطمینان سے اسے بتاؤں گی۔"

میں نے امی کو بتایا کہ ان کی پوتی امریکا سے آ رہی ہے۔ وہ دعائیں دینے لگیں۔ ان دنوں امی ایک چارپائی پر بیٹھی یا لیٹی رہتی تھیں۔ کچھ بڑھاپے نے کچھ بیماریوں نے انہیں کمزور اور لاغر بنا دیا تھا۔ میرے کمرے کے ساتھ ہی ان کا کمرا تھا۔ ثمینہ دن رات ان پر توجہ دینے اور ان کی خدمت کرتے رہنے کے لئے انہیں اپنے قریب رکھتی تھی۔

ایمونا کی فلائٹ ایسے وقت تھی' جب مہمان پہنچنے والے تھے۔ ثمینہ نے کہا۔ "آپ مہمانوں کو سنبھالیں گے' میں بیٹی کو لینے ایئرپورٹ جاؤں گی۔"

"الٹی بات کرتی ہو۔ گھر کو اور مہمانوں کو دیکھنا عورت کی ذمے داری ہے پھر یہ دعوتوں میں ہر ایک سے رسمی گفتگو کرنا عجیب سا لگتا ہے۔ تم گھر میں رہو گی میں بیٹی کو لے کر آ رہا ہوں۔"

گھر سے نکلتے وقت امی نے کہا۔ "آمنہ کو ذرا ڈھنگ سے لانا۔ سر پر دوپٹہ نہ ہوگا تو مہمان کیا کہیں گے؟"

پورے گھر میں ایک امی ہی ایسی تھیں جو آمنہ کو ایمونا نہیں کہتی تھیں اور اس کے پہناوے پر اعتراض کرتی رہتی تھیں۔ وہ اپنی پوتی کو بہت چاہتی تھیں مگر سامنا ہوتا تو منہ پھیر لیتیں۔ پھر کہتی تھیں۔ "شریف! تُو اپنی اولاد کو کیا بنا رہا ہے؟ کیا امریکا میں کپڑے پہننے کو نہیں ملتے۔ یہ اتنے تھوڑے تھوڑے سے کیوں پہنتی ہے؟"

میں اس بار اسے ایئر پورٹ پر دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ اپنی عادت کے مطابق جینز اور بنیان میں نہیں تھی۔ ڈھیلا ڈھالا خانہ بدوش عورتوں جیسا لباس پہنے ہوئے تھی۔ اس نے میری گردن میں بانہیں ڈال کر مجھے پیار کیا۔ میں جھینپ گیا۔ کوئی یہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ بیٹی باپ کو چوم رہی ہے۔ پھر ہمارے ہاں باپ بیٹی کا اس قدر قریب آنا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ کجا یہ کہ اس نے سرِعام مجھے کِس کیا تھا۔ میں اس کا ہاتھ پکڑ کر تیزی سے چلتا ہوا کار کی طرف آیا۔ وہ بولی۔ "او پاپا! اتنی تیزی سے نہ چلیں۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

وہ کار میں پسینہ پونچھنے لگی۔ وہاں کے سرد موسم سے آئی تھی' یہاں گرمی لگ رہی تھی۔ میں نے کہا۔ "تم خاصی کمزور نظر آ رہی ہو۔ کیا بیمار تھیں؟"

"ہاں' مگر پریشانی کی بات نہیں ہے۔"

ہم اپنی شاندار کوٹھی میں پہنچے۔ پارٹی شباب پر تھی۔ آرکسٹرا کی دھن پر قہقہے بکھر رہے تھے۔ بے تکلف دوستوں کے لئے کوٹھی کے ایک حصے میں شراب کباب کا انتظام تھا۔ میرے ہاں پارٹی میں اس لئے بھی دوست احباب زیادہ آتے تھے کہ مجھ جیسے سیاسی راہنما کے ہاں پینے کی کھلی چھٹی ہوتی تھی صرف اس اسمبلی میں شراب پر پابندی تھی جہاں میں قانون سازی کے لئے جایا کرتا تھا۔ کتنے ہی مہربان ایمونا کو دیکھ کر آگے بڑھے تاکہ گرم جوشی سے خوش آمدید کہہ سکیں لیکن وہ ہاتھ لہرا لہرا کر ہائے ہائے کرتی ہوئی ثمینہ کے پاس آئی۔ اسے چومتی ہوئی بولی۔ "یہاں تو بڑی گرمی ہے۔ میں تھک گئی ہوں' پلیز کمرے میں چلیں۔"

ماں بیٹی کمرے کی طرف جانے لگیں۔ میں نے مہمانوں سے معذرت چاہی پھر اپنے کمرے میں آیا۔ ثمینہ کہہ رہی تھی۔ "تمہاری دادی ساتھ والے کمرے میں ہیں۔ جا کر ان کو سلام کرو۔"

وہ ایئر کنڈیشنر کے سامنے بیٹھ گئی تھی۔ اس نے کہا۔ "اوہ ممی! ذرا مجھے دم لینے

دیں' دادی کہیں بھاگی نہیں جا رہی ہیں۔"

"پچھلی بار جو تمہیں دیکھا تو اچھی صحت مند تھیں۔ کیا آج کل بیمار رہتی ہو؟"

"ممی! میں جونی کو بہت مِس کر رہی ہوں۔"

"کون جونی؟"

"مائی فرینڈ۔ کیا بتاؤں کتنا ونڈر فل لڑکا ہے۔ میں اس کے ساتھ بہت اچھا وقت گزارتی ہوں۔ پتا ہی نہیں چلتا دن رات کیسے گزر جاتے ہیں۔"

میری اور ثمینہ کی نظریں ملیں۔ پھر ہم ایک دوسرے سے نظریں چرانے لگے۔ میں نے کہا۔ "ایمونا! یہ ساری زندگی کا معاملہ ہوتا ہے۔ اچھی طرح دیکھ سمجھ کر کسی کا انتخاب کرنا۔"

"میں نے اچھی طرح دیکھ لیا ہے' سمجھ لیا ہے۔ ابھی وہ سینئر کیمبرج کا امتحان دینے والا ہے۔ امتحان سے فارغ ہونے کے بعد ہم شادی کر لیں گے۔"

ثمینہ نے کہا۔ "لیکن ہمیں بھی تو دیکھنے سمجھنے کا موقع ملنا چاہیے۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی ایمونا نے ابکائی سی لی۔ ہم نے چونک کر دیکھا۔ وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر دوڑتی ہوئی باتھ روم میں چلی گئی۔ ثمینہ میری طرف تکتی رہ گئی۔ اس کے چہرے سے یوں لگ رہا تھا جیسے بدن کا سارا خون نچوڑ لیا گیا ہو۔ باتھ روم سے دو چار بار ابکائیاں لینے کی آواز آتی رہی۔ گہری گہری سانسیں بھی سنائی دیں۔ ایسے وقت مائیں اپنی بیٹیوں کی پیٹھ سہلاتی ہیں۔ ان کی دلجوئی کرتی ہیں۔ خوشی کا اظہار بھی کرتی ہیں۔ مگر ثمینہ کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں اور کسی دم چھلکنے کو ہی تھیں۔

واش بیسن میں پانی گرنے' کلی اور غرارا کرنے کی آوازیں آئیں۔ پھر ایمونا تولیے سے منہ پونچھتے ہوئے کمرے میں آئی۔ میں شرم سے باہر آ گیا لیکن دروازے کی آڑ میں رہا۔ یہ بڑی بے حیائی اور بدنامی کی بات تھی۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ ثمینہ اس معاملے کو کس طرح نمٹائے گی۔

وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ بیٹی کا بازو پکڑ کر ایک جھٹکا دیتے ہوئے بولی۔ "یہ کیا ہے؟"

وہ بولی۔ "اوہ ممی! یو آر ہرٹنگ می............"

وہ بازو چھوڑ کر بولی۔ "میں پوچھتی ہوں۔ یہ کیا بے حیائی ہے؟"

"وھاٹ بے حیائی؟ آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ یہ میرا بچہ ہے۔"

"کیسا بچہ؟ کیا شادی ہوئی ہے؟"

"نہیں ہوئی ہے۔ مگر ہو جائے گی۔ میرا جونی امتحان میں مصروف ہے۔ میں اسے ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتی۔ میں نے سوچا' وہاں رہوں گی تو وہ مجھ میں اور ہونے والے بچے میں دلچسپی لیتا رہے گا' پڑھنے میں دل نہیں لگائے گا۔ اس لئے میں یہاں آ گئی۔ اب یہاں سے بے بی کو گود میں لے کر جاؤں گی۔"

ثمینہ چکرا کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ ایمونا یوں فر فر کہتی جا رہی تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ تب مجھے امی کا خیال آیا۔ وہ بھی سن رہی ہوں گی۔ مجھے دوسری طرف کا دروازہ بند کر دینا چاہئے تھا۔ مجھ پر پہلے ہی الزام تھا کہ میں نے ہائی لیول کی زندگی گزارنے کے لئے اولاد کو انگلینڈ اور امریکا بھیج کر ان سے دین مذہب چھین لیا ہے اور انہیں انگریز بنا دیا ہے۔

میں پھر کمرے کے اندر آیا۔ ثمینہ اور ایمونا کے درمیان سے گزرتا ہوا دوسرے کمرے میں پہنچا۔ پھر دروازے کے ہینڈل کو پکڑے بند کرنا چاہتا تھا لیکن امی کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ وہ چارپائی پر اوندھی پڑی ہوئی تھیں۔ ان کا سر اور دونوں ہاتھ چارپائی سے نیچے جھول رہے تھے۔ میں آواز دیتا ہوا ان کی طرف لپکا۔ "امی! امی!"

میں نے قریب پہنچ کر انہیں اٹھایا پھر انہیں بستر پر لٹایا۔ ان کے دیدے پھیل گئے تھے۔ صاف پتہ چل رہا تھا کہ جان نکل گئی ہے۔ ثمینہ میری آواز سن کر دوڑتی ہوئی آئی۔ پہلے اس نے امی کا اچھی طرح معائنہ کیا۔ پھر ان کی موت کا یقین ہوتے ہی ان سے لپٹ کر رونے لگی۔

میں گم صم کھڑا رہا۔ آنکھوں سے دیکھ کر یقین نہیں آ رہا تھا۔ ایک بوڑھی عورت جو مشرقی تہذیب کی پروردہ تھی' وہ شرم سے مر گئی تھی۔ شرم سے مرنا تو ایک محاورہ ہے۔ کیا ایسے بھی انسان ہوتے ہیں' جو سچ مچ شرم سے مرجاتے ہیں؟

پھر میں کیوں نہیں مرا؟ میں کیوں زندہ ہوں؟ سیدھی سی بات ہے۔ شرم کسی کسی کو آتی ہے۔ سب کو نہیں آتی' مجھ کو نہیں آتی۔ اس طرح موت نہیں آتی۔ ہماری عمر بڑھ جاتی ہے۔

میں تو اس وقت بھی زندہ رہا جب ابو میرے جرائم کا علم ہوتے ہی صدمات سے

ٹوٹ کر مر گئے تھے۔ وہ موت بھی مجھے ایک بوڑھے کی حماقت لگی تھی۔ اس قدر نادم ہونے اور غیرت میں آ کر مرنے سے وہ دنیاوی شان و شوکت حاصل نہیں ہوتی جو مجھے ہو رہی تھی۔

ہمارے ہاں خوشی کی تقریب ماتم میں بدل گئی۔ میں امی کی تدفین کے انتظامات میں مصروف ہو گیا۔ وقتی طور پر ایمونا کو بھول گیا۔ مگر ثمینہ کے دل پر ناقابلِ برداشت بوجھ پڑا ہوا تھا۔ وہ ایمونا کو مہمانوں سے الگ دوسری منزل کے کمرے میں لے گئی۔ اس سے بولی۔ "کیا تمہیں ذرا بھی احساس ہے کہ تمہاری بے حیائی کے باعث دادی کی جان نکل گئی ہے؟"

وہ جھنجلا کر بولی۔ "یہ کیا مذاق ہے؟ یہ کیسا ملک اور کیسا معاشرہ ہے؟ اگر ایک لڑکی محبت سے اپنے محبوب کے بچے کی ماں بنے تو یہاں کے بوڑھوں کو شرم آتی ہے۔ کیوں آتی ہے؟ کیا یہ شرم کی بات ہے؟ ہماری سوسائٹی میں کوئی پوچھنے نہیں آتا کہ ہم کس کا بچہ پیدا کر رہے ہیں؟"

"یہ امریکا نہیں' پاکستان ہے۔ یہاں کوئی لڑکی خواب و خیال میں بھی شادی سے پہلے ماں نہیں بنتی۔ اس کا تصور ہی شرمناک ہے۔"

"آپ لوگ بہت ہی بیک ورڈ ہیں۔ جب آپ براڈ مائنڈڈ نہیں ہو سکتی تھیں تو مجھے اس ماحول میں کیوں بھیجا' وہاں کے کپڑے کیوں پہنائے' وہاں کا کھانا کیوں کھلایا' وہاں کی تعلیم کیوں دلائی' اب میں وہاں کی تہذیب میں رچ بس گئی ہوں تو آپ کو شرم کیوں آ رہی ہے؟"

ثمینہ نے شکست خوردہ انداز میں پوچھا۔ "کیا تم ہماری غلطی کی اتنی بڑی سزا دو گی؟"

"ممی! کیا میں آپ کی دشمن ہوں؟ میں نے آپ کو سزا دینے کے لئے جونی سے محبت نہیں کی ہے۔ یہ تو دل سے دل کا معاملہ ہے۔ میں نے وہاں کے دستور کے مطابق پوری آزادی اور خود مختاری سے محبت کی ہے۔ میرے اور جونی کے لئے اس محبت کا نتیجہ خوش آئند ہے۔ اگر آپ لوگوں کو تکلیف پہنچ رہی ہے تو میں اگلی کسی فلائٹ سے واپس چلی جاؤں گی۔"

"میری بچی! میں سمجھ رہی ہوں۔ تم ہماری شرم' غیرت' جذبات اور احساسات

کو نہیں سمجھ پاؤ گی۔ مگر بیٹی! میں بھی ماں بننے والی ہوں۔ ذرا سوچو' یہ کتنی شرم کی بات ہے کہ ماں بیٹی دونوں ہی بچے پیدا کریں گے۔"

"آپ بالکل الٹی باتیں کرتی ہیں۔ آپ اپنی خوشی سے ماں بننے والی ہیں۔ میں اپنی خوشی سے ماں بننے جارہی ہوں۔ اس میں شرم کی کیا بات ہے؟"

ثمینہ نے ہار مان کر کہا۔ "ایمونا! بہتر ہے۔ جتنی جلدی ہوسکے تم واپس چلی جاؤ۔"

میں امی کو سپرد خاک کرکے آیا تو ثمینہ نے یہ باتیں بتائیں پھر کہا۔ "میں کل صبح ہی لیڈی ڈاکٹر سے ملوں گی اور اس سے کہوں گی کہ ماں نہیں بننا چاہتی۔"

"کیا دماغ چل گیا ہے۔ چوتھے ماہ میں اسقاط ہوا تو مرجاؤ گی۔"

"مجھے اسی بہانے موت آجائے تو اچھا ہے۔ یہ بڑے شرم کی بات ہے کہ ہم اپنے بزرگوں کی طرح شرم والے نہیں ہیں۔ ہمیں بھی ان کی طرح مرجانا چاہئے۔"

"اچھا بس' جذباتی نہ بنو۔ ایمونا واپس جارہی ہے۔ اس بات کو صدمہ بنا کر دل سے نہ لگاؤ۔"

"کیا آپ کو ذرا بھی احساس نہیں ہے کہ ہم نے اپنی تہذیب کے منہ پر کس طرح امریکی جوتا مارا ہے؟"

میں اٹھ کر باہر آگیا۔ ثمینہ جوش اور جذبات' غم وغصے میں تھی۔ میرے سمجھانے سے اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ترقی کرنے' دولت کمانے اور عروج حاصل کرنے کے لئے جب بھی ہم جھوٹ بولتے ہیں اور بے ایمانی کرتے ہیں تو اس کے برے نتائج کو برداشت کرنے کا بھی حوصلہ رکھنا چاہئے۔ آج تک میں نے مٹھی بند رکھ کر بہت سی بے غیرتی اور برائیوں کو چھپالیا۔ کسی کو ہوا بھی نہ لگنے دی کہ میں درپردہ کیا ہوں؟ کل یا پرسوں کسی فلائٹ سے ایمونا چلی جائے گی تو کسی کو خبر نہیں ہوگی کہ وہ امریکا میں کنواری ماں بن رہی ہے۔ ہماری عزت کی مٹھی بند رہے گی۔ میں وہاں جاکر جونی سے مل کر سارے معاملات طے کردوں گا۔

اگر ہم اپنی اپنی داستانِ حیات کے چھپے ہوئے گوشوں میں جھانک کر دیکھیں تو یہی کچھ نظر آئے گا۔ ہم بڑی مشکل سے اپنی بے غیرتی کو تسلیم کرتے ہیں۔ پھر اسے کمال ذہانت سے چھپا بھی دیتے ہیں۔

میں نے بڑی تحمل مزاجی سے معاملات کو سنبھال لیا۔ مین ہٹن جاکر جونی سے ایمونا کی کورٹ میرج کرادی۔ جبکہ ایسا ہونا نہیں چاہئے۔ عورت حاملہ ہو تو شادی جائز نہیں ہوتی لیکن امریکا میں کون دیکھنے جاتا ہے۔ سارے معاملات نمٹ گئے تھے۔ یہاں ثمینہ اور وہاں ایمونا کی گود میں بچہ آگیا۔ جب تک ہمارے پاس بے انتہا دولت ہے' مضبوط ذرائع ہیں اور مکاری ہے' ہم تہذیب اور قانون کو توڑ مروڑ کر کبھی اس کی صورت بگاڑتے رہیں گے کبھی بناتے رہیں گے۔

کوئی ایک برس کے بعد بڑے صاحب نے مجھے بلایا کیونکہ الیکشن قریب تھے۔ میں ان کے ڈرائنگ روم میں حاضر ہوا۔ وہاں دوسرے سیاسی راہنما بھی تشریف رکھتے تھے۔ مجھے الیکشن میں اپنے ہی علاقے سے لڑنے کے لئے ٹکٹ ملتا تھا۔ پتا چلا میرے علاقے سے ہماری پارٹی کا ایک اور جوان کھڑا ہونا چاہتا ہے۔ صاحب نے مجھ سے کہا۔ "تم دوسرے کمرے میں جاکر اس جوان کو سمجھاؤ۔ میرا خیال ہے' وہ تمہاری بات مان لے گا۔"

ایک ملازم مجھے دوسرے کمرے میں لے گیا۔ وہاں ایک جوان صوفے پر بیٹھا تھا۔ سامنے سینٹر ٹیبل پر شراب کی بوتل اور بھرا ہوا جام رکھا تھا۔ اس نے ایک گھونٹ پی کر کہا۔ "آیئے مسٹر شریف! آپ مجھے سمجھانے آئے ہیں لیکن میں ضدی باپ کا ضدی بیٹا ہوں۔ جب باپ کی بات نہیں مانتا تو آپ کی کیا سنوں گا۔"

میں نے پوچھا۔ "کس ضدی باپ کے بیٹے ہو؟"

اس نے باپ کا نام بتایا تو میں چونک گیا۔ وہ ہمارے صاحب کا بیٹا تھا یعنی درخشاں کا بیٹا.......... یعنی میرا بیٹا تھا۔ میرا دل اسے دیکھ کر خوشی سے دھڑکنے لگا۔ کیا گبرو جوان تھا لیکن میں اس پر اپنا دعویٰ نہیں کرسکتا تھا۔ میرے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا۔ میں نے اسے دے کر عزت' دولت اور سیاسی عروج حاصل کیا تھا۔

اس نے ایک سانس میں جام خالی کیا۔ پھر خالی جام کو قالین پر پھینکتے ہوئے کہا "ڈیڈی نے کہا تھا' تم مجھے قائل کرو گے' میں تمہیں قائل کروں گا۔ جو دوسرے کو ناک آؤٹ کردے گا' وہ احمد نگر سے الیکشن لڑے گا۔"

"میں تمہیں قائل کردوں گا بیٹے؟"

"یو شٹ اپ! مجھے بیٹا نہ کہنا۔ میں راکٹ ایج کی پیداوار ہوں۔ راکٹ کی

تیزی سے کام کرتا ہوں۔ تم بہت دیر تک زبان سے قائل کرو گے' میں پلک جھپکتے ہی تمہیں ناک آؤٹ کردوں گا۔"

یہ کہتے ہی اس نے میرے منہ پر ایک زبردست گھونسا جڑ دیا میں چکرا کر گر پڑا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ وہ نشے میں لڑکھڑاتا ہوا دروازے پر گیا پھر بولا "ڈیڈی! تم نے ناک آؤٹ کرنے کو کہا تھا مگر زبان اور ہاتھ پر پابندی نہیں لگائی تھی۔ میں نے اس کی زبان چلنے سے پہلے ہی ہاتھ دکھا دیا۔"

میں فرش پر پڑا اس کے دائیں ہاتھ کو دیکھ رہا تھا۔ جب سے سامنا ہوا تھا' تب سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے دائیں کی مٹھی بندھی ہوئی تھی۔

بیٹے نے مارا' کوئی بات نہیں۔ عروج حاصل کرنے کے لئے توہین برداشت کرتا آیا ہوں۔ یہ کبھی نہیں کہوں گا کہ بیٹے نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا ہے۔ ان معاملات میں میری مٹھی بند رہتی ہے۔

لیکن یہ غور کرنے کی بات ہے کہ مٹھی کھل جائے تو بھرم کھل جاتا ہے جبکہ میرے بیٹے کی بند مٹھی بھرم کھول رہی تھی کہ وہ میرا کون ہے؟

لوگ اندھے ہیں' دیکھ کر بھی سمجھ نہیں پاتے۔

☆------☆------☆

فریب مشرک

وہ ایک دوسرے سے بے پناہ محبت کرتے تھے مگر اپنی اپنی جھوٹی آنا کے غلام تھے۔ وہ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے میں مصروف رہے اور محبت کا جذبہ ان کی آنا کے قدموں تلے سسکتا رہا۔

ابھی ابھی' بالکل ابھی ابھی ایک پَل گزر گیا اور یہی درسِ عبرت ہے کہ گزرے ہوئے ایک پَل کا حساب کرنے سے پہلے ہی دوسرا پَل گزر جاتا ہے۔ مگر حساب تو کرنا ہی پڑتا ہے آج نہیں تو کل' جوانی میں نہیں تو بڑھاپے میں سوچنا پڑتا ہے کہ اب تک کیا' کیا اور کیا نہ کیا؟ شاید وہ نہ کیا جو کرنا تھا اور وہ کرتے رہے جو نہیں کرنا تھا۔ بابو برکت علی نے کافی کا ایک گھونٹ حلق سے اتارتے وقت صرف اتنا سوچا کہ ایک ایک پَل کرکے ساٹھ برس گزر گئے ہیں تو وہ گھونٹ حلق میں اٹک گیا جیسے جوانی کے حلق میں بڑھاپے کا خوف اٹک جاتا ہے۔

یہ ایک ساعت کی بات تھی۔ دوسری ساعت میں زور کا ٹھسکا لگا۔ کافی کچھ منہ سے کچھ ناک سے نکلنے لگی۔ کھانسی کے ٹھسکے لگنے لگے۔ آنکھوں میں پانی آگیا۔ شاید اس پانی میں بھی کافی کی کچھ مقدار ہوگی۔ اس عمر میں کچھ کھاؤ پیو تو جگہ جگہ سے باہر آجاتا ہے۔

بابو برکت علی بڑھاپے کو کسی طرح بھی تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ اس نے سوچا۔ بڑھاپا بہت دور ہے۔ ابھی تو میں جوان ہوں یہ محض بڑھاپے کا خوف تھا جو حلق میں اٹک گیا تھا۔ جس کے نتیجے میں ٹھسکا لگا اور میں کھانس رہا ہوں۔ یہ کمبخت کھانسی کا تسلسل نہیں ٹوٹ رہا ہے۔ لوگ خواہ مخواہ سوچیں گے کہ یہ بڑھاپے کی کھانسی ہے۔

کھانسی کے جھٹکے ایسے تھے کہ پیالی میز پر رکھتے رکھتے کافی مقدار میں کافی چھلک کر گر پڑی۔ دیکھنے والے تو یہی سمجھیں گے کہ بڑھاپے سے ہاتھ کانپ رہا تھا۔ بعض اوقات دیکھنے والوں کی غلط فہمی سے آدمی بوڑھا کہلانے لگتا ہے۔ یہ بڑی غلط بات ہے کسی کی ہسٹری شیٹ معلوم کیے بغیر اس پر بڑھاپے کا لیبل نہیں لگانا چاہئے۔

دوسری میز پر بیٹھے ہوئے لوگ سر گھما کر اسے مسلسل کھانستے ہوئے دیکھ رہے

تھے۔ ایک نے کہا۔ "بے چارہ۔" بعض حالات میں ایک لفظ عمر کی تمام ٹریجڈی بیان کردیتا ہے۔

بابو برکت علی نے کھانستے کھانستے گھورتے ہوئے اس شخص کو دیکھا مگر کچھ کہہ نہ سکا۔ کھانسی بولنے کی مہلت نہیں دے رہی تھی دوسری میز پر بیٹھی ہوئی عورت نے اپنے مرد ساتھی سے کہا۔ "بڑے میاں کو پانی پلاؤ۔ کھانسی رک جائے گی۔"

اس کا ساتھی پانی سے بھرا ہوا گلاس لے کر بابو برکت علی کے پاس آیا اسے پیش کرتے ہوئے بولا۔ "بڑے صاحب! اسے پی لو۔"

بابو برکت علی نے اسے غصے سے دیکھا۔ پانی سے بھرے ہوئے گلاس کو اپنی پانچ انگلیوں کی گرفت میں لیا۔ اس عورت پر نظر ڈالی جس نے بڑے میاں کہا تھا۔ پھر جو کچھ ہوا اس پر سب حیران رہ گئے۔ ان پانچ انگلیوں کی گرفت میں شیشے کا مضبوط گلاس چھن کی آواز کے ساتھ ٹوٹ گیا۔ اس کے ٹکڑے میز پر بکھر گئے۔ پانی دور تک پھیل گیا چند لمحوں تک پورے کافی ہاؤس میں خاموشی چھائی رہی۔ اس ڈرامائی صورتِ حال کے باعث کھانسی بڑی حد تک ختم ہوگئی۔ اس نے جیب سے پانچ سو روپے کا ایک نوٹ نکالا پھر اس عورت کو دکھاتے ہوئے کہا۔ "تیرا آدمی اگر انگلیوں کے شکنجے میں گلاس توڑ دے گا تو میں پانچ سو روپے انعام دوں گا۔ ورنہ بڑے میاں مجھے نہیں اسے کہنا۔"

عورت گھبرا کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔ مرد جھینپ کر اپنی عورت کے پاس چلا گیا۔ پورے کافی ہاؤس میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ سبھی دبی زبان سے کچھ نہ کچھ کہہ رہے تھے۔ کوئی کہہ رہا تھا۔ "بڈھا ہے۔"

کوئی جواباً کہہ رہا تھا۔ "نہیں یار' جوانوں کا جوان ہے۔"

ایک باڈی بلڈر نے کاؤنٹر پر آکر کافی ہاؤس کے مالک سے کہا۔ "اس نے گلاس توڑا ہے' میں اس کا سر توڑ سکتا ہوں مگر ایک بوڑھے پر کیا ہاتھ اٹھاؤں۔ تمہیں اس کے خلاف ایکشن لینا چاہئے' یہاں شرفاء اپنی گھروالیوں کے ساتھ آتے ہیں۔"

کافی ہاؤس کے مالک نے کہا۔ "وہ بھی شریف آدمی ہے۔ اسے غصہ دلایا گیا پھر بھی اس نے دنگا فساد نہیں کیا صرف ایک گلاس توڑا۔ یہ تمہارے لئے بہتر ہوگا کہ اس کا سر توڑنے نہ جاؤ۔ یہ اپنے وقت کا فری سٹائل پہلوان بابو برکت علی ہے۔"

باڈی بلڈر نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھا' پھر پوچھا۔ "کیا یہ بڈھا نہیں

ہے؟"

"میں نے آج تک بوڑھا پہلوان نہیں دیکھا۔ شاید پہلوان بوڑھے نہیں ہوتے یا بوڑھے ہوتے ہیں تو پہلوان نہیں رہتے۔"

"تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ یہ بوڑھا نہیں ہے۔ جب کہ سر کے بال اور مونچھیں سفید ہوگئی ہیں۔"

"میں بتیس برس کا ہوں اور میرے بال آدھے سے زیادہ سفید ہیں۔ ایسا نزلے کے باعث ہوتا ہے۔ سفید بال بڑھاپے کی دلیل نہیں ہیں۔"

"کیابات ہے' تم اس کی بڑی حمایت کررہے ہو؟"

"کوئی تمہارے خلاف کچھ بولے گا تو میں تمہاری حمایت میں بھی بولوں گا۔ یہ دکانداری کا اصول ہے۔ مجھے یہاں آنے والا ہر گاہک عزیز ہے۔"

باڈی بلڈر بل ادا کرکے خاموشی سے بابو برکت علی کو دیکھتا ہوا چلاگیا' اس کی میز پر سے شیشے کے ٹکڑے اٹھالئے گئے تھے' نیا میزپوش بچھادیا گیا تھا۔ ایسے ہی وقت ایک حسین عورت آئی' وہ کوئی دوشیزہ نہیں تھی۔ بھرے بھرے بدن کی عورت تھی۔ اس کی صحت مندی کے پیش نظر عمر کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ کتنے ہی لوگ اسے رہ رہ کر دیکھ رہے تھے۔ کافی کا گھونٹ پیتے تھے یا دوستوں سے باتیں کرتے تھے۔ پھر اُدھر دیکھ لیتے تھے۔ وہ بابو برکت علی کے سامنے والی میز پر آکر بیٹھ گئی تھی۔

ویٹر نے اس کی میز پر پانی کے دو گلاس رکھے پھر کافی کا آرڈر لے کر چلاگیا۔ اس کے جانے کے بعد خاتون نے اپنے بیگ میں سے بے بی آئینہ نکالا پھر اپنے چہرے کا جائزہ لیا۔ اپنی پلکوں کو دیکھتے ہی دل دھک سے رہ گیا۔ اس نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا کوئی دیکھ تو نہیں رہا ہے؟ پھر اس نے ننھا سا رومال نکال کر دائیں آنکھ پر رکھ لیا۔ بھید کھلنے والا تھا۔ اس آنکھ کی مصنوعی گھنی پلکیں اچھی طرح چپکی ہوئی نہیں تھیں۔ ایک طرف سے ذرا اکھڑنے والی تھیں۔ اگر وہ پلکیں گر پڑتیں تو عمر کا بھانڈا پھوٹ جاتا۔

وہ آنکھ پر رومال رکھے وہاں سے اٹھ گئی۔ تیزی سے چلتی ہوئی کاؤنٹر کے پاس سے گزرتی ہوئی جانے لگی۔ کافی ہاؤس کے مالک نے پوچھا۔ "بیگم صاحبہ! خیریت تو ہے؟ میں کیا خدمت کرسکتا ہوں؟"

وہ کوئی جواب دیئے بغیر لیڈیز ٹوائلٹ کے اندر گئی' اور دروازے کو اندر سے

بند کیا' آنکھ پر سے رومال کو ہٹایا پھر بیگ میں سے آئینہ اور گم پیسٹ نکال کر اکھڑنے والی پلکوں کو اچھی طرح چپکانے لگی۔

پچھلے تین ماہ سے اس نے تاش کھیلنا چھوڑ دیا تھا۔ ورنہ اسے تاش کھیلنے کی بیماری تھی۔ ہر رات وی آئی ایل کلب میں تاش کے پتوں سے سینکڑوں روپے سمیٹ لیتی تھی یا ہزاروں روپے ہار جاتی تھی۔ پیسہ ہاتھوں کا میل تھا' کبھی ہارنے کا غم نہیں ہوتا تھا البتہ ایک غم نے تاش کے پتے چھڑا دیئے۔ ایک رات کلب میں تاش کی گڈی کو پکڑتے ہی خیال آیا کہ اس میں باون پتے ہوتے ہیں اور اس رات وہ باون برس کی ہوچکی ہے۔

گڈی اس کے ہاتھوں سے چھوٹ گئی تھی۔ وہ وی آئی ایل کلب' ملک کی ویری امپورٹنٹ لیڈیز کا کلب تھا۔ اس کے سامنے ایک وزیرِ صحت کی بیگم کھیلنے بیٹھی ہوئی تھیں' بیگم وزیر نے پوچھا۔ "کیابات ہے؟"

وہ چونک کر بولی۔ "آں کچھ نہیں۔ کوئی بات نہیں ہے۔"

"پھر گڈی کیوں چھوڑدی؟"

"بس یونہی' کھیلنے کو جی نہیں چاہتا ہے۔"

ایک انکم ٹیکس افسر کی بیگم نے کہا۔ "ڈونٹ بی سلی۔ آج جم کی بازی ہوگی موڈ آف نہ کرو۔"

وہ بیگمات کے اصرار پر تاش پھینٹنے لگی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اپنی زندگی کے باون برس پھینٹ رہی ہو۔ پتے اس کے ہاتھوں میں آرہے تھے اور گزرے ہوئے برسوں کی طرح پھسل کر نکل رہے تھے۔ اس رات وہ پچیس ہزار روپے ہار کر کلب سے باہر آئی۔ پھر تین ماہ گزر گئے' وہ تاش کھیلنے کلب میں نہیں گئی۔ وہ باون پتے اس کے دل میں کانٹوں کی طرح چبھنے لگے تھے۔

اس نے بے بی آئینے میں گھنی پلکوں کو دیکھا۔ اب ان کے اکھڑنے کا اندیشہ نہیں تھا۔ ایسے اندیشوں کو دور کرنے کے لئے وہ پرس کی جگہ ایک خوبصورت سا بیگ رکھنے لگی تھی۔ جس میں چہرے کو بنائے رکھنے کے تمام جنتر منتر موجود رہتے تھے۔ وہ ٹوائلٹ سے باہر آگئی۔ کاؤنٹر کے پاس آکر کافی ہاؤس کے مالک سے بولی۔ "دراصل میری دائیں آنکھ میں اچانک تکلیف شروع ہوجاتی ہے۔ میں آنکھ میں آئی ڈراپ

ڈالنے گئی تھی۔"

"بیگم صاحبہ! میرے لائق کوئی خدمت؟"

"شکریہ' اچھی سی کافی پلوا دیں۔"

وہ اپنی میز پر واپس آکر بیٹھ گئی۔ بیٹھتے وقت بابو برکت علی سے نظریں ٹکرائیں پھر دونوں نے یوں نظریں چرائیں جیسے کوئی گناہ سرزد ہو گیا ہو۔ بیگم نے چڑ کر دل ہی دل میں کہا۔ "اونہہ! بڑا پارسا بنتا ہے۔ میں تو عورت ہوں' نظریں چرانا میری ادا ہے۔ اسے کس بات کا مان ہے؟"

بابو برکت علی نے دل میں کہا۔ "اسے کیا دیکھوں؟ یہ دیکھی دکھائی عورت ہے۔ دیکھنے کی چیز وہ ہوتی ہے جسے کسی نے دیکھا نہ ہو اور ہم دیکھ لیں۔"

بیگم کی سوچ نے کہا۔ "دیکھو گے بچو! اس عمر میں اور کوئی گھاس نہیں ڈالے گا۔ اور میں تو تمہیں پلٹ کر نہ دیکھوں مگر آنکھیں ہیں' ساری دنیا کو دیکھتی ہیں اور دنیا میں تم بھی ہو لہٰذا تم پر بھی نظر پڑ جاتی ہے۔"

اس نے ایسا سوچتے ہوئے اسے دیکھا۔ اتفاق سے وہ بھی دیکھ رہا تھا۔ نظریں ملتے ہی ذرا سر اٹھا کر بیگم کے پیچھے یوں دیکھنے لگا جیسے دروازے سے داخل ہونے والے کسی شخص کو دیکھ رہا ہو۔ یہ ایسی حرکت تھی کہ وہ بھی بے اختیار سر گھما کر پیچھے دیکھنے لگی۔ پھر غلطی کا احساس ہوا۔ وہ ایک مرد کی نگاہوں کے حوالے سے اُدھر دیکھ رہی ہے اور اُدھر کوئی نہیں تھا۔ وہ اُلو بن گئی تھی۔ اس نے غصے سے بابو برکت علی کو دیکھا۔ اس کی مکاری صاف ظاہر تھی۔ اب وہ نہیں دیکھ رہا تھا۔ سر جھکائے کافی کی چسکی لے رہا تھا۔

اس نے ناگواری سے سوچا۔ "میں خواہ مخواہ اس بڈھے کھوسٹ کے متعلق سوچ رہی ہوں یہاں نہ آتی تو اچھا ہوتا۔ مگر شہزاد کو یہاں بلا چکی ہوں۔ وہ آتا ہی ہوگا۔"

ویٹر نے اس کے سامنے کافی کی ٹرے لاکر رکھی۔ پھر پوچھا۔ "میں کافی بناؤں؟"

"نو تھینک یو' میں بنالوں گی۔"

وہ کافی تیار کرنے لگی۔ اس طرح خود کو مصروف رکھنے کا بہانہ مل گیا۔ پچھلے چار دنوں سے یہی چکر چل رہا تھا۔ دونوں کے درمیان خاموش جنگ جاری تھی۔ وہ ایک

دوسرے سے دوستی کرنے میں پہل نہیں کرنا چاہتے تھے۔ بابو برکت علی کا یہ مزاج نہیں تھا۔ اس نے جوانی میں بھی کسی کو گرل فرینڈ بنانے میں کبھی پہل نہیں کی تھی۔ اسے اپنی مردانہ وجاہت اور کسرتی جسم پر بڑا اعتماد تھا۔ حسین لڑکیاں خود ہی اس کی طرف کھنچی آتی تھیں۔ آج بھی یہی خوش فہمی تھی کیونکہ بابو برکت علی وہی جوانی والا بابو برکت علی تھا۔ اس کا وہی چہرہ تھا' وہی کسرتی جسم تھا بس ذرا سا ڈھیلا پڑ گیا تھا۔ مگر وہ ڈھیلا پن لباس میں چھپا رہتا تھا۔ اگر کسی بہانے نقاب پہننے کا چانس ہوتا تو چہرے کی ہلکی جھریاں چھپ جاتیں۔ وہ خود کو سمجھاتا تھا' بالوں کی سفیدی اور چہرے کی جھریاں پختہ عمر کی دلیل ہیں' بڑھاپے کا نوحہ نہیں ہیں۔

بہرحال اسے یقین تھا کہ سامنے والی پہل کرے گی۔ اگر نہیں کرے گی تو ایسی بھاری بھرکم عورت ضروری نہیں تھی جو دیکھنے میں ہی بیگم صاحبہ لگتی ہو۔ محبوبہ دھان پان سی ہو۔ بوڑھے ہاتھ میں چھڑی اچھی لگتی ہے' ڈنڈا نہیں۔

کافی ہاؤس کے دروازے پر ایک نوجوان دوڑتا ہوا آیا۔ وہ خاصا صحت مند تھا۔ بلیو جینز اور جیکٹ میں ایکشن فلموں کا ہیرو لگ رہا تھا' وہ کہیں دور سے دوڑتا ہوا آیا تھا۔ دروازے پر ایسے رکا تھا جیسے بڑی مشکل سے خود کو بریک لگایا ہو۔ اس نے دور تک نظریں دوڑائیں۔ پھر بیگم کو دیکھتے ہی تیزی سے چلتا ہوا اس کے پاس آیا میز کے پاس کھڑا ہو کر بولا۔ "ویری ویری سوری مجھے دیر ہو گئی۔ یہ بس والے اپنی مرضی کے مالک ہوتے ہیں۔ جہاں بس روک دیتے ہیں وہاں سے آگے نہیں بڑھتے۔"

بیگم نے دھیمی آواز میں غصہ دکھایا۔ "یو شٹ اپ! کیا لوگوں کو سنانا چاہتے ہو کہ تمہارے جیسا بس میں سفر کرنے والا میرے برابر بیٹھنے آیا ہے۔ چپ چاپ بیٹھو' سانسیں درست کرو اور دھیمی آواز میں گفتگو کرو۔"

وہ میز کے دوسری طرف اس کے روبرو بیٹھ گیا۔ بیگم نے چور نظروں سے بابو برکت علی کو دیکھا۔ وہ یقین سے کہہ سکتی تھی کہ وہ سٹھیانے والا اس کے ساتھ ایک جوان بوائے فرینڈ کو دیکھ کر جل بھن گیا ہوگا۔ وہ آہستگی سے بولی۔ "اگر کوئی سن لیتا تو میری کتنی انسلٹ ہوتی۔"

وہ بولا۔ "میں شرمندہ ہوں مگر کیا کروں۔ میرے پاس بڑی مشکل سے بس کا کرایہ ہوتا ہے۔ میں آپ کو اپنے حالات بتا چکا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ میں تمہارے لئے کچھ کروں گی۔ بلکہ بہت کچھ کروں گی۔"

"شکریہ آپ نہ ملتیں تو پتا نہیں میرا کیا بنتا۔ میں آپ کا احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔"

"یہ آپ آپ کی رٹ کیوں لگاتے ہو۔ کیا میں عمر میں تم سے بڑی ہوں؟"

"جی، وہ آپ کی عمر تو نہیں جانتا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بڑا بنایا ہے۔ میرا مطلب ہے آپ بڑی دولت مند ہیں اس لئے میں بڑی سمجھتا ہوں۔"

"نان سنس۔ بڑی سمجھو گے تو میں بڑی لگوں گی۔ مجھے دوست سمجھو۔"

"دوست؟ میں اور آپ کو دوست سمجھوں! یہ یہ میری خوش قسمتی ہے۔ آپ مجھے اس قابل سمجھتی ہیں۔"

"آپ نہیں تم۔"

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "تم؟ اچھا ٹھیک ہے، تم کہوں گا آپ کتنی اچھی ہیں۔ مجھے آپ سے تم پر اتار رہی ہیں۔ مگر یہ غریب آپ کو تم کہے گا تو لوگ کیا سوچیں گے؟"

"تم غریب نہیں رہو گے میں تمہاری حیثیت بدل دوں گی۔ تم میرے برابر کے لگو گے۔"

"اوہ! مجھے یقین نہیں آرہا ہے۔"

"کیا میں جھوٹ بول رہی ہوں؟"

"نن۔ نہیں، میرا مطلب ہے، میں نے بہت غریبی دیکھی ہے۔ ایم اے کرنے کے بعد غیر یقینی حالات سے گزرتا رہا ہوں۔ اکثر خوابوں اور خیالوں میں دیکھتا رہا ہوں کہ راستہ چلتے مجھے روپیوں یا ڈالروں سے بھرا ہوا بریف کیس مل گیا ہے یا لاکھوں روپے کی لاٹری نکل آئی ہے۔ سٹے میں وارے نیارے ہوگئے یا پھر ایک بہت ہی دولت مند لڑکی مجھ پر عاشق ہوگئی ہے.........."

ابھی اس کی بات پوری نہیں ہوئی تھی کہ بیگم نے جلدی سے پوچھا۔ "میرے متعلق کیا خیال ہے؟"

"آں۔" اس نے بیگم کو دیکھا پھر کہا۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا، آپ کے متعلق کیا خیال قائم کروں۔ اول تو مجھے یقین نہیں آرہا ہے کہ آپ مجھ پر مہربان ہوگئ

ہیں۔ یہ مجھے خواب یا خیال جیسا لگ رہا ہے۔ پھر میں نے خود کو سمجھایا کہ آپ کے پیچھے کوئی ٹریجڈی چھپی ہوئی ہے۔"

"کیسی ٹریجڈی؟"

"یہی کہ شاید آپ کا چھوٹا بھائی یا جوان بیٹا آپ سے بچھڑ گیا ہے۔ آپ اس کی کمی پوری کرنے کے لئے.........."

وہ دانت پیس کر دھیرے سے بولی۔ "گدھے کے بچے! میں تمہیں کسی جوان بیٹے کی ماں لگتی ہوں۔ یو ایڈیٹ۔ نان سنس! تمہارے جیسا چھوٹے دماغ کا، چھوٹی اوقات کا اور چھوٹے نصیب کا آدمی ہمیشہ ایسی ہی چھوٹی بات سوچتا ہے اور خوابوں کی دولت مند لڑکی کی تعبیر بن کر آتی ہے تو اسے سمجھ نہیں پاتا۔ جاؤ دفع ہو جاؤ۔ گیٹ لاسٹ۔"

وہ بوکھلا گیا۔ بات دیر سے سمجھ میں آئی مگر سمجھ میں آگئی تھی کہ اس کے سامنے دولت مند بیگم صاحبہ نہیں، ایک نوخیز حسینہ ہے اور حسینہ اس تقدیر کو کہتے ہیں جو دور تک مستقبل کو حسین بنا دیتی ہے۔ اس نے میز پر جھک کر آہستگی سے کہا۔ "مجھے معاف کردو۔ سر جھکا کر میز کے نیچے دیکھو، میں دونوں ہاتھ جوڑ رہا ہوں۔ میں تمہیں کسی جوان بیٹے کی ماں نہیں کہہ رہا تھا، تم تو کسی پہلو سے شادی شدہ بھی نہیں لگتیں، پھر ماں کیسے بن سکتی ہو، وہ بھی جوان بچے کی۔ لعنت ہے ایسا سوچنے والے پر ہزار بار لعنت ہے۔ دیکھو، میں تمہیں تم کہہ رہا ہوں۔"

وہ سنجیدگی سے بولی۔ "ٹھیک ہے، میز کے نیچے سے ہاتھ نکالو۔"

"نہیں نکالوں گا۔ پہلے غصہ تھوکو اور مسکراؤ۔"

"میرا مسکرانے کا موڈ نہیں ہے۔"

"ایک عاشق کا سوال ہے۔ محبت کے نام پر مسکرادو۔"

وہ ہنسنے لگی اس نے ایک ہاتھ نیچے سے لاکر میز پر رکھ لیا۔ وہ بولی۔ "دوسرا ہاتھ بھی نکالو۔"

اتنے میں ویٹر آگیا بیگم نے کہا۔ "شہزاد کے لئے سینڈوچز اور کافی لے آؤ۔"

ویٹر چلا گیا۔ وہ بولی۔ "تم نے ابھی تک ہاتھ نہیں نکالا۔"

"نہیں، پہلے تم اپنا ہاتھ میز کے نیچے لاؤ اور دوستی کا ہاتھ ملاؤ۔"

وہ مسکرا کر بولی۔ "یہ رومانٹک آئیڈیا ہے۔ مگر لوگ کیا کہیں گے۔"

"میز کے نیچے شاید ہی کوئی دیکھے ' اگر دیکھے گا تو جل جائے گا۔ میری قسمت پر رشک کرے گا۔"

بیگم نے دائیں بائیں دیکھا کوئی متوجہ نہیں تھا۔ شہزاد کے پیچھے دوسری میز پر بابو برکت علی جھکی جھکی نظروں سے یعنی چور نظروں سے دیکھ رہا تھا وہ خوش ہو گئی۔ اسے دکھانے کے لئے اپنا دایاں ہاتھ واضح طور پر اٹھا کر میز کے نیچے لائی۔ شہزاد نے اسے پکڑ لیا۔

اس نے پکڑنے کو تو پکڑ لیا مگر چشم زدن میں چار برس پیچھے چلا گیا۔ اس روز وہ صبح سے فاقے کر رہا تھا۔ شام کو گھر جاتے وقت اسے معلوم تھا کہ چھوٹی بہن بھی ماں باپ کے ساتھ بھوکی ہوگی۔ جیب میں صرف تین روپے تھے۔ اس نے گھر والوں کے لئے دو روپے کی ڈبل روٹی لی۔ بڑی ڈبل روٹی ڈھائی روپے کی تھی چونکہ باسی تھی اس لئے دو روپے میں مل گئی تھی۔ اس نے بھوک کے وقت ڈبل روٹی کو پکڑا تو وہ دنیا میں سب سے مہربان اور سب سے زیادہ پُرکشش لگی۔ آج بیگم کا ہاتھ بھی سب سے مہربان اور سب سے زیادہ پُرکشش لگ رہا تھا۔ بالکل ڈبل روٹی کی طرح باسی مگر پھولا پھولا اور کچھ نرم نرم۔ ڈبل روٹی گرم نہیں بلکہ ' ٹھنڈی کھائی جاتی ہے وہ ہاتھ بھی ٹھنڈا تھا۔ برسوں پرانے فریزر سے نکل کر آیا تھا۔

وہ شرماتے ہوئے بولی۔ "اب چھوڑو بھی۔"

اس نے چونک کر چھوڑ دیا پھر کہا۔ "تمہارا ہاتھ بہت خوبصورت ہے۔ میں اسے تھام کر بہت دور نکل گیا تھا۔"

وہ مسکراتے ہوئے سوچنے لگی۔ "ہائے! ایسے رومانی فقرے سننے کے لئے میں برسوں سے بے چین تھی۔ میرے پاس شہرت ہے دولت ہے' مرتبہ ہے مگر شاعری کی وہ کتاب نہیں ہے جو جوانی میں کھو گئی تھی۔"

شہزاد نے پوچھا۔ "کیا سوچ رہی ہو؟"

"تم نے اپنی باتوں سے مجھے بھی دور کہیں گم کر دیا تھا۔ یہ بتاؤ تم کیسا مستقبل چاہتے ہو؟"

"پہلے بہت چھوٹی باتیں سوچتا تھا۔ مثلاً کوئی ملازمت مل جائے یا ٹیکسی ڈرائیور

بن جاؤں.......... محلے میں پان سگریٹ کی دکان کھول لوں مگر اب ایسا مستقبل چاہتا ہوں جو تمہارے شایانِ شان ہو۔"

وہ بولی۔ "ملازمت بری نہیں ہے۔ اگر وہ انکم ٹیکس یا کسٹم کے شعبے میں ہو۔ ٹیکسی ڈرائیور بننا گری ہوئی بات ہے' ٹیکسی کا مالک بننا اور ترقی کرتے ہوئے کئی ٹیکسیوں کا گیراج کھولنا کامیابی اور فخر کی بات ہے۔ میں کچھ عرصہ تمہاری محبت اور وفاداری کو آزماؤں گی پھر تمہیں ٹیکسی خریدنے کے لئے رقم دوں گی۔"

"تمہاری آزمائش تک میں اپنے گھر والوں کے ساتھ بھوکا مرجاؤں گا۔"

وہ تھوڑی دیر تک اسے دیکھتی رہی اور سوچتی رہی وہ جوان خوبرو تھا' پکا مرد لگتا تھا۔ بے حد ضرورت مند تھا ضرورت اسے اور مجبور کرتی تو وہ عورت کا چکر چھوڑ کر کوئی دوسرا راستہ اختیار کر سکتا تھا اور وہ اسے ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتی تھی۔

اس نے ویٹر کو بلا کر ایک نوٹ دیا پھر کیپ دی چینج' کہہ کر اٹھ گئی۔ شہزاد بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا بیگم نے آنکھ کے اشارے سے ساتھ چلنے کو کہا۔ وہ پیچھے چلتا ہوا کافی ہاؤس کے باہر آیا۔ بیگم نے اپنی کار کے پاس آ کر کہا۔ "تمہارا چھوٹا پن نہیں جائے گا۔ تم میرے پیچھے کیوں چل رہے تھے؟ مرد آگے چلتا ہے یا بوائے فرینڈ کی طرح شانہ بشانہ رہتا ہے۔"

وہ شرمندگی سے بولا۔ "آج پہلا دن ہے۔ کل سے غلطی نہیں ہوگی۔"

"مرد اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھنے سے پہلے عورت کے لئے دروازہ کھولتا ہے۔"

شہزاد نے جلدی سے آگے بڑھ کر کار کا دروازہ کھولا۔ وہ ہنستے ہوئے بولی۔ "تم نے اسٹیئرنگ سیٹ کا دروازہ کھولا ہے۔ کوئی بات نہیں میں خود ہی ڈرائیو کروں گی۔ آؤ کار میں بیٹھو۔"

وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ شہزاد کار کے دوسری طرف سے گھوم کر اگلی سیٹ پر آ گیا۔ بیگم نے بیگ سے پانچ پانچ سو کے دس نوٹ نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا۔ "اپنے لئے نئے کپڑے خرید لو۔ سوٹ وغیرہ سلواؤ پرسوں حلیہ بدل کر میری کوٹھی میں آؤ۔ یاد رکھو پیدل نہ آنا۔ ٹیکسی میں آنا۔ وہاں میرا کوئی شناسا موجود ہو تو باتوں میں ظاہر کرنا تمہاری کار گیراج میں مرمت کے لئے گئی ہے اس لئے ٹیکسی میں آئے ہو اور میں جو ایٹی ون کی ٹویوٹا بیچنے والی ہوں' اسے تم خریدنا چاہتے ہو۔"

"میرے باپ نے کبھی ایک موٹر سائیکل نہیں خریدی' میں ٹویوٹا کیا خریدوں گا۔ مگر تمہاری باتیں سمجھ رہا ہوں۔ تمہارے مرتبے کا خیال رکھتے ہوئے ہنس کی چال چلوں گا۔"

"اوکے' اب جاؤ۔ پرسوں شام کو اسی وقت کوٹھی میں ملاقات ہوگی۔"

وہ کار سے باہر آگیا۔ پھر جلدی سے اندر آکر اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولا۔
"میں بھرپور محبت کے ساتھ رخصت ہونا چاہتا ہوں۔ مگر ہم سڑک کے کنارے ہیں کار کے اندر صرف ہاتھ کو چومنے کی گنجائش ہے۔"

وہ جھک کر چومنا چاہتا تھا۔ بیگم نے جلدی سے ہاتھ کھینچ کر کہا۔ "میں نے تمہیں آگے بڑھایا ہے مگر تمہارے ساتھ اوندھے منہ گرنا نہیں چاہتی میں کوئی سستی لڑکی نہیں ہوں۔ اب جاؤ۔"

وہ باہر چلا گیا اس نے کار اسٹارٹ کی پھر دھیمی رفتار میں ڈرائیو کرتی ہوئی جانے لگی۔ وہ بہت خوش تھی۔ اس نے ایک جوان عاشق کے سامنے خود کو لڑکی کہا تھا۔ شاید اس لئے کہ وہ بچپن سے خود کو لڑکی ہی کہتی آئی تھی یعنی سال ہا سال سے لڑکی کہتے رہنے کی عادت سی پڑ گئی تھی۔ رفتہ رفتہ معلوم ہوا سبھی ایسا کہتی ہیں۔ کلب میں آنے والی بیگمات اگرچہ اپنے لئے "لڑکی" کا لفظ استعمال نہیں کرتی تھیں۔ تاہم باتوں ہی باتوں میں اپنی عمر گھٹا دیتی تھیں۔ کہا کرتی تھیں' بہت چھوٹی عمر میں شادی ہوگئی اس لئے بچے جلدی جوان ہوگئے۔ ورنہ شادی کی عمر تو اب ہوئی ہے۔

وہ اپنی عالیشان کوٹھی کے سامنے آئی۔ دربان نے بڑے سے گیٹ کو کھولا۔ وہ کار ڈرائیو کرتی ہوئی پورچ میں آگئی۔ ایک ملازم نے آکر ادب سے اسٹیئرنگ سیٹ کا دروازہ کھولا وہ باہر آئی۔ وہاں سے آہستہ آہستہ چلتی ہوئی گارڈن لاؤنج میں پہنچی۔ چاروں طرف رنگا رنگ گلاب کھلے ہوئے تھے ان گلابوں کو دیکھنے سے ماضی کے بہت سے زخم کھل جاتے تھے۔ وہ منہ پھیر کر دروازے کی طرف آئی ایک اور ملازم نے دروازہ کھولا۔ وہ اندر آئی۔ اندھیرا ہو چلا تھا چھت پر فانوس روشن تھے۔ کوٹھی کے اندر کسی ملازم کو آنے کی اجازت نہیں تھی۔ ایک پرانی خادمہ دن رات خدمت کے لئے موجود رہتی تھی۔ اسے معلوم تھا بیگم صاحبہ کس وقت کیا چاہتی ہیں۔ اس نے شب خوابی کا لباس الماری سے نکال کر باتھ روم میں رکھ دیا تھا۔ نہانے کے ٹب میں صابن کا

جھاگ بھرا ہوا تھا۔ ٹب کے ساتھ ہی ایک چھوٹے سے ریک پر وہسکی کی بوتل اور شیشے کا جام تھا۔

بیگم نے آئینے کے سامنے آکر اپنے عکس کو دیکھا۔ سب سے پہلے اپنی آنکھوں سے مصنوعی پلکیں اتاریں پھر سر سے سیاہ بالوں کی وگ الگ کی سر کے اصلی بال جگہ جگہ سے چاندی کی طرح چمک رہے تھے۔ صرف یہ دو چیزیں الگ ہونے سے اس کی صورت بدل گئی تھی۔ اس صورت میں کوئی بھی جوان اسے ماں کہہ سکتا تھا۔ محبوبہ ہرگز نہ کہتا۔

اس کی آنکھوں میں آنسو آتے آتے رہ گئے۔ اس نے فوراً ہی لباس اتارا پھر ٹب کے اندر صابن کے جھاگ میں جا کر بیٹھ گئی۔ بوتل کھول کر شیشے کے بلوریں جام میں ڈبل پیگ لیا پھر ایک گھونٹ حلق سے اتار لیا ایسے وقت اسے سہارے کی ضرورت ہوتی تھی۔ گھر میں اور گھر سے باہر کوئی سہارا نہیں تھا۔ لہٰذا وہ سب کچھ بھلا دینے کے لئے مدہوشی کے راستے پر چل پڑتی تھی۔

وہ آہستہ آہستہ چسکیاں لیتی رہی اور ٹشو پیپر سے اپنے آنسو پونچھتی رہی۔ دوسرا ڈبل پیگ ختم کرنے تک غسل سے فارغ ہوگئی۔ شب خوابی کا لباس پہن کر خواب گاہ میں آئی اور ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ خادمہ نے ڈرائیر سے اس کے بال خشک کئے۔ وہاں بھی وہ سوچتی رہی اور پیتی رہی پھر خادمہ میز پر کھانا لگانے چلی گئی۔

بیگم نے پاس رکھے ہوئے فون کا ریسیور اٹھایا نمبر ڈائل کئے دوسری طرف رابطہ قائم ہوتے ہی آواز آئی۔ "ریکارڈر آن ہے۔ تمہاری باتیں ریکارڈ ہو رہی ہیں۔"

وہ ایک سرد آہ بھر کر بولی۔ "میں کیا بولوں۔ جی چاہتا ہے' تمہیں جان کہہ کر مخاطب کروں۔ مگر ایسا کس رشتے سے کہہ سکتی ہوں؟ ہمارا کیا تعلق ہے۔ یہ بھی کیسی بے تعلقی ہے ہم انسانوں کی دنیا میں دشمن سے بھی دشمنی کا ایک رشتہ ہوتا ہے۔ تم نے میری ذات سے کوئی رشتہ رہنے نہیں دیا جی چاہتا ہے' تمہارا منہ توڑ دوں۔ مگر تم پہلوان ہو' مرد ہو' تمہارا منہ نہیں ٹوٹے گا میرے ہاتھ ٹوٹ جائیں گے۔"

وہ ریسیور کو ایک کان سے ہٹا کر دوسرے کان سے لگاتے ہوئے بولی۔ "بابو برکت علی! تم نے اس جوان کو دیکھا ہے۔ اس کا نام شہزاد ہے۔ کیسا خوبرو اور بھرپور

جوان ہے۔ میں کسی بوڑھے سے دوستی کر سکتی تھی مگر تم نے ایک بار نہیں' ہزار بار طعنے دیئے کہ میں بوڑھی ہو گئی ہوں۔ کوئی جوان میری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا۔ آج تم نے اسے دیکھ لیا' آئندہ بھی اسے میرے ساتھ دیکھو گے۔

"اب بھی وقت ہے' اپنے زہریلے الفاظ واپس لو مجھے سوری کہو' تم اچھی طرح جانتے ہو' میں دولت کی چھاؤں میں اپنے حسن و شباب کی تعریفیں سن سن کر خوش ہوتی آئی ہوں۔ بڑھاپے کا طعنہ مجھ سے برداشت نہیں ہوتا مجھے سوری کہو۔ ایک بار اپنی غلطی تسلیم کر لو۔ نہیں کرو گے تو شہزاد سے نکاح پڑھوا لوں گی۔

"ارے بے وفا! میں دولت مند ہوں تو کیا ہوا؟ کیا عورت نہیں ہوں۔ عورت امیر ہو یا غریب' اس میں وفا اور شرم ہوتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ حالات اور ماحول اسے بے شرم بنا دیتے ہیں۔ اللہ کا شکر ہے' میں ابھی تک شرم والی ہوں۔ آج بھی کسی دوسرے کو اپنا ہاتھ چومنے نہیں دیتی۔ شادی کے نام پر کسی غیر مرد کو برداشت نہیں کر سکتی۔ تم نے مجھے زندگی کے کس نئے موڑ پر لا کر چھوڑ دیا ہے۔ بتاؤ میں تمہارے پاس کیسے آؤں' کس رشتے سے آؤں؟"

وہ کہتے کہتے سسکنے لگی۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے جلدی سے ریسیور رکھ دیا۔ اس کی آواز بھر آئی تھی۔ وہ بول نہیں پا رہی تھی۔ کچھ داستانیں ایسی ہوتی ہیں جو آنسوؤں میں ڈوب کر ادھوری رہ جاتی ہیں۔

☆------☆------☆

بابو برکت علی تھوڑی دیر تک اپنی میز پر بیٹھا سوچتا رہا اور یہ سوچ سوچ کر کڑھتا رہا کہ نامی گرامی پہلوان کبھی اسے چت نہ کر سکے لیکن بیگم اسے پچھاڑ کر چلی گئی۔ یہ توہین آمیز شکست اس سے برداشت نہیں ہو رہی تھی۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر کاؤنٹر پر آیا۔ کافی ہاؤس کے مالک نے بڑے ادب سے پوچھا۔ "میرے لائق کوئی خدمت؟"

وہ پہلوانی لہجے میں بولا۔ "ٹیلی فون ادھر لاؤ۔"

اس نے کاؤنٹر کے پیچھے سے فون اٹھا کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ بابو برکت علی نے ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کئے۔ پھر رابطہ قائم ہونے پر کہا۔ "ہیلو! میں برکت علی بول رہا ہوں۔ میڈم سے بات کراؤ۔"

دوسری طرف سے ہولڈ آن کرنے کے لئے کہا گیا۔ پھر چند سیکنڈ کے بعد میڈم کی چہکتی ہوئی آواز سنائی دی۔ "ہیلو بابو صاحب! مجھے یقین نہیں آ رہا ہے کہ آپ نے کنیز کو یاد کیا ہے۔ زہے نصیب! میں دل و جاں سے خدمت کے لئے حاضر ہوں۔ حکم دیجئے۔"

بابو برکت علی نے کہا۔ "تم نے دو ماہ پہلے کسی کا ذکر کیا تھا تمہیں یاد ہے؟"

"اچھی طرح یاد ہے۔ کیا اسے دیکھنا چاہیں گے؟"

"ہاں ابھی' اسی وقت دیکھ سکتا ہوں؟"

"آپ کے لئے دن دن نہیں' رات رات نہیں ہے جس گھڑی حکم دیں گے' یہ بندی خدمت کے لئے حاضر ہو جائے گی لیکن ایک بات ہے جس کے لئے میں نے کہا تھا' اس کا تعلق ایک معزز گھرانے سے ہے۔ آپ ان کے گھر نہیں جا سکیں گے۔ میں ان لڑکیوں کو اپنے ہاں بلاتی ہوں۔ آپ آدھے گھنٹے بعد آ جائیں۔ آپ کو میرا گھر یاد ہے نا؟"

"بھولنے والے سب کچھ بھول جاتے ہیں مگر تمہارے گھر کا راستہ نہیں بھولتے میں آ رہا ہوں۔"

اس نے ریسیور رکھ کر کافی کا بل ادا کیا۔ پھر باہر آ کر اپنی کار میں بیٹھ گیا۔ شام کے چھ بج رہے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ کار ڈرائیو کرتا رہا اور سوچتا رہا۔ کوئی نہیں آئے گی' میری شخصیت سے متاثر ہو کر کوئی نہیں آئے گی۔ عجیب بات ہے چند برس پہلے میں گلفام تھا۔ ایسی کیا تبدیلی آ گئی کہ اب کوئی پوچھتا ہی نہیں۔

آہ! عورت کیا چیز ہے' بوڑھی ہو جاتی ہے پھر بھی مرد اسے ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھتا ہے کہ اس کھنڈر میں کچھ باقی رہا ہے یا نہیں؟ فی زمانہ اونچے طبقے میں معزز خواتین کا احترام نہیں رہا کیوں کہ وہ خود بزرگ نظر نہیں آنا چاہتیں۔ جوانی کے پہلے لمحے سے بڑھاپے کی آخری سانس تک میک اپ میں ترو تازہ دکھائی دینا چاہتی ہیں۔ نادرہ بیگم کی بھی یہی کوشش رہتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ جوان خود بیگم کے پاس چل کر نہیں آیا تھا۔ اس کی ضرورت اسے لائی ہو گی۔ بیگم اس کی بہت سی ضروریات کی تکمیل کا ذریعہ بن گئی ہو گی۔

وہ آدھے گھنٹے بعد میڈم کے فلیٹ میں پہنچا۔ اس کا انتظار ہو رہا تھا۔ گاڑی کی

آواز سن کر میڈم کی بڑی بیٹی باہر آئی مسکرتے ہوئے اسے خوش آمدید کہا۔ "تشریف لائیے' امی آپ ہی کا کام کرنے گئی ہیں۔ آتی ہی ہوں گی۔"

وہ ڈرائنگ روم میں آیا۔ وہ بولی۔ "میرا نام شمع ہے' میں ایک بار آپ سے مل چکی ہوں۔ آپ بڑے آدمی ہیں' بھلا آپ کو کیا یاد ہوگا۔"

واقعی اسے یاد نہیں تھا۔ شاید ان دنوں دیکھا ہو جب آتش جوان تھا۔ حسیناؤں کا میلہ لگتا تھا صبح نشہ اترنے کے بعد یاد نہیں رہتا تھا کہ رات شمع تھی یا شعلہ تھا۔ اس نے پوچھا۔ "آپ ٹھنڈا پئیں گے یا گرم!"

"شکریہ' میں ابھی کافی پی کر آیا ہوں۔"

ایک نوجوان لڑکی فلیٹ کے ایک کمرے سے نکل کر آئی۔ اس نے سلام کیا۔ شمع نے کہا۔ "یہ میری چھوٹی بہن فیروزہ ہے۔ ابھی چودہ برس کی ہے۔ ماشاء اللہ ایسا روپ ہے کہ ابھی سے پیغام آنے لگے ہیں۔"

بابو برکت علی اسے دیکھ رہا تھا۔ فیروزہ کا رنگ تھا' روپ نہیں تھا۔ وہ بیس بائیس کی ہوگی چودہ برس کا کہہ دینے سے چہرے کا پکا پن نہیں چھپتا۔ بابو پہلوان اسے نظرانداز کرنے کے لئے ایک انگریزی رسالہ اٹھا کر ورق الٹنے لگا۔

فیروزہ نے پاس آکر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "یہ رسالہ پرانا ہے۔ کیا آپ نئی کتابیں نہیں پڑھتے؟"

اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ شمع چلی گئی تھی۔ اس نے فیروزہ سے پوچھا۔ "تمہاری امی ابھی تک نہیں آئیں؟ کیا دیر ہوگئی؟"

"وہ آتی ہی ہوں گی۔ آپ میوزک پسند کرتے ہیں؟ میرے پاس پاپ سنگرز کے نئے کلیکشنز ہیں۔ مجھے تو میڈونا بہت پسند ہے اور آپ کو؟"

"مجھے آج تک کوئی پسند نہیں آئی۔"

شمع دروازے کے پیچھے کھڑی سن رہی تھی۔ اس نے ناگواری سے منہ بنایا۔ وہاں سے چلتی ہوئی ٹیلیفون کے پاس آئی ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کئے اور رابطہ ہونے پر کہا۔ "ہیلو ممی! آپ ان لڑکیوں کو لے آئیں۔"

دوسری طرف سے میڈم نے پوچھا۔ "کیا اس نے فیروزہ کو لفٹ نہیں دی؟"

"نہیں ہمارا خیال تھا' بڈھے جذباتی اور ہوس پرست ہوتے ہیں پہلے میں اس

کے سامنے گئی' پھر فیروزہ لیکن وہ بڑے صبر سے کسی حور پری کا انتظار کر رہا ہے۔"

"اچھی بات ہے' میں آرہی ہوں۔"

شمع نے ریسیور رکھ دیا۔ بیس منٹ کے بعد میڈم تین لڑکیوں کے ساتھ ڈرائنگ روم میں آئی۔ آتے ہی کہا۔ "بابو صاحب' مجھے افسوس ہے' آپ کو انتظار کی زحمت اٹھانی پڑی۔ لڑکیو! یہ بابو برکت علی صاحب ہیں۔ شہر کے بڑے بڑے رئیسوں میں ان کا شمار ہوتا ہے.......... اور بابو صاحب! یہ حسنہ ہے' یہ سائرہ اور یہ نیلما.........."

بابو برکت علی کی نظر بہت پہلے ہی نیلما پر اٹک گئی تھی۔ میڈم کی کوئی بات کانوں تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ تعارف کے بعد جب نیلما نے سلام کیا تو سلام کی رس بھری آواز کانوں تک پہنچی۔ میڈم بہت پہنچی ہوئی تھی۔ اس لئے تاڑ لیا۔ اس نے کہا۔

"لڑکیو! اندر چلو میں ابھی آتی ہوں۔"

وہ دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔ میڈم نے قریب صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "میں چاہتی تھی میری کوئی لڑکی پسند آجاتی تو گھر کی بات ہوتی۔ آپ جو دیتے' وہ رکھ لیتی۔ یہ جو باہر سے آئی ہیں' بہت مہنگی ہیں۔"

وہ آہستگی سے بولا۔ "نیلما کی بات کرو۔"

وہ حیرانی سے بولی۔ "آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ وہ بہت ہی کم سن ہے۔"

"کم سن ہے تو یہاں کیوں لائی ہو؟"

"وہ تینوں بہنیں ہیں.......... میں دو کو لا رہی تھی چھوٹی نیلما تنہا گھر میں نہیں رہنا چاہتی تھی اس لئے اسے بھی لے آئی۔"

"کیا وہ تینوں اپنے گھر میں تنہا رہتی ہیں؟"

"ہاں' دس برس پہلے باپ مر گیا تھا۔ رشتے دار پوچھنے نہیں آتے تھے۔ ماں اور بڑی بیٹی حسنہ ملازمت کر کے اخراجات پورے کرتی تھیں۔ دو برس ہوئے ماں بھی چل بسی۔ اب حسنہ اور منجھلی بہن سائرہ ملازمت کرتی ہیں۔ نیلما کو پڑھاتی ہیں۔ روٹی کپڑے کا بوجھ اٹھاتی ہیں۔ میں آہستہ آہستہ انہیں لائن پر لا رہی ہوں۔ انہیں سمجھایا کہ وہ پارٹ ٹائم دھندا کریں گی تو اپنے اپنے جہیز کا سامان بھی کرتی جائیں گی۔"

میڈم نے سر گھما کر دوسرے کمرے کی جانب دیکھا۔ پھر سرگوشی میں بولی۔ "میں بہت بری ہوں مگر قسم کھا کر کہتی ہوں' یہ لڑکیاں خاندانی شریف ہیں۔ بے

چاریاں سہاگن بننے کے لئے' اچھی اور خاندانی زندگی گزارنے کے لئے ایسا کر رہی ہیں۔"

"نیلما کی بات کرو۔"

"اس کی بڑی بہنیں راضی نہیں ہوں گی۔"

"میں اس کی دونوں بہنوں کو جہیز کے لئے پچیس پچیس ہزار دوں گا۔"

"پچاس ہزار۔" میڈم کی اوپر کی سانس اوپر رہ گئی پھر وہ ہانپتی ہوئی بولی۔ "آ۔ آپ۔ آپ ایک رات کے لئے اتنا دیں گے!"

"نہیں۔ نیلما میرے لئے مخصوص رہے گی۔ جب وہ کسی سے شادی کرنا چاہے گی تو میں اس کا گھر جہیز سے بھر دوں گا اور آج کل چھوٹے سے چھوٹا گھر بھی لاکھوں میں بھرتا ہے۔"

میڈم نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "میرا دم نکل جائے گا م.......... میں لڑکیوں سے بات کروں گی۔ آپ ان سے کچھ نہیں کہیں گے۔ لین دین کا معاملہ صرف میرے اور آپ کے درمیان رہے گا۔"

"سوری میڈم! میں کھری بات کہوں گا تم پچاس ہزار میں سے بمشکل ان لڑکیوں کو پانچ ہزار دو گی۔ لہٰذا صرف اپنے کمیشن پر نظر رکھو۔ اگر تم نے نیلما کو راضی کر لیا تو میں پانچ ہزار دوں گا۔"

"صرف پانچ ہزار؟"

"گھر بیٹھے مل رہے ہیں۔ اگر میں یہاں سے اٹھ گیا تو خالی ہاتھ رہ جاؤ گی۔"

"میں آپ سے نہ سودے بازی کروں گی نہ آپ کو ناراض کروں گی کچھ اپنی طرف سے میری بوتل کے لئے بڑھا دیں۔ آپ جانتے ہیں' مجھے پینے کی عادت ہے اس کے بغیر نیند نہیں آتی۔"

"ایک ہزار اور دوں گا۔ میرا وقت برباد نہ کرو۔"

وہ شکریہ ادا کرتے ہوئے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ بابو برکت علی اٹھ کر ایک کھڑکی کے پاس آیا پھر باہر دیکھنے لگا۔ اندر کھچڑی پک رہی تھی۔ لڑکیاں شریف گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں اس لئے انہیں سمجھانے میں دیر لگ رہی تھی۔ آدھے گھنٹے بعد بڑی لڑکی حسنہ ڈرائنگ روم میں آئی۔ بابو برکت علی نے صوفے پر بیٹھنے کا

اشارہ کیا۔ وہ بیٹھ گئی۔ اس کے سر پر آنچل تھا اور نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ وہ اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولا۔ "میں نے میڈم سے صاف صاف کہہ دیا ہے' لین دین میرے اور نیلما کے درمیان ہوگا۔"

وہ آہستگی سے بولی۔ "نیلما بچی ہے' ابھی دسویں جماعت کا امتحان دیا ہے۔ ہم دو بہنیں اسے ایسے معاملے سے دور رکھنا چاہتی ہیں۔ پلیز آپ سائرہ کو پسند کر لیں۔ وہ آپ کے مقابلے میں بہت کم عمر ہے' خوب صورت بھی ہے۔"

"جہاں تک پسند کا تعلق ہے' میں تمہیں بھی پسند کر سکتا ہوں میڈم کی لڑکیوں کو بھی پسند کر سکتا ہوں۔ مگر یہ دل آنے کی بات ہے اور میرا دل نیلما پر آگیا ہے۔ اس کے لئے لین دین کی بات کرو گی تو بیٹھتا ہوں ورنہ چلا جاتا ہوں۔"

حسنہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ بولا۔ "نصیب چاک سے لکھا جاتا تو آنسوؤں سے مٹ جاتا' اسے مٹا کر دوسرا نصیب لکھا جاتا۔ میری یہ بات آنچل میں باندھ لو۔ ایک شریف زادی بکتے وقت روتی ہے تو اور زیادہ حسین اور پرکشش لگتی ہے۔ عورت کو زبردستی حاصل کرنے میں بڑا لطف آتا ہے۔ مرد محبت کے معاملے میں دوست ہوتا ہے اور ہوس کے معاملے میں قصائی۔"

وہ آنچل سے آنسو پونچھنے لگی۔ بابو برکت علی نے کہا۔ "کل نیلما کو کوئی اٹھا لے جائے گا۔ اس کی عزت سے کھیل کر چھوڑ دے گا۔ تب تم بہنیں رونے کے سوا کچھ نہیں کر سکو گی۔ آج بھی تم دونوں اپنی اپنی عزت کی میت پر آنسو بہاتی ہوگی.......... آج کل میں تیسری بہن بھی ماتم کرے گی۔ پھر ایسا راستہ کیوں اختیار نہیں کرتیں جس پر چل کر تم تینوں جلد سے جلد سہاگن بن جاؤ۔"

حسنہ نے کہا۔ "ایسا صرف سوچا جا سکتا ہے مگر ہو نہیں سکتا ہم میں سے کسی بہن کی شادی ہوگی تو اس کی سسرال والے سوال کریں گے کہ باقی دو بہنیں راتوں کو کہاں جاتی ہیں؟"

"ایسے سوالات کا موقع ہی نہیں آئے گا۔ نیلما سے میرا معاملہ طے ہوتے ہی تم دو بہنیں راتوں کے عذاب سے نجات حاصل کر لو گی۔ عزت سے ملازمت کرتی رہو گی۔ یہ محض پچاس دن کی بات ہوگی۔ آج سے میں تم تینوں کو پانچ پانچ سو روپے روز دیا کروں گا۔ یوں پچاس دن میں ہر بہن کے پاس پچیس ہزار روپے ہو جائیں

گے۔ اگر یہ رقم جہیز کے لئے کم پڑے گی تو نیلما سے میری دوستی سو دن تک چلے گی۔ اس طرح روزانہ پانچ سو روپے سے ہر ایک کے پاس پچاس ہزار جمع ہوں گے۔ یہ معیاد جتنی بڑھانا چاہو گی' رقم بھی بڑھتی جائے گی۔ میں نیلما کو خود نہیں چھوڑوں گا۔ وہ جب بھی چاہے مجھے چھوڑ کر جاسکتی ہے۔"

"آپ بہت ہی صاف گو ہیں۔ جو طریقہ بیان کر رہے ہیں اس سے ہمیں دھوکا نہیں ہوگا۔ روزانہ اچھی خاصی رقم ملا کرے گی۔"

"بے شک' جس روز رقم نہ ملے مجھ سے تعلقات ختم کئے جاسکتے ہیں لیکن میں زبان کا دھنی ہوں۔ مخصوص رقم روز ملتی رہا کرے گی اور پہلی قسط ابھی کار میں بیٹھ کر دوں گا۔"

وہ اٹھ کر دوسرے کمرے میں گئی وہاں پر دس پندرہ منٹ تک کھچڑی پکتی رہی۔ اس کے بعد میڈم ان تینوں کے ساتھ آئی اور کہا۔ "بابو صاحب! مبارک ہو نیلما آپ کی ہوگئی۔"

وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ "میرے ساتھ آؤ۔"

میڈم تینوں کو ساتھ لے کر اس کے پیچھے چلتی ہوئی فلیٹ کے باہر کار کے پاس آئی۔ اگلی سیٹ کا دروازہ کھول کر نیلما کو بیٹھنے کے لئے کہا۔ وہ ہچکچا رہی تھی مگر میڈم نے اسے زبردستی بٹھا دیا۔ دونوں بہنوں کے ساتھ خود پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ بابو برکت علی نے اسٹیئرنگ سیٹ پر آکر ڈیش بورڈ کے ایک حصے کو کھولا۔ وہاں نوٹوں کی گڈیاں نظر آرہی تھیں۔ اس نے چھ ہزار نکال کر میڈم کو دیتے ہوئے کہا۔ "آج سے ان لڑکیوں کو بھول جاؤ۔ ان کے لئے کبھی کسی سے سودا نہ کرنا میری مرضی کے خلاف کبھی ایسا کرو گی تو پولیس والوں کو پیچھے لگا دوں گا۔"

"میں کان پکڑتی ہوں' کبھی ان لڑکیوں سے بات بھی نہیں کروں گی۔"

وہ کار سے نکل کر فلیٹ میں چلی گئی۔ بابو برکت علی نے حسنہ کو پندرہ سو روپے دیئے پھر کار آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "نیلما کے لئے شاپنگ ضروری ہے۔ نئے ملبوسات' ان سے میچ کرتی ہوئی چپلیں اور سینڈلیں اور میک اپ کا سامان وغیرہ لازمی ہے۔ بیوٹی پارلر میں اس کا حلیہ تبدیل ہوگا تاکہ یہ میرے طبقے کی شہزادی نظر آئے۔"

حسنہ نے کہا۔ "اس کا حلیہ تبدیل ہوگا تو ہمارے محلے میں باتیں بنائی جائیں

گی۔"

"گلشن اقبال میں میری ایک کوٹھی ہے۔ کل صبح تک وہاں شفٹ ہو جاؤ۔"

تھوڑی دیر بعد کار ایک کوٹھی کے احاطے میں داخل ہوئی۔ چوکیدار نے سلام کرتے ہوئے دروازہ کھولا۔ اندر کی لائٹس جلائیں حسنہ اور سائرہ مختلف کمروں میں جاکر کوٹھی کو دیکھنے لگیں بابو برکت علی نے نیلما سے پوچھا۔ "تم خاموش ہو' نہ مسکراتی ہو' نہ اداس ہو۔ کیا یہ کوٹھی اندر سے نہیں دیکھو گی؟"

نیلما نے خاموشی سے منہ پھیر لیا۔ اس کی یہ ادا بھی اچھی لگی۔ اس نے پوچھا۔ "مجھ سے ناراض ہو؟"

وہ پھر خاموش رہی۔ اس نے کہا۔ "میں تمہاری بہن سے یہ پوچھنا بھول گیا کہ تم بول سکتی ہو یا پیدائشی گونگی ہو؟"

وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی کوٹھی کے باہر برآمدے میں آگئی۔ وہ اس کے پیچھے آکر بولا۔ "تم بڑی خاموشی سے میری انسلٹ کر رہی ہو۔"

نیلما نے ایک گہری سانس لی پھر بولی۔ "میں یہ جرأت نہیں کرسکتی۔ خاموش ہوں کہ کچھ کہنے سننے کی گنجائش نہیں رہی۔ دل اور دماغ پر بوجھ ہے' کچھ بولنے کو جی نہیں چاہتا۔"

"یہ بوجھ رفتہ رفتہ اتر جائے گا۔"

"آپ جتنی مہربانیاں کریں گے' بوجھ بڑھتا جائے گا۔ ہزاروں روپے' قیمتی لباس' مہنگا میک اپ' شاندار کوٹھی' سوسائٹی میں عزت بڑھتی جائے گی۔ یہ آدمی ہی کا کمال ہے کہ عزت لے کر عزت بڑھاتا جاتا ہے۔"

"مجھے کڑوی گولیاں اچھی لگتی ہیں۔ میں نگلنے سے پہلے یا نگلتے وقت منہ نہیں بناتا۔"

"آپ مجھ سے سودا نہ کرکے نیکی کمانے کے لئے بھی ایسا کرسکتے ہیں۔"

"شوق کی حد نہیں ہوتی جیسا کہ تم دیکھ رہی ہو۔ انسانی فطرت کے مطابق نیکی کی حد ہوتی ہے۔ اگر تم فاقہ کر رہی ہو تو میں تمہیں روٹی کھانے کے لئے ایک روپیہ دوں گا۔ اگر کہیں حادثے میں زخمی ہو جاؤ اور میں وہاں پہنچ جاؤں تو تمہیں کار کی پچھلی سیٹ پر ڈال کر اسپتال پہنچا دوں گا۔ کبھی کبھی نیکی کی حد بھی گڑبڑا جاتی ہے۔ مثلاً کوئی

مولوی میلاد کا چندہ لینے آئے گا تو میں پانچ روپے دوں گا۔ تم چندہ مانگنے آؤ گی تو سو روپے دوں گا۔ ہم سب حالات کے مطابق نیکی کرتے ہیں اور شوق کے مطابق قیمت بڑھاتے یا گھٹاتے ہیں۔"

وہ الجھن کا اظہار کرتے ہوئے بولی۔ "دراصل جو بات میں کہنا چاہتی ہوں' وہ صحیح طور پر نہیں کہہ پا رہی ہوں۔"

"تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ میں اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھوں کہ میں بہت بڑی نیکی' بہت بڑی برائی کے ساتھ کر رہا ہوں اور مجھے ایسا نہیں کرنا چاہئے۔"

"میں بالکل یہی کہنا چاہتی ہوں' آپ گریبان میں جھانک کر جواب دیں۔"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "سچ مچ کم سن ہو' بھولی ہو۔ رفتہ رفتہ معلوم ہو گا کہ ہمارے پاس گریبان ہوتا ہی نہیں ہے۔ جھانکیں تو کہاں جھانکیں؟ البتہ مجھ میں اتنی شرافت ہے کہ میں زبردستی نہیں کرتا۔ میں نے تمہیں دیکھا اور قیمت لگائی۔ میں اب بھی کوئی جبر نہیں کر رہا ہوں۔ صبح تک گریبان میں جھانکتی رہو۔ اگر میں ظالم ٹھہروں تو میرے پاس نہ آنا۔"

وہ سر جھکا کر بہنوں کے پاس چلی گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد تینوں برآمدے میں آئیں۔ اس نے پوچھا۔ "گھر پسند آیا؟"

سائرہ نے کہا۔ "یہ ہمارے خیالوں اور خوابوں سے بھی زیادہ بڑا اور خوبصورت ہے۔ یقین نہیں آ رہا کہ ہمارے دن بدل رہے ہیں۔"

اس نے حسنہ سے پوچھا۔ "تمہارا کیا خیال ہے؟"

"میں کل اپنی بہنوں کے ساتھ یہاں آ جاؤں گی لیکن ایک بات ہے۔"

"ہاں ہاں' بولو۔"

"ہمارے پاس پرانی الماری' ٹین کا صندوق اور دو چارپائیاں ہیں۔ اتنی شاندار کوٹھی میں ہمارا سامان مضحکہ خیز لگے گا۔"

"جو سامان ضروری سمجھتی ہو لے آؤ۔ باقی چھوڑ دو۔ یہاں نیا فرنیچر اور تمہاری ضرورت کا تمام سامان آ جائے گا کل گیارہ بجے آ کر نیلما کو شاپنگ کے لئے لے جاؤں گا۔ میرے ساتھ چلو' جہاں کہو گی وہاں پہنچا دوں گا۔"

"شکریہ۔ آپ جائیں ہمیں یہاں سے ٹیکسی مل جائے گی۔"

وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا کار کی اسٹیئرنگ سیٹ پر آیا۔ وہ جاتے جاتے نیلما کو نظر بھر کے دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ دیکھنے کی چیز تھی اسے بار بار دیکھنا چاہتا تھا لیکن اسے صبح تک فیصلہ کرنے کا وقت دے چکا تھا۔ وہ انکار کر سکتی تھی اس کا انکار سننے سے پہلے وہ اسے بار بار دیکھ کر اس کا بھاؤ بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔ لہٰذا اس پر نظر ڈالے بغیر یوں چلا آیا جیسے اس کی خاص ضرورت نہ ہو اس جیسی شہر میں ہزاروں مل جاتی ہیں۔

وہ آرام سے ڈرائیو کرتا ہوا اپنی کوٹھی کے احاطے کے قریب آیا۔ کوٹھی شہر کے سب سے مہنگے علاقے میں تھی۔ نائٹ چوکیدار نے بڑے آہنی گیٹ کو کھولا۔ کار اندر آئی تو ایک ملازم اسٹیئرنگ سیٹ کا دروازہ کھول کر ادب سے کھڑا ہو گیا۔ کوٹھی کا دروازہ کھولنے کے لئے ایک اور ملازم تھا لیکن کسی کو اندر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ اتنی بڑی کوٹھی میں صرف ایک بوڑھا ملازم تھا اسے معلوم تھا کہ صاحب کو کس وقت کس چیز کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس نے وارڈ روب سے شب خوابی کا لباس نکال کر باتھ روم میں رکھ دیا تھا۔ باتھ ٹب میں صابن کا جھاگ بنا دیا تھا۔ ٹب کے پاس ہی ایک ریوالونگ ٹرالی تھی جس پر ایک بے لباس حسینہ کی مورت رقص کے انداز میں کھڑی ہوئی تھی۔ ٹرالی کے گھومنے سے یوں لگتا تھا جیسے وہ حسینہ رقص کے انداز میں گھوم رہی ہے۔ اس کے ساتھ ہی میٹھے سُروں میں دھیمی دھیمی موسیقی کی آواز ابھرتی تھی۔ موسیقی کے اتار چڑھاؤ کے مطابق حسینہ پر رنگ برنگی روشنی کے زاویے بدلتے رہتے تھے۔ ٹرالی کے نچلے حصے میں وہسکی کی بوتل اور شیشے کا خوبصورت جام رکھا ہوا تھا۔

بابو برکت علی اپنی خواب گاہ میں آیا۔ سب سے پہلے وہ ٹیلیفون کے پاس پہنچا۔ ریکارڈر کو فون سے الگ کر کے اندر رکھے ہوئے کیسٹ کو ریوائنڈ کیا پھر اسے آن کرنے بعد جوتے اور جرابیں اتارنے لگا۔ ریکارڈر سے نادرہ بیگم کی آواز ابھر رہی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "میں کیا بولوں' جی چاہتا ہے تمہیں جان کہہ کر مخاطب کروں مگر ایسا کس رشتے سے کہہ سکتی ہوں؟"

بابو برکت علی نے ناگواری سے منہ بنایا۔ ابھی وہ نیلما کے صبح بہار چہرے کو دیکھ کر آیا تھا۔ نادرہ بیگم کی آواز بڑھاپے کی شام کا تصور پیش کر رہی تھی۔ وہ ریکارڈر کو بند کر سکتا تھا مگر ایک تجسس تھا کہ نادرہ کے ساتھ وہ جوان کون تھا؟

نادرہ آگے چل کر ریکارڈر کے ذریعے کہہ رہی تھی۔ "بابو برکت علی! تم نے اس جوان کو دیکھا ہے اس کا نام شہزاد ہے۔ کیسا نوخیز اور بھرپور جوان ہے میں کسی بوڑھے سے دوستی کر سکتی تھی، مگر تم نے ایک نہیں، ہزار بار طعنے دیئے کہ میں بوڑھی ہوگئی ہوں۔ کوئی جوان میری طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھے گا۔ آج تم نے اسے دیکھ لیا، آئندہ بھی اسے میرے ساتھ دیکھو گے۔"

بابو برکت علی نے فوراً ہی قریب آکر ریکارڈر کا بٹن یوں دبایا جیسے گلا دبا رہا ہو۔ نادرہ بیگم کی آواز گھٹ کر مرگئی۔ وہ بڑبڑاتا ہوا باتھ روم میں آیا۔ "آئندہ تُو اسے اپنے ساتھ کیا دکھائے گی، میں دکھاؤں گا جب نیلما میرے بازو میں بازو ڈال کر چلے گی تو تیرا بڑھاپا روزِ روشن کی طرح ننگا ہوجائے گا اور یہ ثابت ہوجائے گا کہ مرد بڑھاپے میں بھی جوان رہتا ہے اور نیلما جیسی ٹرافیاں حاصل کرتا رہتا ہے۔"

وہ لباس اتار کر ٹب کے اندر آیا جھاگ میں ڈوب کر بیٹھ گیا۔ حسین مورت ٹرالی پر رقص کر رہی تھی اس نے ایک جام میں وہسکی لی۔ ٹب سے ذرا فاصلے پر ایک آئینہ تھا اس نے اپنے عکس کو دیکھ کر جام اٹھایا۔ عکس نے بھی جام اٹھایا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو چیئرز کہا پھر اسے ہونٹوں سے لگایا۔ برکت علی نے ایک گھونٹ پی کر ایک سرد آہ بھری۔ "آہ! اپنی اہمیت جتائے بغیر ہمیں تسکین نہیں ملتی۔ جب تک جوانی کا گرم لہو دوڑتا رہتا ہے، ہم اپنے شہر اپنے ملک اور اپنی دنیا میں نمایاں مقام حاصل کرکے اپنی شخصیت کو اہم بنانے کی جدوجہد کرتے رہتے ہیں۔ ہم اپنی جدوجہد میں کامیاب ہوتے ہیں۔ کوئی کامیابی مرتے دم تک ہمیں نمایاں رکھتی ہے۔ کوئی ہمیں مرنے کے بعد بھی زندہ رکھتی ہے۔ صرف ایک کامیابی ایسی ہے جو بڑھاپے کی دہلیز پر دم توڑ دیتی ہے اور وہ ہے پہلوانی.........."

برکت علی پہلوان نہیں تھا۔ ایک موٹر مکینک تھا۔ لوگ اسے بابو مستری کہتے تھے۔ چار برس کی عمر میں ماں باپ مرگئے چھ برس کا ہوا تو چچا نے گھر سے نکال دیا۔ وہ قد اور جسامت میں ایسا لانبا چوڑا تھا کہ چھ برس کی عمر میں بارہ چودہ برس کا لگتا تھا۔ پانچ تندور کی روٹیاں کھاتا تھا۔ چچا اس کی خوراک برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ ایک مستری نے اپنے گیراج میں اسے کام دیا، وہ محنتی تھا صبح سے رات گئے تک کام کرتا رہتا تھا لیکن تین آدمیوں کا کھانا اکیلا کھاتا تھا۔ مستری بھی اس کی خوراک دیکھ کر اپنے گیراج

سے بھگانا چاہتا تھا لیکن مستری کا ایک پہلوان دوست وہاں آیا کرتا تھا۔ برکت علی کو دیکھ کر کہتا تھا۔ "یہ تو پیدائشی پہلوان لگتا ہے۔ کیوں بے! میرا پٹھا بنے گا؟ تجھے رستم زماں بنادوں گا۔"

مستری کہتا۔ "امام دینا! جب تک تُو اسے رستم زماں بنائے گا، یہ تجھے کھا جائے گا۔ یہ ہاتھی کی خوراک کھاتا ہے۔"

امام دین پہلوان نے کہا۔ "یہی تو پہلوانوں کی نشانی ہے۔ میں اس کا خرچ اٹھاؤں گا۔ تُو اسے میرے حوالے کردے۔"

"جب چاہو، لے جاؤ۔ یہ میری اولاد تو نہیں ہے کہ دکھ ہوگا۔"

اس نے مستری سے کہا۔ "یار میرے دل میں ایک بات پک رہی ہے۔ تجھ سے اکیلے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔"

مستری نے برکت سے کہا۔ "اے بابو! جا اُدھر افضل کے ساتھ کام کر۔"

بابو دور ایک گاڑی کے پاس کام کرنے چلا گیا۔ امام دین نے کہا۔ "یار! تُو نے میری بیٹی کو دیکھا ہے۔ ابھی پندرہ برس کی ہے اور مجھے فکر ہوگئی ہے۔ میں باپ ہو کر کہتا ہوں، ایسی بدصورت لڑکی گھر میں بیٹھی رہ جائے گی پہلوانوں کو صرف فکر کھاتی ہے۔ اگر میں فکر مند رہوں گا تو اگلا دنگل ہار جاؤں گا۔"

مستری نے کہا۔ "بیٹیوں کی فکر سے کبھی نجات نہیں ملتی۔"

"تم میرا ساتھ دو تو نجات مل جائے گی۔ یہ برکت علی اتنی سی عمر میں کیسا قد آور لگتا ہے۔ میں اسے کھلاؤں گا تو آٹھ دس برس میں میری بانو سے دوگنی عمر کا لگے گا۔ ابھی سے میرا احسان مند رہے گا تو بانو سے شادی کرلے گا۔"

"تُو نے بہت دور کی سوچی ہے۔ اسے اپنے ساتھ لے جا۔"

"صرف لے جانے سے بات نہیں بنے گی تجھے بھی ساتھ دینا ہوگا۔ اسے پکا موٹر مکینک بنادے، جب کمانے کے قابل ہوجائے گا تو اپنی خوراک کا بوجھ خود ہی اٹھالیا کرے گا۔"

"مگر تُو تو اسے پہلوان بنانا چاہتا تھا۔"

"وہ تو بناؤں گا۔ مگر پہلوانی میں پکی آمدنی اسی وقت ہوتی ہے جب بڑے بڑے نامی گرامی پہلوانوں کو پچھاڑا جاتا ہے اور میں ابھی کہہ نہیں سکتا کہ برکت کہاں تک

میدان مار سکے گا۔ میں اپنی کوششوں سے اسے پہلوان بناؤں گا۔ تو اسے زبردست مکینک بنادے تو میری بیٹی تیری بھتیجی کی زندگی سنور جائے گی۔"

دونوں اس بات پر راضی ہوگئے۔ برکت کو بلا کر سمجھایا کہ آج سے وہ امام دین کے ہاں رہا کرے گا۔ پہلوانی بھی سیکھے گا اور گیراج میں آکر کام بھی سیکھتا رہا کرے گا۔ مستری نے کہا۔ "ہم دونوں تیری زندگی بنانا چاہتے ہیں۔ محنت کرے گا تو بہت بڑا آدمی بنے گا۔ بڑا نام کمائے گا۔"

برکت نے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "آپ لوگوں کی مہربانی ہے۔ آپ جیسا کہیں گے میں ویسا ہی کروں گا۔"

امام دین نے پوچھا۔ "کیا ہمارا وفادار رہے گا؟"

وہ بولا۔ "استاد! آپ کے حکم پر جان بھی دے دوں گا۔"

وہ اسے اپنے گھر لے آیا۔ گھر میں بانو کو دیکھ کر برکت نے کہا۔ "سلام باجی!"

پہلوان نے گرج کر کہا۔ "ابے' یہ تیری باجی کیسے ہوگئی۔ ساتھ کھڑا ہو کر دیکھ تیرے برابر ہے۔ تُو اسے بانو کہا کرے گا۔"

"جی اچھا۔ بانو کہوں گا۔"

"میرے ہاں چھ بھینسیں ہیں۔ تجھے دودھ پینے اور مکھن کھانے سے کوئی نہیں روکے گا تیری خوراک میں کمی نہیں ہوگی۔ جب تو پہلوان بن جائے گا پوری طرح تیار ہوجائے گا اور پہلا دنگل جیت کر آئے گا تو بانو کی شادی تجھ سے کردوں گا۔"

اس نے سر اٹھا کر بانو کو دیکھا۔ شام کے پھیلتے ہوئے اندھیرے میں وہ کچھ ڈراؤنی سی چیز لگ رہی تھی۔ شادی کی بات سنتے ہی شرما کر چلی گئی۔ پہلوان نے کہا۔ "میں اپنی پہلوانی' اپنے داؤ پیچ' اپنا گھر اپنی بھینسیں اور اپنی بیٹی تجھے دے رہا ہوں۔ تیرے جیسا خوش نصیب کوئی نہیں ہوگا اگر انکار ہے تو ابھی بتادے۔"

"استاد! میری کیا مجال ہے کہ میں انکار کروں۔ جو حکم دوگے' وہی کروں گا۔ ساری زندگی تمہارے قدموں میں پڑا رہوں گا۔"

امام دین خوش ہوگیا۔ دوسرے دن صبح منہ اندھیرے پہلوانی کا سبق شروع ہوگیا۔ وہ سورج نکلنے تک ورزش کرتا تھا۔ سہ پہر تین بجے واپس آکر کھانا کھاتا اور شام ہوتے ہی پھر اکھاڑے میں پہنچ جاتا تھا۔

ایک دن بانو نے کہا۔ "صرف پہلوان بننے سے کیا ہوتا ہے کچھ پڑھنا لکھنا بھی سیکھو۔ میں تمہیں پڑھایا کروں گی۔"

وہ نویں جماعت میں پڑھتی تھی۔ اسکول سے آکر اسے پڑھانے لگی۔ اس طرح وہ مصروف دن رات گزارنے لگا۔ پڑھنے لکھنے میں زیادہ دل نہیں لگتا تھا لیکن بانو اپنی عمر کے حساب سے دل لگانا سکھاتی تھی۔ جیسے جیسے دن گزرتے تھے' وہ نکھرتا جاتا تھا۔ قد میں ابھرتا جاتا تھا سولہ برس کی عمر میں ساڑھے چھ فٹ کا پہاڑ جیسا جوان نظر آنے لگا۔ امام دین کے تمام داؤ پیچ سیکھ لئے۔ مستری نے اسے گاڑیوں کی مرمت کرنا سکھادیا۔ بانو کی محبت اور توجہ سے اردو کی ہر کتاب پڑھنے لگا۔ انگریزی اٹک اٹک کر پڑھ لیتا تھا۔ وہ ایسا گبرو جوان بن گیا تھا کہ بانو اسے دیکھ دیکھ کر گھبراتی تھی۔ آئینہ دیکھتی تھی اور سوچتی تھی کوئی بھی حسین لڑکی اسے چھین کرلے جائے گی۔

اس کا اندیشہ غلط نہیں تھا۔ وہ پتلون شرٹ پہن کر ایکشن فلموں کا ہیرو لگتا تھا۔ قریب سے گزرنے والیاں اس کے کسرتی بدن کو ضرور دیکھتی تھیں کتنے ہی امیر گھرانوں کی عورتیں اپنی گاڑیاں لے کر گیراج میں آتی تھیں۔ گاڑیوں میں چھوٹی بڑی خرابیاں پیدا کرکے اس کے پاس آنے کا بہانہ ڈھونڈ لیتی تھیں یا ملازموں کے ذریعے اپنی کوٹھیوں میں بلالیتی تھیں۔

یہیں سے بابو برکت علی کو اپنی اہمیت کا احساس ہوا۔ آخر وہ عورتوں سے کہاں تک بچ سکتا تھا۔ پہلی بار ایک رئیس زادی نے اسے اپنی طرف مائل کیا تو اس نے کہا۔ "میں تم سے دوستی نہیں کرسکتا۔"

رئیس زادی نے پوچھا۔ "کیوں نہیں کرسکتے؟"

"مجھ پر استاد کے اور مستری صاحب کے بڑے احسانات ہیں۔ میں نے دس برس پہلے زبان دی تھی کہ ان کا وفادار رہوں گا اور استاد کی بیٹی سے شادی کروں گا۔"

"تم اس کی بیٹی سے محبت کرتے ہو؟"

"محبت کیا ہوتی ہے؟ اگر تم لیلیٰ مجنوں والی محبت کو پوچھ رہی ہو تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آج تک جتنے محبت کرنے والے گزرے ہیں' ان میں سے کوئی پہلوان نہیں تھا۔"

"یعنی پہلوان محبت نہیں کرتے۔ کیا وہ خوبصورت ہے؟"

"بہت ہی بدصورت ہے۔"

"سمجھ گئی' تمہارے استاد اور مستری نے تمہیں اُلو بنایا ہے ایک بدصورت لڑکی سے شادی کرانے کے لئے تمہاری پرورش کی ہے۔"

"انہوں نے مجھے ہنرمند بنایا ہے کیا یہ احسان نہیں ہے؟"

"تم کسی بھی گیراج میں کام کرکے مکینک بن سکتے تھے۔ کسی بھی پہلوان کے چیلے بن سکتے تھے۔ اگر تمہارے پاس عقل اور سیکھنے کی لگن نہ ہوتی تو وہ تمہیں کبھی ہنرمند نہیں بنا سکتے تھے۔ پھر یہ کوئی ہنر ہے۔ تمہیں مکینک کون کہے گا؟ تم تو ڈپلوما ہولڈر نہیں ہو۔ ملک کے اندر یا باہر بڑی موٹر کمپنیوں میں جاؤ گے تو تمہیں محض کاریگر کے طور پر رکھا جائے گا۔ جہاں تک پہلوانی کا تعلق ہے اگر ایک دنگل بھی ہار گئے تو چھٹی ہو جائے گی۔ کیا تم گیراج مستری بن کر ایسی شان وشوکت کی زندگی گزار سکتے ہو جیسی ہم گزارتے ہیں؟"

"نہیں۔ یہ تو اپنے اپنے نصیب کی بات ہے۔"

"نصیب چالبازیوں سے بنتا ہے' جیسے امام دین نے اپنی بیٹی کے لئے چالبازی سے تمہارا نصیب بنایا ہے۔ کیا وہ بغیر مطلب تمہیں روزانہ خشک میوے اور تازہ پھل کھلا سکتا تھا۔ روز چار پانچ سیر دودھ پلا سکتا تھا؟ نہیں' ہرگز نہیں۔ آج تک ایسا کوئی سخی داتا پیدا ہوا ہے نہ ہوگا۔"

"تمہاری باتیں دل کو لگ رہی ہیں۔ جب میں بانو کو دیکھتا ہوں تو سوچتا ہوں' تمہارے جیسی حسین لڑکیوں کو دیکھنے کے بعد اس کے ساتھ کیسے زندگی گزار سکوں گا۔"

"آج سے تم میرے پاس رہو گے۔ ممی اور ڈیڈی لندن میں ہیں۔ تم یہاں سے جانے کے بعد عقل سے سوچ سمجھ سکو گے میں تمہیں چالبازی کا جواب چالبازی سے دینا سکھاؤں گی۔"

وہ نہ بھی سکھاتی' تب بھی وہ سیکھ جاتا۔ کیوں کہ اس کی خوبروئی اور مردانہ وجاہت اُسے بڑی بڑی کوٹھیوں میں پہنچا رہی تھی۔ وہ دولت کی چکاچوند میں سوچنے لگا تھا کہ یہ شان وشوکت میرے پاس کیوں نہیں ہے۔ وہ فری اسٹائل کشتیوں کے لئے

کئی بار ملک سے باہر گیا۔ باہر کی دنیا نے اس کی آنکھیں اور کھول دیں۔ اُدھر امام دین کہتا تھا۔ "بڑے دنگل جیت لئے۔ اب میری بیٹی سے شادی کرلے۔"

"استاد! ابھی بیوی بچوں کے چکر میں پڑوں گا تو پھر کوئی دنگل جیت نہیں سکوں گا۔ مجھے کچھ عرصہ دولت اور نام کمانے دو۔"

اس کی بات معقول تھی لیکن امام دین کو بیٹی کی عمر کا حساب زبانی یاد تھا۔ وہ تیس برس سے اوپر ہوگئی تھی۔ برکت کے ساتھ ایک ہی چھت کے نیچے رہتی تھی۔ ایک گبرو پہلوان کو دن رات اپنے قریب دیکھ کر نہ جانے اس کی کیا حالت ہوتی ہوگی۔ اس نے اپنی ایک سہیلی کے ذریعے باپ تک یہ بات پہنچائی تھی کہ برکت پر پڑھی لکھی خوبصورت لڑکیاں مرتی ہیں۔ گیراج میں آکر اسے اپنے ساتھ لے جاتی ہیں۔ کیا باپ ان باتوں سے بے خبر ہے؟

وہ بے خبر نہیں تھا۔ اسی لئے برکت کے پیچھے پڑ گیا تھا اور برکت شادی کے معاملے کو ٹالتا جا رہا تھا۔ ایک دن اس نے اور مستری نے مل کر شرم دلائی۔ مستری نے کہا۔ "بابو شرم کر! امام دین تیرا استاد بھی ہے اور باپ کی جگہ بھی ہے۔ اس نے تجھے زمین سے اٹھا کر آسمان پر پہنچا دیا۔ تُو نے اس کے گھر میں قدم رکھ کر قسم کھائی تھی کہ اس کا وفادار رہے گا' اس کے ہر حکم کی تعمیل کرے گا اور بانو سے شادی کرے گا۔"

وہ بولا۔ "مستری چاچا! کوئی کسی کو زمین سے اٹھا کر آسمان پر نہیں پہنچاتا' آدمی اپنی محنت اور لگن سے شہرت کی بلندیوں پر پہنچتا ہے۔ کیا استاد نے مجھے مکمل طور پر پہلوان بنا دیا ہے؟"

امام دین نے کہا۔ "بے شک تُو خود سمجھ سکتا ہے۔ تُو نے یورپ کے چار نامور پہلوانوں کو ناک آؤٹ کیا ہے۔"

"صرف چار پہلوانوں سے کیا ہوتا ہے کیا میں استاد کو پچھاڑ سکتا ہوں؟"

"میں نے تجھے ایسے ایسے داؤ پیچ سکھائے ہیں کہ بڑے سے بڑا استاد بھی تیرے آگے ٹھہر نہیں سکے گا۔"

"تُو میرا استاد ہے کیا میں تجھے پچھاڑ سکتا ہوں؟"

امام دین نے غصے سے کہا۔ "تُو میرا پٹھا ہے اور مجھے پچھاڑنے کی بات کرتا ہے۔"

مستری نے پوچھا۔ "کیا تُو استاد سے دنگل کرنا چاہتا ہے؟"

"ہاں اگر یہ استاد ہے تو اپنی استادی دکھائے میں زبان دیتا ہوں کہ یہ مجھے پچھاڑ دے گا تو میں بانو سے شادی کرلوں گا۔"

امام دین ایسی شرط سن کر دنگ رہ گیا۔ وہ بڑھاپے کے باعث لنگوٹ اتار چکا تھا۔ دوسرے پہلوانوں سے مقابلہ کرنے کی عمر گزر چکی تھی ایسے میں ایک شاگرد اسے چیلنج کررہا تھا۔ یہ اس کے لئے شرم کی بات تھی۔ اگر شاگرد جیت جاتا تو کسی کو منہ نہیں دکھا سکتا تھا۔ اگر وہ شاگرد کو پچھاڑ دیتا تب بھی لوگ کہتے کہ دوبارہ لنگوٹ باندھ کر بھی پچھاڑا تو بے چارے شاگرد کو جو اس کے داؤ پیچ کا محتاج رہتا آیا ہے۔

اس نے کہا۔ "برکت! تُو نے جس تھالی میں کھایا اسی میں چھید کررہا ہے۔ مجھے مشکل میں ڈال رہا ہے' کوئی بات نہیں۔ میں تجھ سے مقابلہ کروں گا۔"

مستری نے کہا۔ "امام دینا! دنیا والے کیا کہیں گے؟"

"مجھے دنیا والوں کی نہیں' بیٹی کی فکر ہے۔ اس سے پکے کاغذ پر لکھوالو کہ میں اسے پچھاڑوں گا تو اس کے بعد کسی حیل وحجت کے بغیر یہ بانو سے شادی کرے گا۔ اب اس کی زبان کا بھروسا نہیں رہا۔ اس سے لکھوالو۔"

مستری نے برکت کو اکیلے میں سمجھایا۔ "استاد سے مقابلہ نہ کرو۔ بیٹا باپ سے اور شاگرد استاد سے لڑے تو دنیا اس پر تھوکتی ہے۔ بانو تجھے پسند نہیں ہے کوئی بات نہیں' استاد کا دل رکھنے کے لئے شادی کرلے وہ بے چاری ایک طرف گھر میں پڑی رہے گی۔"

"مستری چاچا! میں ماڈرن ہوگیا ہوں' گھر میں بھینس نہیں پالوں گا۔"

"ہار جائے گا تو بھینس پالنی ہی پڑے گی۔"

"وہ مجبوری ہوگی۔ ابھی میں مجبور نہیں ہوں۔"

وہ ماننے والا نہیں تھا۔ دوسرے دن اشٹامپ پیپر پر معاہدہ ہوا۔ برکت نے اس تحریر کے نیچے دستخط کئے کہ وہ امام دین سے کشتی ہارنے کی صورت میں بانو سے شادی کرے گا اسے تمام عمر خوش رکھے گا اور اس پر سوکن نہیں لائے گا۔ یہ بہت ہی کڑی شرط تھی۔ برکت کو جیتنے کا یقین تھا اس لئے اس نے پکے کاغذ پر بیٹی کے باپ کی تمام شرائط مان لیں۔

امام دین نے کہا۔ "ہم دنیا والوں کے سامنے لڑیں گے تو دونوں کی بدنامی ہوگی۔ میں بازی ہاروں گا اور بیٹی کی شادی نہیں ہوگی تو وہ بھی مفت میں بدنام ہوگی۔ اس لئے ہم کسی ویرانے میں جاکر لڑیں گے۔ ہماری ہار جیت کا فیصلہ مستری کرے گا۔"

برکت نے یہ بات مان لی۔ اس رات وہ تینوں سمندر کے کنارے کنارے دور ویرانے میں گئے۔ چاندنی رات تھی۔ ساحل روشن تھا۔ دونوں نے کپڑے اتارے۔ اپنا اپنا لنگوٹ اچھی طرح کس کر باندھا پھر ایک دوسرے کے مقابلے پر آمنے سامنے آگئے۔ امام دین نے کہا۔ "اب بھی سوچ لے۔ یہ تُو نمک حرامی کررہا ہے۔"

برکت نے پینترا بدلتے ہوئے کہا۔ "میرا ضمیر مطمئن ہے۔ میں نے جتنا نمک کھایا ہے اس سے زیادہ پسینہ بہایا ہے۔ پہلے تیرے ہاں دس بھینسیں تھیں پھر اٹھارہ ہوگئیں۔ ان سب کو نہلاتا تھا' ان کا چارا تیار کرتا تھا۔ روزانہ اتنی بھینسوں کا دودھ دوہنا بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ پہاڑ کاٹ کر دودھ کی نہر نکالنے والی بات ہے۔"

استاد نے شاگرد کو باتوں میں لگا کر اچانک ایک داؤ مارا ایسی چال کو بھی استادی داؤ کہتے ہیں۔ مگر وہ صاف بچ نکلا۔ پھر پینترا بدلتے ہوئے بولا۔ "میں نے دن رات محنت کی ہے۔ تجھے گیراج کی بھی کمائی دیتا رہا ہوں۔ یورپ کے دنگل سے حاصل کئے ہوئے چھ لاکھ روپے میں سے چار لاکھ تجھے دے چکا ہوں پھر بھی تُو مجھے نمک حرام کہتا ہے۔"

استاد نے پھر ایک داؤ آزمایا۔ وہ داؤ میں آگیا۔ تھوڑی دیر تک پھنسا رہا۔ پھر اس نے توڑ کیا تو استاد اس کے اوپر سے ہوتا ہوا دور ریت پر جاکر گرا۔ اس کے حلق سے کراہ نکلی۔ کمر کی ہڈی بری طرح دکھنے لگی تھی۔ وہ جوانی میں گرتے وقت فوراً ہی کھڑا ہوجاتا تھا۔ آج بڑھاپا سوچ میں پڑ گیا' کیسے کھڑا ہو؟

تھوڑی دیر تک تینوں خاموش رہے۔ لہروں کا شور سنتے رہے پھر برکت آہستہ آہستہ چلتا ہوا کپڑوں کے پاس آیا اپنی شلوار اٹھا کر پہننے لگا۔ مستری نے کہا۔ "رک جا بابو برکت پہلوان! ابھی میرا یار چاروں شانے چت نہیں ہوا ہے۔ اس کا ایک شانہ اٹھا ہوا ہے۔"

وہ بولا۔ "میں چاہتا ہوں' اس کا شانہ اور سر ہمیشہ اٹھا رہے آخر یہ میرا استاد ہے۔ تُو گواہ ہے مستری چاچا! میں نے اس پر ہاتھ نہیں اٹھایا اور کوئی داؤ نہیں مارا۔

صرف اس کے داؤ سے نکلنے کے لئے توڑ کیا تھا۔"

امام دین آہستہ آہستہ اٹھتے ہوئے اور کراہتے ہوئے بولا۔ "اپنی صفائی پیش نہ کر۔ میں حوصلہ ہارنے والا اور آسانی سے چت ہونے والا نہیں ہوں۔ تو کشتی چھوڑ کر جائے گا تو ہار تیری ہوگی۔"

وہ قمیص پہنتے ہوئے بولا۔ "پکے کاغذ پر اس ویرانے میں مقابلہ کی بات نہیں لکھی ہے۔ میں تیری عزت رکھنے یہاں آیا ہوں۔ اگر چیلنج کرے گا تو بھرے مجمع میں شرمندگی اٹھائے گا۔"

امام دین سوچ میں پڑ گیا۔ برکت نے کہا۔ "میں بانو کے ساتھ برسوں سے ایک چھت کے نیچے رہتا آیا ہوں تیرے گھر سے جاکر اسے رسوا نہیں کروں گا۔ میں اب بھی چند شرائط پر اس سے شادی کرسکتا ہوں۔"

وہ جلدی سے بولا۔ "منظور ہے تیری ہر شرط منظور ہے۔"

مستری نے پوچھا۔ "کیا چاہتا ہے؟"

"پہلے تم دونوں یہ اعتراف کرلو کہ ہماری دنیا میں انسان اپنی ضرورت اور فائدے کے مطابق دوسرے انسان کو خریدتا ہے۔ تم نے مجھ سے نیکی نہیں کی تھی۔ آدمی دولت سے خریدا جاتا ہے یا احسان سے تم نے احسان کرتے کرتے مجھے خرید لیا تھا۔"

"چلو مان لیتا ہوں' میں نے تمہیں خرید رکھا تھا۔"

"تم بیٹی کی خاطر میری بات مان رہے ہو جب کہ یہ میری اپنی بات نہیں ایک عالمگیر حقیقت ہے۔ اللہ کو حاضر ناظر جان کر بولو' مجھے بارہ برس پہلے اپنے گھر کیوں لے گئے تھے؟"

مستری نے چور نظروں سے اپنے یار کو دیکھا۔ دونوں چور تھے۔ دونوں نے ایک چھ برس کے بچے کو تمام عمر پھانس کر رکھنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ امام دین نے کہا۔ "اللہ دیکھ رہا ہے۔ میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔ مجھے معلوم تھا بانو کا رشتہ کہیں سے نہیں آئے گا۔ اگر کوئی داماد بننے کو راضی ہوگا تو وہ میری بھینسوں کے دودھ کی آمدنی کو اور میری جمع پونجی کو دیکھے گا۔ کوئی خود غرض اسے عمر بھر سکھی نہیں رکھے گا۔ میں نے سوچا تیری پرورش کروں گا' تجھے اچھا کھلاؤں گا پلاؤں گا تو تو میری بانو کی قدر کرے گا۔"

برکت نے کہا۔ "یہ بھی خود غرضی ہوئی کہ مجھے اچھا کھلانے پلانے سے بانو کی قدر ہوگی' ورنہ نہیں ہوگی۔"

"ہاں۔ مگر میں نے یہ بھی سوچا تھا کہ یہ بچہ میرے ہاں پرورش پاتا رہے گا تو اس کا مزاج اور اس کی عادت معلوم ہوتی رہے گی اور میں اسے اپنے مزاج کے مطابق ڈھالتا رہوں گا۔"

"استاد! یہاں تجھ سے ایک غلطی ہوگئی تو نے مجھے بیٹا بناکر نہیں سوچا۔ بیٹا اپنے باپ کی عادت واطوار کو سکھائے بغیر سیکھتا ہے۔ کیونکہ وہ باپ کا عقیدت مند ہوتا ہے۔ تو نے میرے اندر عقیدت مندی نہیں' غلامی پیدا کی۔ تو نے مجھ سے بھینسوں کی خدمت کرائی' کبھی یہ نہیں چاہا کہ میں بھی بانو کی طرح اسکول میں داخل ہو جاؤں۔ ایک باپ کی اور ایک آقا کی پلاننگ میں بڑا فرق ہوتا ہے۔"

"میں اپنی حماقتوں کو تسلیم کرتا ہوں' تو بانو سے شادی کی بات کر۔"

"میں اس سے شادی کروں گا۔ مجھے تیرا گھر تیری بھینسیں نہیں چاہئیں۔ تو نے جتنی دولت جمع کی ہے اس میں سے ایک پیسہ بھی نہیں لوں گا۔ تیرا سب کچھ بانو کے نام ہوگا۔"

امام دین نے شدید حیرانی سے پوچھا۔ "یہ تو کہہ رہا ہے اتنی شرافت کا ثبوت دے کر میرے منہ پر جوتا مار رہا ہے۔ میں اسی قابل ہوں۔ مجھے ایک بار اور پچھاڑ دے' ایک بار اور کہہ دے کہ تجھے کچھ نہیں چاہئے صرف بانو چاہئے۔"

مستری نے کہا۔ "بابو یہ بات تو پہلے بھی کہہ سکتا تھا۔ کشتی کے لئے پکے کاغذ پر لکھوانے کی کیا ضرورت تھی؟"

اس نے جواب دیا۔ "آدمی کو اٹھا کر پٹخ دو پھر کوئی بات سمجھاؤ تو فوراً سمجھ لیتا ہے۔ اگر پہلے کہتا کہ مجھے دولت نہیں' بانو چاہئے تو تمہارے دماغ میں یہی کیڑا کلبلاتا کہ بچپن سے میری ذہنیت غلامانہ ہوگئی ہے۔ آقا اپنی بیٹی دے کر احسان کررہا ہے۔"

امام دین نے پاس آکر اس کے شانے اور بازو کو دباتے ہوئے کہا۔ "تو نے اپنا فیصلہ سناکر مجھے غلام بنالیا ہے۔ لگے ہاتھوں شادی کی تاریخ مقرر کرلے۔"

"بانو تیری بیٹی ہے۔ تیرا غرور اس کے خون میں بھی شامل ہے' وہ کبھی طعنے دے سکتی ہے کہ میں اس کے باپ کے ٹکڑوں پر پلتا رہا ہوں۔ وہ بیوی بن کر معزز سوسائٹی

میں میرا پیچھا کرسکتی ہے۔ اس لئے وہ شادی سے پہلے پکے کاغذ پر لکھ دے گی کہ گھر کی چار دیواری سے باہر میرے معاملات میں مداخلت نہیں کرے گی۔ کبھی بھی دوسری شادی کروں تو اعتراض نہیں کرے گی۔"

"یہ تو بانو پر ظلم ہوگا۔"

"ظلم نہیں ہوگا۔ وہ شادی سے پہلے مجھے دوسری تیسری شادی کی اجازت لکھ کر دے گی تو میں اس کا ہر طرح سے خیال رکھوں گا۔ اس کے تمام حقوق ادا کروں گا۔ اسے ہر طرح سے پہلی بیوی کا مان دوں گا۔"

وہ تینوں ساحل سمندر کے اکھاڑے سے واپس آگئے باپ نے گھر آکر بیٹی کو تمام روداد سنائی۔ اس نے کہا۔ "میں اسے بچپن سے جانتی ہوں۔ وہ دل کا بہت اچھا ہے۔ میں اسی کے لئے بیٹھی ہوں ابا! بس کاغذ لے آ' وہ جیسا چاہتا ہے' ویسا ہی لکھ دوں گی۔"

دوسرے دن تحریری معاہدہ ہوگیا۔ ایک ماہ بعد دھوم دھام سے شادی ہوگئی۔ ایک برس بعد وہ ایک بیٹے کا باپ بن گیا۔ جب اس نے پہلی بار بیٹے کو ہاتھوں میں لے کر پیار کیا تو اس کے چہرے سے' آنکھوں سے اور پیار کرنے کے انداز سے پتا چلتا تھا کہ اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔ ہر عورت کی طرح بانو کے دماغ میں بھی یہ بات آئی کہ مرد کو بچوں کی محبت میں اور ان کے مسائل میں الجھا کر رکھا جائے تو وہ ان کی خاطر دوسری عورت کے فریب میں نہیں آتا۔

اس نے چند ماہ بعد دوسرے بچے کی فرمائش کی برکت نے کہا۔ "اتنی جلدی مناسب نہیں ہے۔ خاندانی منصوبہ بندی اچھی چیز ہے۔"

وہ ضد کرتی تھی یہ انکار کرتا تھا۔ بچے کیسے پیدا کیے جاتے ہیں' یہ عورتیں ہی جانتی ہیں۔ وہ جب چاہتی ہیں' احتیاطی تدابیر کے باوجود ماں بن جاتی ہیں۔ بانو نے چند ماہ تک خاندانی منصوبہ بندی کو بھی برداشت کیا۔ پہلے بیٹے کی پیدائش کے پانچ ماہ بعد برکت یہ سن کر حیران رہ گیا کہ بانو کے پاؤں بھاری ہیں۔ اس نے پوچھا۔ "یہ کیسے ہوگیا؟"

وہ بولی۔ "میں کیا بتاؤں؟ اللہ تعالیٰ کی مرضی میں کوئی دخل نہیں دے سکتا۔"

دو برس بعد وہ دوسرے بیٹے کا باپ بن گیا۔ اس نے بیس برس کی عمر میں شادی

کی تھی' بانو نے اسے تین برس میں تین بچوں کا باپ بنادیا' تیسری بار بیٹی ہوئی۔ بانو نے کہا۔ "اب تم بیٹی والے ہو گئے ہو۔ باہر کی مصروفیات کم کرو' ایک شریف اور سنجیدہ باپ باہر کسی لڑکی کو دیکھتا ہے تو اپنی بیٹی ضرور یاد آتی ہے۔"

"کیا بکواس کرتی ہو' باہر آوارہ لڑکیاں بھی ہوتی ہیں' کیا میں انہیں بھی بیٹیاں سمجھ لوں؟ تم عورتیں چار دیواری میں بیٹھ کر مردوں کو مات دینے والی سیاست کرتی ہو۔ مجھے وقت سے پہلے بڑھاپے کا احساس دلاؤ گی تو میں بوڑھا نہیں ہو جاؤں گا۔ میں پہلوان ہوں' سدا بہار ہوں تم اپنے بڑھاپے کا حساب کرو۔"

آدمی صبح کو سمجھتا ہے کہ شام ہوگئی۔ زندگی کی سانس لیتے ہوئے یقین رکھتا ہے کہ موت ضرور آئے گی لیکن جوانی میں کبھی یقین نہیں کرتا کہ وہ کبھی بوڑھا ہوگا۔ اس نے دودھ سے بھرا ہوا شیشے کا گلاس اٹھایا پھر اسے بانو کے سامنے لاکر صرف پانچ انگلیوں کے شکنجے میں دبا کر توڑ دیا۔ اس کے بعد کہا۔ "یہ پہلوان کی جوانی ہے تیری بددعاؤں سے نہیں جائے گی۔ یہ میری کوششوں سے قائم رہے گی۔"

اس کی کوششیں بتاتی تھیں کہ وہ شاید جوانی کے بعد بھی جوان رہے گا۔ وہ ہمیشہ کی طرح صبح منہ اندھیرے اٹھتا تھا۔ کم سے کم دو میل کی دوڑ لگاتا تھا۔ معمول کے مطابق ورزش کرتا تھا۔ ڈٹ کر کھاتا تھا۔ صرف اچھی سے اچھی خوراک کھانے سے بات نہیں بنتی' وہ تمام فکروں کو بھی کھا جایا کرتا تھا۔ اسی لئے جوانی کے پہلے دن کی طرح تروتازہ دکھائی دیتا تھا۔ ہمیشہ جوان رہنے کا دوسرا راز یہ تھا کہ وہ ہوس پرست نہیں تھا۔ لڑکیاں اس پر مرتی تھیں' وہ لڑکیوں پر نہیں مرتا تھا۔

گھر سے باہر اسی امیرزادی سے عارضی تعلقات تھے جس نے امام دین کے خلاف بھڑکایا تھا۔ اس کی غلامی سے نجات کا راستہ دکھایا تھا اور اسے سمجھایا تھا۔ "ہم کسی غرض کے بغیر ایک دوسرے سے چھوٹی چھوٹی نیکیاں کرلیتے ہیں لیکن ہر بڑی نیکی کے پیچھے کوئی غرض چھپی ہوتی ہے خصوصاً طویل المیعاد نیکی کسی خاص مقصد کے بغیر نہیں کی جاتی۔"

اس نے پوچھا تھا۔ "تم بھی مجھ پر پچھلے دو ماہ سے مہربان ہو' تمہارا کیا مقصد ہے؟"

"تم نے میری سہیلیوں کے مقابلے میں مجھے پسند کیا ہے۔ جب میں نے دیکھا' تم

مجھے ترجیح دے رہے ہو تو میں بھی تم پر مہربان ہو گئی۔ تمہیں یہ سن کر افسوس ہو گا کہ یہ مہربانی ایک ہفتے بعد ختم ہو جائے گی۔ میری ممی اور ڈیڈی لندن سے واپس آ رہے ہیں۔"

"واپس آنے سے کیا ہوتا ہے۔ ہم کہیں دوسری جگہ مل سکتے ہیں۔"

"سوری! میری شادی ہونے والی ہے۔ ایک ہفتے بعد میری طرف رخ نہ کرنا۔"

ایک ہفتے بعد اس سے تعلقات ختم ہو گئے۔ کوئی دو ہفتے بعد اس کی ایک سہیلی سے ملاقات ہوئی۔ وہ بولی۔ "پہلے میں تمہارے گیراج میں آئی تھی۔ میں نے اپنی سہیلیوں سے تمہارا تعارف کرایا تھا اور تم مجھے چھوڑ کر روزینہ کے پھیر میں آ گئے۔ جانتے ہو میری کتنی انسلٹ ہوئی ہے؟"

"اس میں انسلٹ کی کیا بات ہے؟"

"تم میری دریافت ہو کوئی دوسری تمہیں لے جائے گی تو کیا میری توہین نہیں ہو گی۔ ہم پانچ سہیلیاں ہیں۔ ہماری ہابی ہے کہ ہم کسی بڑی بات پر بڑی رقم لگاتے ہیں۔ تم سے پہلے بھی دو بار شرطیں لگا چکے ہیں۔ ایک بار میں نے دوسری بار شیبا نے شرط جیتی۔ اس بار تم نے روزینہ کو وِن کرا دیا۔"

"یہ شرط والی بات سمجھ میں نہیں آئی۔"

وہ بولی۔ "کوئی خوبرو جوان ہم پانچوں کو پسند آ جائے تو وہ ہم سب کے لئے چیلنج بن جاتا ہے کہ ہم میں سے کون اسے اپنی طرف مائل کرے گا؟ اسے بہت بڑا چیلنج بنانے کے لئے ایک لاکھ روپے کی شرط لگائی جاتی ہے۔ ہر لڑکی بیس بیس ہزار دیتی ہے۔ ہمارا آپس میں کوئی جھگڑا نہیں ہوتا ہم اپنے اپنے طور پر اس نوجوان کو اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔"

"یہ تو بے حیائی ہے۔"

"روزینہ کے ساتھ وقت گزارتے وقت تمہیں بے حیائی کا خیال نہیں آیا؟"

"میں سمجھ رہا تھا' وہ محبت کرتی ہے۔ مگر یہ تو مشغلہ ہے۔"

"کیا یہ تمہارا مشغلہ نہیں ہے کہ گھر میں بیوی ہے اور تم روزینہ سے دل بہلانے آتے ہو۔"

وہ جواب نہ دے سکا۔ وہ بولی۔ "ہمارے باپ دادا ہمیشہ سے کاروباری رہے ہیں۔ ہم نے کاروباری ماحول میں آنکھیں کھولی ہیں۔ جو بھی مشغلہ اختیار کرتے ہیں' اس میں بھی منافع دیکھتے ہیں۔ میں نے تمہاری وجہ سے بیس ہزار کا نقصان اٹھایا مگر تم سے پہلے ایک لاکھ جیت چکی ہوں۔ روزینہ نے تمہیں دو ماہ اپنے پاس رکھ کر ایک لاکھ کا منافع حاصل کیا ہے۔"

برکت علی کا دماغ روشن ہو گیا۔ روزینہ کا بیان کردہ یہ نکتہ سمجھ میں آ گیا کہ بڑی نیکی یا بڑی مہربانی کے پیچھے کوئی غرض چھپی ہوتی ہے۔ وہ سمجھ رہا تھا حسن و شباب کی سوغات مل رہی ہے جب کہ وہ اس کی ذات سے ایک لاکھ روپے کشید کر رہی تھی۔ بڑے گھروں کے بچے ایسے مشغلے اختیار کرتے ہیں' وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ حالات اور تجربات بہت کچھ سمجھا اور سکھا دیتے ہیں۔

اس واقعے کے بعد وہ ہر لفٹ لینے والی لڑکی کو ویسی ہی سمجھنے لگا۔ جب کہ پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔ پورا طبقہ یا پوری برادری غلط نہیں ہوتی۔ اگر ہوتی تو پوری دنیا غلط ہو جاتی۔ ایسی باتیں رفتہ رفتہ سمجھ میں آتی ہیں۔

اس نے اپنا ایک گیراج اور بہت بڑا شو روم قائم کر لیا تھا۔ بہترین کنڈیشن کی گاڑیاں ضرورت مندوں سے اونے پونے خریدتا تھا اور دوسرے ضرورت مندوں کو کھری قیمت پر فروخت کرتا تھا۔ اسے ہر کام اور مقصد کے لئے خود غرض بننا آ گیا تھا۔

انہی دنوں اس نے اخبار میں ایک کار کی فروخت کا اشتہار پڑھا۔ پتا چلا' وہ کار فروخت کرنے والا شہر کے بڑے سرمایہ داروں میں سے ایک ہے۔ سال چھ مہینے میں نئی گاڑیاں خریدتا ہے اور پرانی گاڑیاں فروخت کر دیتا ہے۔ برکت علی نے فون کے ذریعے ملاقات کا وقت مقرر کیا۔ پھر وہاں مقررہ وقت پر پہنچ گیا۔

وہ کوٹھی بہت شاندار تھی۔ کسی بادشاہ کا محل دکھائی دیتی تھی باوردی ملازم اور سکیورٹی گارڈ نظر آ رہے تھے۔ وہاں ایک سیکریٹری نما شخص آنکھوں پر عینک لگائے ڈیلروں سے باتیں کر رہا تھا۔ فروخت ہونے والی کار انیکسی کے سامنے کھڑی تھی۔ بالکل نئے ماڈل کی تھی۔ اگلے حصے میں ہلکا سا ڈینٹ پڑ گیا تھا۔ سیکریٹری نما شخص کہہ رہا تھا۔ "ابھی چھ ماہ پہلے ساڑھے پانچ لاکھ میں خریدی گئی تھی۔ ڈرائیور کی غلطی سے یہ ڈینٹ پڑ گیا ہے۔ جو دور سے نظر نہیں آتا لیکن بے بی نادرہ کو ہلکا سا نقص بھی پسند نہیں

ہے لہٰذا اسے فروخت کیا جارہا ہے۔"

اس کی باتوں کے دوران ایک نوجوان لڑکی کوٹھی سے باہر آئی اسے دیکھتے ہی سکیورٹی گارڈز الرٹ ہوگئے۔ ایک ملازم نے ایک نئی کار کا دروازہ کھولا۔ وہ اسٹیرنگ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ کار اسٹارٹ کرکے تیزی سے ڈرائیو کرتی ہوئی انیکسی کے سامنے زوردار بریک لگا کر رک گئی پھر کھڑکی سے سر نکال کر بولی۔ "یہ بھیڑ کیوں لگی ہے؟"

سیکریٹری نے جلدی سے آگے بڑھ کر ادب سے کہا۔ "یہ لوگ کار خریدنے آئے ہیں۔"

وہ ناگواری سے بولی۔ "وھاٹ نان سینس۔ یہ میری کوٹھی ہے یا خرید و فروخت کی دکان؟ تم سے کس نے کہا تھا کہ خریداروں کو یہاں بلاؤ؟"

"جی۔ جی۔ بڑے صاحب نے حکم دیا تھا کہ یہ کار........."

"نو آرگومنٹس۔ اس کار کو باہر لے جاکر پھینکو۔ یہاں سے بھیڑ ہٹاؤ۔"

برکت نے آگے بڑھ کر کہا۔ "بے شک! اتنی عالیشان کوٹھی کے احاطے میں یہ کھٹارا کار بدنما دھبا لگتی ہے۔ اسے باہر پھینک دینا چاہئے۔"

"کیا؟" وہ غصے سے دروازہ کھول کر باہر آئی۔ "تم ساڑھے پانچ لاکھ کی گاڑی کو کھٹارا کہہ رہے ہو۔ کبھی ایسی گاڑی میں بیٹھنا نصیب ہوا ہے؟"

"اللہ نہ کرے کہ نصیب ہو۔ یہ میرا مزاج ہے کسی بھی چیز میں ہلکا سا نقص پیدا ہوجائے تو میں اسے کھٹارا سمجھنے لگتا ہوں۔"

اس نے گھور کر برکت کو دیکھا پھر ناگواری سے پوچھا۔ "ناقص مال خریدنے کیوں آئے ہو؟"

وہ بولا۔ "میں ہنرمند ہوں۔ گاڑیوں کی مرمت کرکے ان کی خوبصورتی واپس لاتا ہوں اور ان پر سے کھٹارا کا لیبل ہٹا دیتا ہوں۔"

سیکریٹری نے کہا۔ "اے مسٹر! پیچھے ہٹو۔ بے بی کے سامنے ادب سے بات کرو۔ ورنہ سکیورٹی گارڈز تمہیں اٹھا کر باہر پھینک دیں گے۔"

وہ مکا دکھاتے ہوئے بولا۔ "میں نے کوئی بے ادبی نہیں کی ہے، خواہ مخواہ دھمکیاں دو گے تو تمہارے جتنے گارڈز ہیں ان سب کے چہروں پر ڈینٹ پڑ جائیں

گے۔"

ایک ڈیلر نے کہا۔ "یہ مسٹر برکت علی ریسلر ہیں۔ معلوم ہوتا ہے، تم نے کبھی ٹی وی پر ان کی فری اسٹائل کشتی نہیں دیکھی ہے۔ یہ اب تک چار انٹرنیشنل پہلوانوں کو شکست دے چکے ہیں۔"

بے بی نادرہ نے کہا۔ "مائی گڈنس! مجھے یاد آرہا ہے میں نے تمہیں لڑتے ہوئے دیکھا ہے۔ تم پہلوان ہو یا کار ڈیلر؟"

میں ڈیلر اور مکینک ہوں، بگڑی ہوئی چیزوں کو بناتا ہوں۔ کوئی چیلنج کرے تو اسے بگاڑ کر رکھ دیتا ہوں۔"

بے بی نادرہ نے کار میں بیٹھ کر دروازہ بند کیا۔ اسے ڈرائیو کرتی ہوئی مین گیٹ کے پاس آئی پھر گیٹ پر کھڑے ہوئے گارڈ سے کہا۔ "سیکریٹری کو بلاؤ۔"

گارڈ نے آواز دی سیکریٹری دوڑتا ہوا آیا۔ وہ بولی۔ "مسٹر برکت کا پتا اور فون نمبر نوٹ کرو اور گاڑی اس کے حوالے کردو۔"

"جی بہت اچھا۔ مگر گاڑی کی قیمت ساڑھے چار لاکھ تک پہنچ گئی ہے۔"

"گاڑی فروخت نہیں ہوگی۔ جو کہہ رہی ہوں وہ کرو۔"

یہ کہتے ہی وہ تیزی سے کار ڈرائیو کرتی ہوئی وہاں سے مین روٹ پر آئی۔ پھر سہولت سے کار چلاتی ہوئی برکت کے متعلق سوچنے لگی۔ اس نے ریسلنگ کے تین پروگراموں میں اسے دیکھا تھا۔ اپنی کوٹھی کے احاطے میں اسے دیکھ کر یقین نہیں آیا کہ یہ وہی ہے۔ چٹان جیسا کشادہ سینا، چیتے کی طرح پتلی کمر اور پہلوانی بازوؤں کی ابھرتی ہوئی مچھلیاں دیکھ کر سوچتی تھی، اس کبرو جوان کے اندر کتنی قوت ہے، یہ بڑے بڑے پہلوانوں کو دبوچ کر اٹھنے نہیں دیتا ہے۔ اس کی گھر والی کیا کرتی ہوگی؟"

ایسی سوچ دماغ میں آتے ہی وہ گڑبڑا جاتی تھی۔ اسے دماغ سے نکال دیتی تھی یا پھر سوچتی تھی۔ اونہہ! بس پہلوان ہے، خوبرو ہے تو کیا ہوا تعلیم یافتہ نہیں ہے۔ ٹی وی پر ایک انٹرویو کے دوران وہ اردو بول رہا تھا اور اس کا سیکریٹری انگریزی میں ترجمہ کرتا جارہا تھا۔

آج اسے دیکھ کر معلوم ہوا، وہ ڈیلر اور مکینک ہے یعنی مزدوری کرتا ہے۔ بزنس کلاس سے نہیں ہے۔ اونچی سوسائٹی کا پروردہ نہیں ہے۔ بس یونہی ہے۔ اب

دیکھنا ہے' وہ گاڑی لے جا کر کیا کرے گا۔

اس نے شام کو کوٹھی کے احاطے سے واپس آکر دیکھا گاڑی کھڑی ہوئی تھی۔ وہ اسے نہیں لے گیا تھا۔ نادرہ نے سوچا تھا' وہ چھوٹی طبیعت کا لالچی انسان ہو گا تو کسی سودے کے بغیر گاڑی کو مفت کا مال سمجھ کر لے جائے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس نے سیکریٹری سے پوچھا۔ "کیا بات ہے' تم نے اسے گاڑی نہیں دی؟"

"میں نے دی تھی۔ وہ لے گیا تھا پھر تین گھنٹے بعد واپس لے آیا بہت ہی باکمال کاریگر ہے۔ آپ ملاحظہ فرمائیں۔ گاڑی کا ڈینٹ نظر نہیں آرہا ہے۔ پتا ہی نہیں چلتا کہ اس میں کوئی خرابی پیدا ہوئی تھی۔"

اس نے گاڑی کے قریب آکر ہاتھ سے چھو کر بار بار دیکھا واقعی یہ ہنرمندی کا کمال تھا۔ وہ ہلکا سا نقص ذرا بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ اس کی مرمت کرنے کا بھی کوئی نشان نہیں تھا۔ اس نے سیکرٹری سے پوچھا۔ "کیا اس نے بل دیا ہے؟"

"جی نہیں۔ وہ ملازم کے ساتھ اپنی گاڑی لے کر آیا تھا۔ ہماری گاڑی چھوڑ کر اپنی کار میں چلا گیا۔ یہ اس کا کارڈ ہے۔"

وہ کارڈ لے کر کوٹھی کے اندر آئی۔ باپ نے اسے دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہیلو بے بی! تم نے گاڑی دیکھی۔ وہ اے ون کاریگر ہے۔"

ماں نے کہا۔ "سنا ہے' تم نے گاڑی اسے یونہی دے دی تھی۔"

"یونہی کا مطلب کیا ہوا ممی؟ کیا وہ کاغذات کے بغیر ہماری گاڑی کا مالک بن جاتا؟"

باپ نے ہنستے ہوئے کہا۔ "آخر میری بیٹی ہے کوئی فائدہ سوچ کر ہی دی ہو گی۔"

وہ بولی۔ "پاپا! آپ نے کہا تھا' مجھے خوب سوچ سمجھ کر ایسا لائف پارٹنر پسند کرنا چاہئے جو میرا احسان مند رہے اور باڈی گارڈ کی طرح میری حفاظت کرتا رہے۔"

"یس آف کورس۔ مگر ابھی تم سترہ برس کی ہو۔ جیون ساتھی کے انتخاب میں جلدی نہ کرنا۔ چار برس اور گزرنے دو تمہارا مشاہدہ تجربہ اور معقول فیصلے کی قوت بڑھتی جائے گی۔"

"اوکے پاپا!" وہ اپنے بیڈ روم میں آگئی۔ آرام سے صوفے پر بیٹھ کر برکت علی کے کارڈ کو پڑھا۔ پھر برا سا منہ بنا کر بولی۔ "برکت کیسا پرانا اور نچلے طبقے کے لوگوں کا

نام ہوتا ہے۔ اگر برکت علی جیٹھانی یا برکت علی جیولرز یا برکت علی ناریل والا یا موتی والا ہوتا تو اپنی برابری اور طبقے کا انسان معلوم ہوتا۔ نان سینس میں تو ایسے سوچ رہی ہوں جیسے اس نام سے، مجھے کچھ لینا ہے۔"

اس نے فون کو اپنے قریب کیا پھر ریسیور اٹھا کر کارڈ پر لکھے ہوئے نمبر ڈائل کرنے لگی۔ دوسری طرف رابطہ قائم ہوتے ہی برکت کی آواز سنائی دی۔ "ہیلو' یہ بی بی موٹرز ہے۔"

نادرہ نے پوچھا۔ "بی بی کا مطلب کیا ہوا؟"

"بابو برکت۔ میرا نام بابو برکت علی ہے۔ اگر میرے کان دھوکا نہیں کھا رہے ہیں تو تم بے بی نادرہ ہو۔"

"بڑی زبردست یادداشت ہے۔ مختصر سی ملاقات میں آواز اور لہجہ یاد کر لیتے ہو۔"

"تعریف کا شکریہ' تم نے کار دیکھی؟ کام پسند آیا؟"

"تم نے بل کیوں نہیں دیا؟"

"تم نے کار دی تھی۔ کام نہیں بتایا تھا۔ میں نے اپنی مرضی سے کام کیا ہے۔ ایسے میں بل کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔"

"اس مہربانی کے پیچھے کوئی مقصد ضرور ہو گا۔"

"ہاں۔ تم اس قدر پیاری اور من موہنی ہو کہ اس بہانے دوسری بار ملنا چاہتا ہوں۔"

"دل نہیں' عقل کی بات کرو اور مقصد بتاؤ۔"

"میں نے سنا ہے' تم کوئی گاڑی مشکل سے سال بھر چلاتی ہو پھر اسے فروخت کر دیتی ہو۔ میں چاہتا ہوں تمہاری تمام گاڑیوں کی خرید و فروخت میرے ذریعے ہوتی رہے۔"

"یہ ہوئی کاروباری بات۔ میں تمہاری صاف گوئی سے خوش ہوں۔ میں اس سلسلے میں پاپا سے تمہاری ملاقات کرا دوں گی۔"

وہ یہ باتیں جان بوجھ کر انگریزی زبان میں کہہ رہی تھی اس نے کہا۔ "بڑی مہربانی ہو گی۔ یہی بات مادری زبان میں کہہ دو۔"

"اس کا مطلب ہے تم انگریزی نہیں جانتے۔ تمہاری تعلیم کیا ہے؟"
"اردو اخبار پڑھ لیتا ہوں اور چیک پر انگریزی میں دستخط کرلیتا ہوں۔"
"کیا تمہیں شرمندگی نہیں ہوتی؟"
"ہوتی ہے مگر میں مجبور ہوں۔ بچپن میں والدین کا انتقال ہوگیا۔ کوئی تعلیم دلانے والا نہیں تھا۔ اب روزگار میں الجھا ہوا ہوں تعلیم حاصل کرنے کی فرصت نہیں ملتی۔"

وہ بولی۔ "پھر تو مجھے افسوس ہے، تم سے کاروباری تعلقات نہیں ہوسکیں گے۔"

"کیوں نہیں ہوسکیں گے۔ ہم پاکستان میں ہیں، یہاں اردو زبان میں کاروبار ہوسکتا ہے۔ میں کسی انگریز سے نہیں تم سے یا تمہارے پاپا سے بزنس کرنا چاہتا ہوں۔"
"ابھی تم دل کی بات کررہے تھے۔ میں یہ بات انگریزی میں سننا چاہوں گی، ایسے میں تم کیا کروگے؟"
"میں آج ہی سے یہ زبان سیکھنا شروع کردوں گا۔"
"میں آج ہی تمہاری بات پاپا سے کروں گی۔ کل صبح آؤ ضروری معاملات طے ہوجائیں گے۔"
"صبح پانچ بجے ہوتی ہے۔"
وہ ہنستے ہوئے بولی۔ "تو پانچ بجے آجاؤ۔ بائی دی وے ہمارے ہاں دس بجے تک صبح ہی رہتی ہے۔"
"ٹھیک ہے، دس بجے آؤں گا۔"
فون کا رابطہ ختم ہوگیا۔ برکت نے ریسیور رکھتے ہوئے سوچا۔ یہ بھی پہلی ملاقات میں دل کی بات پر اعتراض نہیں کررہی ہے۔ انگریزی زبان میں عشق کرنا چاہتی ہے۔ یہ زبان سیکھنے میں کافی عرصہ لگے گا۔ اتنے عرصے تک یا نہ معلوم کتنے عرصے تک اس کی مہربانیاں جاری رہیں گی۔ یہ بھی کوئی چکر چلاتی رہے گی۔ بزنس مین باپ کی بیٹی ہے۔ نہ جانے کس قسم کے مفادات میری ذات سے حاصل کرتی رہے گی۔ ویسے مجھے اپنے مقصد اور منافع پر نظر رکھنی چاہئے۔
وہ دوسرے دن دس بجے اس کوٹھی میں آیا۔ ملازم نے اسے ڈرائنگ روم

میں بٹھایا اور کہا۔ "بے بی صاحبہ آرہی ہیں۔"
وہ اس کی آمد کا مژدہ سنا کر چلا گیا۔ برکت وہاں کے قیمتی آرائشی سامان کو دیکھنے لگا۔ یہ ایک عجیب اور دلچسپ حقیقت تھی کہ وہ آج تک جتنی عالی شان کوٹھیوں میں داخل ہوا تھا، ان کا دروازہ وہاں کی امیر زادیوں نے کھولا تھا۔ مردانہ وجاہت اور شخصیت امریکن ڈالر کی طرح ہوتی ہے جو ہر ملک ہر شہر، ہر گلی اور ہر گھر میں کیش ہوتی رہتی ہے۔
دس منٹ گزر گئے، وہ نہیں آئی۔ وہ سینٹر ٹیبل پر سے ایک رسالہ اٹھاکر ورق گردانی کرنے لگا۔ بہار پر شباب آئے اور آتے آتے رہ جائے تو تڑپ اور بے چینی بڑھنے لگتی ہے۔ آنے والی کی قدر و قیمت میں اضافہ ہونے لگتا ہے۔ اس نے رسالے سے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ ہال نما وسیع و عریض ڈرائنگ روم میں وہ اکیلا تھا۔ کہیں سے پازیب کی چھم چھم سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اس نے اور دس منٹ انتظار کیا پھر اٹھ کر ٹہلنا چاہتا تھا کہ اسی وقت چائے آگئی۔
جس کا انتظار ہوتا ہے، وہ نہیں آتی کوئی اور آجاتی ہے۔ اس کی ممی آگئی۔ وہ مسکرا کر کھڑا ہوگیا۔ ممی نے سامنے آکر اسے سر سے پاؤں تک گھورتے ہوئے دیکھا پھر اونہہ کے انداز میں منہ پھیر کر چلی گئی۔ وہ کھڑا سوچتا رہ گیا کہ بیٹھنا چاہئے یا کھسک جانا چاہئے۔ شاید وہ کھسک جاتا، ایسے وقت وہ آگئی۔ ہنستے ہوئے بولی۔ "سوری، مجھے ذرا دیر ہوگئی۔"
اب یہ بحث ضروری نہیں تھی کہ آتے آتے قیامت کا انتظار کرایا ہے۔ یہی غنیمت تھا کہ آگئی تھی۔ وہ سامنے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ "تم نے چائے نہیں لی؟"
"اکیلا آدمی کھاتے پیتے اچھا نہیں لگتا۔"
اس نے چائے کی دو پیالیاں تیار کیں۔ ایک اسے دی پھر بولی۔ "پاپا کسی کام سے گئے ہیں۔ پتا نہیں کب آئیں گے۔ ان سے پھر کبھی ملاؤں گی۔"
"کوئی بات نہیں، تم سے مل رہا ہوں یہی کافی ہے۔"
وہ اس سے طرح طرح کے سوالات کرنے لگی۔ مثلاً کار ڈیننگ کب سے کررہے ہو؟ مستقبل میں تمہارے عزائم کیا ہیں؟ کیا تمہاری شادی ہوچکی ہے؟ اس

نے جواب دیا۔ "شادی بھی ہو گئی' بچے بھی ہو گئے ہیں۔"

نادرہ کے ہونٹوں سے مسکراہٹ بجھ گئی۔ وہ بڑی دیر تک کچھ بول نہ سکی۔ وہ بولتا رہا۔ "میں نے بچپن کا وعدہ وفا کیا ہے۔ اپنے ایک محسن کی بیٹی سے شادی کی ہے۔ مجھے اتنی جلدی شادی نہیں کرنی چاہئے تھی۔ ابھی میری پہلوانی اور فتح عروج پر ہے لیکن بانو مجھ سے کوئی دس برس بڑی ہے۔ اس کی عمر کو دیکھتے ہوئے شادی کرنی پڑی۔"

نادرہ نے بڑی دیر کی خاموشی کے بعد حیرانی سے پوچھا۔ "تم سے دس برس بڑی ہے اور تم نے شادی کرلی؟"

"میں زبان کا دھنی ہو۔ جان دے کر بھی قول پورا کرتا ہوں۔"

نادرہ نے دل ہی دل میں کہا۔ "پھر تو بڑے احمق ہو تمہاری شخصیت کا یہ پہلو مجھے پسند ہے۔ تم میرے پاس آتے جاتے یا تو قول توڑنا سیکھ لوگے یا پھر مجھے دیئے ہوئے قول کے ہمیشہ پابند رہو گے۔"

برکت نے کہا۔ "تم کسی سوچ میں گم ہو گئی ہو۔"

وہ چونکنے کے انداز میں بولی۔ "ہاں' میں نے تمہیں پہلی بار ٹی وی سکرین پر دیکھا تھا اور یہ رائے قائم کی تھی کہ تمہیں آگے بڑھانے والا ایک ہاتھ مل جائے تو تم دولت' عزت اور شہرت کی بلندیوں کو چھو لوگے۔ مگر تم نے بیوی بچوں کی زنجیریں پہن لی ہیں۔"

اس نے پوچھا۔ "بیوی بچوں سے کیا فرق پڑتا ہے۔ دنیا کے ٹاپ کے بزنس مین بیوی بچوں والے ہوتے ہیں۔"

"وہ پہلے ٹاپ پر پہنچتے ہیں پھر شادی کرتے ہیں۔ کچھ لوگ ایسے ہیں جنہیں بلندی تک جانے کے لئے کسی کے تعاون کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ مگر تمہیں کسی کے بھرپور تعاون کی ضرورت ہے۔"

"مجھے یہ تعاون کیسے حاصل ہو سکتا ہے؟"

"تم جان دے کر بھی قول پورا کرتے ہو۔ جو ایک ہی قول میں اٹک جائے' وہ آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اگر تم سے کہا جائے' بیوی بچوں سے نجات حاصل کرلو اور صرف کاروبار میں لگ جاؤ تو تم کیا کرو گے؟"

"میں بیوی بچوں پر ظلم نہیں کروں گا۔"

"اگر کہا جائے' تعلقات ختم نہ کرو صرف رابطہ ختم کردو۔ ان کی ضرورت کے مطابق معقول رقم بھیجتے رہو۔ بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلاتے رہو۔ ان کے لئے معقول حد تک جائیداد خریدتے رہو تو یہ ظلم نہیں ہو گا۔"

"ان سے رابطہ کیوں ختم کیا جائے؟"

"میں مزید وضاحت نہیں کرسکتی۔ جو بات میری سمجھ میں آئی' وہ میں نے کہہ دی۔ تمہارے لئے سوچنے سمجھنے اور فیصلہ کرنے کا وقت ہے لیکن بہت کم وقت ہے۔ باہر وہی گاڑی ہے جس کی تم نے مرمت کی ہے' اسے لے جاؤ اور اچھے داموں فروخت کردو۔ تمہیں میرا نہیں' پاپا کا دل جیتنا ہے۔ اب میں آرام کروں گی۔"

وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ "کل ملاقات ہو گی؟"

"جب تک بلندیوں کو چھونے کا معقول فیصلہ نہیں کرو گے' میں تم سے نہیں ملوں گی۔"

"تم نے بڑی الجھن میں ڈال دیا ہے۔ پھر بھی کل اپنا فیصلہ ضرور سناؤں گا۔ اس کے لئے جتنی دیر کروں گا' اتنا ہی تمہارے دیدار سے محروم رہوں گا۔"

وہ اپنی مسکراہٹ کو چھپا نہ سکی۔ برکت اس کی چاہت کے اظہار میں اسی وقت فیصلہ سنا چکا تھا۔ نادرہ جو چاہتی تھی' اس کے لئے وہ اندر ہی اندر آمادہ ہو چکا تھا۔ وہ نادان نہیں تھا' یہ جانتا تھا کہ روزینہ کی طرح اور بھی لڑکیاں اس کی زندگی میں آئیں گی اور پتا نہیں اسے کتنی دور تک بہا کرلے جائیں گی۔ اسی لئے اس نے بانو سے پکے کاغذ پر لکھوا لیا تھا۔ وہ گھر سے باہر کسی معاملے میں مداخلت نہیں کرسکتی تھی۔ اسے جس حال میں رکھا جاتا' وہ اسی حال میں زندگی گزار لیتی۔ پھر وہ بے حس اور بے مروت نہیں تھا۔ اپنے بچوں سے بہت پیار کرتا تھا اور پیار کا تقاضا تھا کہ ان کے بہترین مستقبل کے لئے ایک طویل عرصے تک ان سے دور رہے۔

اس نے دوسرے دن اپنا فیصلہ سنا کر نادرہ کا دل جیت لیا لیکن میدان جیتنے کے لئے نئی مشکلات سامنے آئیں۔ نادرہ کے والدین نے برکت کی شدت سے مخالفت کی۔ باپ نے کہا۔ "بے بی! مجھے تمہاری کاروباری ذہانت پر بڑا ناز تھا تم نے ایک بیوی بچوں والے کو پسند کرکے مجھے بہت مایوس کیا ہے۔"

"پاپا! آپ اس کے بیوی بچوں کو بھول جائیں' ان کی موجودگی نہ ہونے کے

برابر ہوگی۔ مجھے برکت کی سچائی اور وفاداری نے متاثر کیا ہے۔ وہ ہمیشہ میرا وفادار رہے گا۔ میں رفتہ رفتہ سوکن اور سوتیلے بچوں کا کانٹا نکال کر پھینک دوں گی۔"

ماں نے غصے سے کہا۔ "میں پوچھتی ہوں' آخر اس میں خوبی کیا ہے؟"

"یہی سوال میں کروں گی کہ اس میں خرابی کیا ہے؟"

باپ نے کہا۔ "بہت سی خرابیاں ہیں۔ وہ بہت چھوٹے طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کا کوئی فیملی بیک گراؤنڈ نہیں ہے۔ کوئی ذات برادری نہیں ہے۔ کوئی سماجی مرتبہ نہیں ہے۔ تم ایک کچی عمر اور کچے ذہن کی لڑکی ہو۔ اس کی مردانہ وجاہت اور قد وقامت کو دیکھ کر متاثر ہوگئی ہو مگر ہم کچھ نہیں اپنی آنکھوں کے سامنے تمہیں گڑھے میں گرنے نہیں دیں گے۔"

"پاپا! میرے ذہن میں ایک زبردست پلاننگ ہے۔ میں بہت جلد اسے اپنی سطح پر لے آؤں گی۔"

"بحث نہ کرو' صاف اور سیدھی بات یہ ہے کہ ابھی تمہاری فیصلہ کرنے کی عمر نہیں ہے۔ انیس برس کی ہو جاؤ گی تو تمہاری باتیں سنوں گا۔ تب تک برکت سے دور رہو۔ مجھے خوشی ہے کہ تم نے کبھی کسی کو بوائے فرینڈ نہیں بنایا۔ مجھے یقین ہے' تم برکت سے بھی کوئی رابطہ نہیں رکھو گی۔"

باپ یہ کہہ کر باہر چلا گیا تاکہ بیٹی کو مزید بحث کا موقع نہ ملے۔ بیٹی بھی ضدی تھی۔ ماں باپ کے پیچھے پڑ گئی۔ تقریباً ایک ہفتے تک بحث چلتی رہی۔ اس نے برکت کی خاطر بھوک ہڑتال کی دھمکی دی۔ باپ نے کہا۔ "میں تمہیں جان سے زیادہ چاہتا ہوں۔ ایک وقت بھی فاقہ کرتے دیکھوں گا تو زہر کھا کر مرجاؤں گا۔ یہ دیکھو زہر کی شیشی' تمہاری مسلسل ضد اور ہٹ دھرمی کو دیکھ کر میں پچھلے دو دنوں سے اسے جیب میں لئے گھومتا ہوں اور تم جانتی ہو' میرا ارادہ کتنا اٹل ہوتا ہے۔"

وہ بھوک ہڑتال سے باز آگئی۔ باپ نے کہا۔ "مجھے زندہ دیکھنا چاہتی ہو تو لندن جانے کی تیاری کرو۔ تم مستقل وہاں رہو گی اور اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھو گی۔"

"میں سمجھ رہی ہوں' آپ مجھے یہاں سے بھگا رہے ہیں۔ تاکہ میرا موجودہ فیصلہ رفتہ رفتہ کمزور پڑ جائے۔"

"تم کچھ بھی سمجھو' اگر شام تک تم نے لندن میں رہائش اختیار کرنے کا فیصلہ نہ

کیا تو صبح میری لاش دیکھو گی۔"

وہ مجبور ہوگئی۔ وہ اس کا آئیڈیل باپ تھا۔ اسے کانٹا چبھتا تھا تو یہ رو دیتی تھی اس لئے باپ کی محبت کی خاطر جانے پر راضی ہوگئی۔ سفر کی شاپنگ کے لئے کار لے کر نکلی پھر برکت کے پاس پہنچ گئی۔ اس نے پوچھا۔ "کیا ابھی تک گول میز کانفرنس جاری ہے؟"

"ہاں' پاپا نے تم سے دور کرنے کے لئے مجھے لندن جانے کا حکم دیا ہے۔"

"اور تم جا رہی ہو؟"

"میں بتا چکی ہوں' مجھے پاپا سے کتنا پیار ہے' میں جاؤں گی لیکن تم سے دور نہیں رہوں گی تم بھی لندن میں رہو گے۔"

"کیا کہہ رہی ہو؟ یہاں میرے کاروبار کا کیا ہوگا؟"

"کاروبار منیجر اور ملازمین سنبھالتے ہیں مالک محض ان کی نگرانی کرتا ہے اور احکامات صادر کرتا ہے۔ تم مہینے دو مہینے میں آکر یہاں کی ذمے داریاں پوری کرسکتے ہو پھر کسی امپورٹ لائسنس کے بغیر تم وہاں سے نئی کاریں اپنے شوروم میں لا سکتے ہو۔"

برکت بھی امپورٹ لائسنس کے بغیر ایسا دھندا جانتا تھا یورپ کے کار ڈیلروں سے مل کر ہر ماہ دو ماہ میں کسی پاکستانی کو گفٹ کے بہانے کار دلائی جاسکتی ہے۔ گفٹ کاریں یہاں آتے ہی اچھے داموں فروخت کردی جاتی ہیں۔ برکت کے پاس پہلے ایسے ذرائع نہیں تھے۔ اب وہ نادرہ کے تعاون سے ایسا کرسکتا تھا۔ نادرہ نے کہا۔ "تم اچھا خاصہ کاروبار بھی کرو گے اور انگریزی بھی آسانی سے سیکھتے رہو گے۔ اس سے بڑی خوشی کیا ہوگی کہ ہم دن رات ساتھ رہیں گے۔"

ان کے درمیان یہ طے پایا کہ نادرہ کی روانگی کے ایک ہفتے بعد وہ لندن جائے گا۔ ویسے نادرہ مقررہ دن نہ جاسکی۔ اچانک اس کی ممی کا انتقال ہوگیا۔ وہ ماں کے سوگ میں اور چار دن رہ گئی حالانکہ اسے چالیس دن تک رہنا چاہئے تھا لیکن باپ اس بہانے برکت کا رستہ ہموار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے بیٹی کو ہزاروں میل دور بھیج دیا اس کے جانے کے بعد اس نے سیکریٹری سے کہا۔ "بی بی موٹر والے برکت پر نظر رکھو۔ دو چار روز میں بتاؤ وہ یہاں موجود ہے یا نہیں؟"

سیکریٹری کی رپورٹ کے مطابق وہ موجود تھا۔ پھر ایک ہفتے بعد غائب ہوگیا۔ منیجر

نے بتایا۔ ”برکت صاحب لاہور میں شوروم کے لئے جگہ خریدنے گئے ہیں۔ پتا نہیں کتنے ہفتے یا مہینے بعد آئیں گے۔“

بہر حال دو عشق کرنے والے دوسروں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر لندن کی رنگین فضاؤں میں مرادوں کی راتیں اور محبت کے دن گزارنے لگے۔ ڈیڑھ برس بعد وہ انیس برس کی ہوگئی۔ اس نے بالغ ہونے کا میڈیکل سرٹیفکیٹ حاصل کیا پھر کورٹ میرج کے ذریعے مسز نادرہ برکت بن گئی۔

ان کے درمیان طے پایا کہ شادی کو جب تک راز میں رکھا جاسکتا ہے تب تک وہ سوسائٹی میں صرف دوست کہلائیں گے۔ جب نادرہ کا باپ اس کی شادی کے لئے بہت اصرار کرے گا تب وہ میاں بیوی ہونے کا انکشاف کریں گے۔ اس طرح اندیشہ تھا کہ باپ یا تو خودکشی کرلیتا یا پھر بیٹی کو اپنی دولت اور جائیداد سے محروم کردیتا۔ نادرہ نے شادی تو کرلی تھی لیکن اندیشوں میں گھری رہتی تھی۔

خوش بختی برکت کے حصے میں آئی تھی۔ دو برس کے بعد نادرہ کے باپ کا انتقال ہوگیا۔ وہ آنسو بہاتی لندن سے واپس آگئی۔ اب وہ ارب پتی یتیم بچی تھی۔ باپ کے چالیسویں تک کتنے ہی ہمدرد اور غمگسار پیدا ہوئے۔ دوسرے ماہ برادری سے اور اونچے طبقے سے شادی کے پیغامات آئے۔ اس نے برکت سے شادی کرنے کا اعلان کردیا۔ پھر تیسرے ماہ دنیا والوں کو دکھانے کے لئے دوبارہ شادی کرلی۔

جب تک شادی راز میں تھی، رومانس میں بڑا مزہ آتا تھا۔ چھپ چھپ کر ملنے میں ایڈونچر جیسا لگتا تھا۔ وصال سے پہلے انتظار کی رومانیت ہوتی تھی۔ وصال کے دوران ہجر کا دھڑکا لگا رہتا تھا۔ میاں بیوی ہونے کا اعلان کرنے کے بعد محبت کی ساری دلچسپیاں ماضی کا فسانہ بن جاتی ہیں۔ صرف اخلاقی، سماجی اور گھریلو ذمے داریاں رہ جاتی ہیں اور یہ ذمے داریاں تمام عمر سزا کے طور پر پوری کی جاتی ہیں۔

نادرہ اعلیٰ خاندان اور اعلیٰ طبقے کی پروردہ تھی اس لئے احساسِ برتری میں مبتلا رہتی تھی۔ ابتدا میں برکت نے اس کے مزاج کو نظرانداز کیا۔ پہلے پہل یہ بات ناگوار گزرتی تھی کہ اونچے طبقے میں اور کاروباری حلقوں میں وہ نادرہ کے حوالے سے پہچانا جاتا تھا۔ تمام لین دین نادرہ کے حوالے سے ہوتا تھا۔ چیک پر بیوی کے دستخط ہوتے تھے۔ وہ اہم کاروباری معاملات طے کرتی تھی اور جن کاروباری لوگوں کی کوئی اہمیت

نہیں ہوتی تھی یا انہیں کسی معاملے میں ٹالنا ہوتا تھا تو وہ برکت کو ان سے گفتگو کرنے کے لئے کہتی تھی۔ اس طرح وہ شوہر کم اور سیکریٹری زیادہ لگتا تھا۔

اس نے شکایت کی۔ ”نادرہ! میں اپنی شناخت تمہارے حوالے سے نہیں چاہتا۔ آئندہ میں تمہارے کاروباری معاملات میں کسی سے گفتگو نہیں کروں گا۔“

”پھر تم کاروباری ہیرا پھیری کو کیسے سمجھو گے؟“

”جس حد تک سمجھتا ہوں، وہی کافی ہے۔“

”کاروبار اور بڑھتی ہوئی آمدنی کو کبھی کافی نہیں سمجھنا چاہئے۔ بزنس کی دنیا میں تمہیں ایک لمبی چھلانگ مارنی ہوگی۔ میں نے تمہارے لئے ایک پلاننگ کی ہے۔“

”اپنی پلاننگ بتانے سے پہلے یہ اچھی طرح سمجھ لو کہ میں کوئی کاروبار تمہارے نام سے نہیں کروں گا۔ میں تمہاری سوسائٹی میں اپنی الگ حیثیت سے مقام حاصل کروں گا۔“

”میں نے جو پلاننگ کی ہے اس میں پچیس اور پچاس لاکھ بھی خرچ ہوسکتے ہیں اور ایک کروڑ بھی خرچ ہوسکتے ہیں۔ رقم میری خرچ ہوگی اور کام تم کرو گے۔ آخر میرے نام سے جلنے کیوں لگے ہو؟“

”میں تم سے اور تمہارے نام سے محبت کرتا ہوں۔ اپنی الگ حقیقت منوانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم سے حسد یا جلن ہے۔“

”تم مردوں کی فطرت سمجھ میں نہیں آتی۔ بیوی سے رقم لو گے، نام نہیں لو گے۔“

”اگر میں تم سے رقم مانگتا تو بے غیرت کہلاتا۔ پلاننگ تم خود کررہی ہو۔“

”میں نے تمہیں مانگنے کا کبھی موقع ہی نہیں دیا۔ منہ کھولنے سے پہلے تمہاری لاکھوں کی ضرورت پوری کردیتی ہوں۔ پہلے تم محض ایک مشہور پہلوان تھے لیکن آج جو تمہاری عزت اور شہرت ہے، وہ میری وجہ سے ہے۔“

”یہ تم نے بہت اچھا کیا، مجھے خیراتی عزت اور شہرت والی بات سمجھادی۔ آج سے میں ان سب چیزوں پر لعنت بھیجتا ہوں۔ تعجب ہے، آدمی محبت میں اس قدر عقل کا اندھا ہوجاتا ہے کہ شادی کے بعد بیوی کے گھر میں رہتے ہوئے بے غیرتی کا پتا نہیں چلتا منہ پر تھوک آکر پڑے تو بات سمجھ میں آتی ہے۔“

"دیکھو برکت! ایسی سخت باتیں نہ کہو۔ اللہ جانتا ہے' میں نے تمہیں طعنہ نہیں دیا ہے اور نہ ہی تمہاری موجودہ عزت کو خیراتی سمجھتی ہوں۔ میرا جو کچھ ہے' وہ سب تمہارا ہے۔ میں سر سے پاؤں تک تمہاری ہوں۔ تم جھگڑا بڑھانے والی باتیں نہ کرو۔"

جھگڑے کی ابتدا ہو چکی تھی۔ برکت اس رات کوٹھی میں نہیں آیا۔ نادرہ خواہ کتنی ہی مغرور اور ضدی تھی مگر برکت کی دیوانی تھی۔ اسے ٹوٹ کر چاہتی تھی۔ وہ رات کو بڑی دیر تک انتظار کرتی رہی۔ غصے میں کھانا لگوایا' یہ کہنے کے لئے کہ مجھے تمہاری پروا نہیں ہے۔ میں شوہر کے انتظار میں بھوکی رہنے والی عورت نہیں ہوں۔ وہ ضد میں آکر بڑی مشکل سے آدھی روٹی کھا سکی لیکن اس کے بغیر سو نہ سکی صبح چار بجے تک کروٹیں بدلنے کے بعد تھوڑی دیر کے لئے نیند آگئی۔

صبح دس بجے اس نے بی بی موٹرز میں فون کیا۔ برکت کی آواز سن کر پوچھا۔

"تم کہاں ہو؟ گھر کیوں نہیں آئے؟"

اس نے جواب دیا۔ "میں رات بھر سوچتا رہا' میرا گھر کہاں ہے؟ بانو سے شادی کی اس کے گھر میں رہ گیا۔ تم سے شادی کی تمہارے گھر چلا گیا۔ میرے ساتھ یہ المیہ ہے کہ مجھے بڑی مشکل سے عقل آتی ہے۔ آج پوری دانش مندی سے سوچ رہا ہوں کہ پچھلے برسوں میں خوب کمایا مگر اپنا ایک گھر نہیں بنایا۔ گھر اس لئے نہیں بنایا کہ آج تک مکان نہیں بنایا۔ مکان ہوتا تو اس میں میرے بیوی بچے ہوتے تو ایک گھر کی جنت دیکھنے کو ملتی۔"

"فضول باتیں نہ کرو میرا گھر تمہارا گھر ہے۔ شام کو جلدی آجانا۔ سلیمان بھائی کے ہاں ولیمے کی تقریب میں شریک ہونا ضروری ہے۔"

"تمہارے لئے ضروری ہے۔ اس کوٹھی میں جو بھی شادی' ولیمے یا کاک ٹیل پارٹی کی دعوت دینے آتا ہے وہ تم سے مل کر دعوت نامہ دیتا ہے اور رسماً کہتا ہے کہ برکت صاحب کو ساتھ لائیے گا۔ گویا کہتا ہو جوتے پہن کر آئیے گا۔"

"یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔ کیا دماغ چل گیا ہے؟"

"میں پورے ہوش و حواس میں رہ کر ایک کوٹھی اپنے لئے خریدنے کا ارادہ کر رہا ہوں۔ میرے بینک بیلنس کے مطابق کوٹھی مل جائے گی تو وہاں تمہارے ساتھ زندگی گزاروں گا۔"

"احمقانہ خواب نہ دیکھو۔ تم جتنی بڑی کوٹھی خریدو گے' وہ اس کوٹھی کے ایک گوشے کے برابر ہوگی۔ کیا تم ایک بڑی جگہ سے مجھے چھوٹی جگہ لے جاکر میری ہنسی اڑاؤ گے؟ میں ایسی نادان نہیں ہوں۔"

"میں کوٹھی خریدنے کے بعد تمہیں لینے آؤں گا۔ انکار کرو گی تو ضد نہیں کروں گا۔ یہ تمہارا دعویٰ ہے کہ تم مجھ سے زیادہ ضدی ہو۔ لہٰذا تمہارے دعوے کی نفی نہیں کروں گا۔"

"تم بڑی خوبصورتی سے مجھے ضدی اور سرکش عورت کہہ رہے ہو جب کہ تم ضد کر رہے ہو۔ میں دیکھوں گی کہ کب تک نہیں آؤ گے یہ خیال دماغ سے نکال دو کہ میں خوشامد کروں گی۔"

اس نے ریسیور رکھ دیا۔ اس کے بعد بڑی دیر تک غصے میں تلملاتی رہی۔ برکت اس کے پاس نہ آکر' اس کی عالی شان کوٹھی کو ٹھکرا کر اس کی توہین کر رہا تھا۔ اس کے خیال کے مطابق دوسرے مردوں کی طرح شادی کے بعد اپنا اصلی روپ دکھا رہا تھا۔ وہ ولیمے کی تقریب میں جانے سے پہلے آئینے کے سامنے بنتی سنورتی رہی اور اس کا انتظار کرتی رہی پھر غصے میں تنہا چلی گئی۔ اس نے سوچا کوئی ضرورت نہیں ہے کہ شوہر ہمیشہ باڈی گارڈ کی طرح ساتھ ہو کبھی تنہا اور آزاد بھی رہنا چاہئے۔

تقریب میں دوسری عورتیں اپنے اپنے شوہروں کے ساتھ آئی تھیں۔ وہ جہاں سے گزرتی تھی جس سے ملتی تھی' وہی پوچھتا تھا یا پوچھتی تھی۔ "تمہارے صاحب نظر نہیں آرہے ہیں؟ ایسی بھی کیا مصروفیت ہے۔ شام کے بعد مرد کا تمام وقت بیوی کے لئے ہوتا ہے۔ جو یہ وقت اپنی عورت کو نہیں دیتا' وہ دوسری عورت کے پیچھے بھٹکتا ہے۔ مرد صرف دولت کی زنجیروں سے باندھ کر نہیں رکھا جا سکتا' اسے پابند رکھنے کے لئے حکمت عملی لازمی ہوتی ہے۔ تعجب ہے' شادی کے چھ ماہ بعد ہی تم اکیلی ہو گئیں۔"

وہاں جتنے منہ تھے اتنی باتیں تھیں۔ باتیں بڑے ہی میٹھے انداز میں تھیں مگر نشتر کی طرح لگ رہی تھیں۔ یہ حقیقت پہلی بار سمجھ میں آئی کہ اب وہ سوسائٹی میں برکت کے بغیر ادھوری ہے۔ شوہر ایک شناختی کارڈ ہوتا ہے اگر وہ اس شناختی کارڈ کو ہمیشہ اپنے ساتھ نہیں رکھے گی تو معاشرہ اسے مسترد کی ہوئی عورت سمجھے گا۔

اس نے دوسرے دن فون کیا۔ "برکی آجاؤ۔"

وہ غصے سے برکت کہتی تھی اور پیار سے برکی۔ وہ بولا۔ "ایک کوٹھی پسند کرنے جارہا ہوں۔ تمہاری پسند بھی ضروری ہے تم ہی چلی آؤ۔"

وہ بات بڑھانا نہیں چاہتی تھی۔ اس کے شوروم میں پہنچ گئی۔ وہاں دفتری کمرے کو اندر سے بند کرکے اس سے جھگڑا بھی کیا' پیار بھی کیا۔ اسے سمجھایا۔ "جان! میری عزت کا خیال کرو۔ چار چھ لاکھ کی کوٹھی خریدو گے تو لوگ پیٹھ پیچھے میرا مذاق اڑائیں گے۔ میری کوٹھی ایک کروڑ بیس لاکھ کی ہے تمہیں کم از کم پچاس لاکھ کا مکان خریدنا چاہئے تھا۔"

"میرے پاس اتنی رقم نہیں ہے۔"

"مجھ سے لے لو۔ دیکھو طعنے نہ دینا۔ میری محبت اور امداد کو خیرات نہ کہنا۔ تمہیں بڑی جلدی غصہ آجاتا ہے۔"

"میرے خیرات نہ کہنے سے کیا امداد خیرات نہیں کہلائے گی۔"

"امداد نہ لو۔ قرض لے لو۔ قسطوں میں رقم واپس کردینا۔"

"میرے شوروم کی آمدنی اتنی نہیں ہے تمہارا قرض ادا کرتے کرتے میری آئندہ نسلیں بھی گزر جائیں گی۔"

"تمہاری آمدنی بڑھے گی میں پلاننگ کرچکی ہوں۔"

"آخر وہ پلاننگ کیا ہے؟"

"تم مشہور معروف سیاسی لیڈر آصف سردار کو جانتے ہو۔"

"اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ تمہارے ڈیڈی کے بہت اچھے دوست رہ چکے ہیں۔ سیاست میں بڑا نام ہے۔"

"الیکشن قریب ہیں۔ یہ بڑا سیاسی لیڈر الیکشن میں کھڑا ہوگا تو مخالفوں کو شکست دیتا ہوا قومی اسمبلی میں پہنچ جائے گا۔ اپنی سیاسی چالوں سے کوئی بڑا وزیر بھی بن جائے گا۔"

"یہ تم سیاسی باتیں کیوں چھیڑ رہی ہو؟"

"میں کاروباری باتیں کررہی ہوں۔ الیکشن لڑنے کے لئے کثیر سرمائے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہم آصف سردار کو رقم دیں گے۔ پچیس لاکھ' پچاس لاکھ' پچھتر لاکھ' جتنی اسے ضرورت ہوگی' ہم اسے قرض دیتے جائیں گے۔ میں اس سے معاملات

طے کرچکی ہوں' وہ پچیس لاکھ لینے سے پہلے پچاس لاکھ کا پرونوٹ لکھ کردے گا یعنی جتنی رقم لیتا جائے گا اس کی دوگنی رقم کا قرضدار ہوتا جائے گا۔"

"کوئی ضروری تو نہیں کہ وہ وزیر بن جائے اور ملکی خزانے کو دونوں ہاتھوں سے سمیٹ کر ہمیں منافع دیتا رہے۔"

"ریس کھیلنے والا ماہر پہلے گھوڑے کی ہسٹری معلوم کرتا ہے' اس کی میڈیکل رپورٹ دیکھتا ہے' اس کی چال اور چال بازی کے انداز کو سمجھتا ہے پھر بڑی سے بڑی رقم لگاتا ہے۔ میرے پاپا سیاسی داؤ پیچ کے ماہر تھے اور اکثر سیاست کے میدان میں اپنی پسند کے گھوڑے دوڑاتے رہتے تھے۔ انہیں صرف ایک بار ناکامی ہوئی ورنہ وہ ہمیشہ جیتنے والے گھوڑوں سے کاروباری مفادات حاصل کرتے رہے۔ انہوں نے ایک بار مجھ سے کہا تھا یہ آصف سردار جیتنے والا گھوڑا ہے۔ آئندہ الیکشن میں اس پر رقم لگاؤں گا۔ آہ: ڈیڈی نہیں رہے' میں ان کے تجربات سے فائدہ اٹھانا چاہتی ہوں۔"

"مائی گاڈ! تم کتنی بڑی رقم سے جوا کھیلنا چاہتی ہو؟"

"یہ جوا تم کھیلو گے۔ میں تمہیں قرض دوں گی یا تمہاری پارٹنر رہوں گی۔ رقم میری اور بھاگ دوڑ تمہاری ہوگی۔ خدانخواستہ نقصان ہوا تو میں برداشت کروں گی۔ فائدہ ہوتا رہا تو ففٹی ففٹی۔"

وہ بڑی بحث و تکرار کے بعد راضی ہوگیا۔ نادرہ ایک بہت ہی چالاک بزنس مین کی بیٹی تھی۔ اس نے برکت سے تحریری معاہدہ کیا۔ آصف سردار ایک مصروف کاروباری علاقے میں بہت بڑی زمین کا مالک تھا۔ ان دنوں وہ علاقہ کمرشل نہیں تھا۔ زمینیں بہت زیادہ مہنگی نہیں تھیں۔ نادرہ نے آصف سردار سے پرونوٹ لکھوایا' اس کے عوض جتنی رقم دی اس میں زمین بھی اپنے نام کرالی۔ برکت نے الیکشن کا نتیجہ سامنے آنے تک اس زمین پر پلازا تعمیر کرایا شہر کی آبادی آندھی کی رفتار سے بڑھتی جارہی تھی۔ رہائشی فلیٹ بک ہونے لگے۔ نوٹوں کی بارش ہونے لگی۔ یہ کاروبار برکت کے نام سے ہورہا تھا اور توقع سے زیادہ برکت ہو رہی تھی۔ خوش نصیبی اس کے نام اور کام سے چپک کر رہ گئی تھی۔

آصف سردار الیکشن میں ووٹوں کی بھاری تعداد سے جیت گیا۔ چونکہ وہ حکمران جماعت سے تعلق رکھتا تھا اس لئے کسی روک ٹوک کے بغیر وزیر بن گیا۔ نادرہ

اور برکت کی چاندی ہو گئی۔ پانچ برس کے عرصے میں اس کی وزارت کے شعبے بدلتے رہے۔ ان کی مناسبت سے برکت نے کبھی مہنگا منافع بخش سامان منگوانے کا امپورٹ لائسنس حاصل کیا' کبھی لانگ روٹ کی درجنوں گاڑیاں چلانے کا اجازت نامہ لیا۔ کبھی شہر کے مختلف ترقی پذیر علاقوں میں سرکاری کاغذات پر سستی زمینیں خریدیں۔ رہائشی فلیٹس' بنگلوز' شاپنگ سنٹر اور فائیو سٹار ہوٹل تعمیر کرائے۔ کسی کی کامیابی سمندر کے کنارے سے روشنی کے مینار کی طرح ایستادہ رہتی ہے' کسی کی کامیابی جھاگ کی طرح بیٹھ جاتی ہے۔ پانچ برس بعد آصف سردار کو سیاسی زوال آیا اور برکت کا شمار شہر کے چند بڑے سرمایہ داروں میں ہونے لگا۔

روشنی کے ساتھ سایہ ضرور ہوتا ہے۔ زندگی کے روشن پہلو کے ساتھ تاریک پہلو لازمی ہوتا ہے۔ دونوں نے ایک دوسرے کے اشتراک سے کامیابیاں حاصل کی تھیں لیکن مزاج وہی پرانا تھا۔ نادرہ کو ناز تھا کہ اس کی رقم اور حکمت عملی سے برکت سرمایہ داروں کی صف میں آ گیا ہے۔ اگرچہ یہ درست تھا تاہم یہ احساس اسے مجروح کرتا تھا۔ وہ اپنی انا کی تسکین کے لئے کہتا تھا۔ "رقم اور حکمت عملی اس وقت تک کام نہیں آتی جب تک مجھ جیسا کام کرنے والا ایماندار نہ ہو۔ اگر تم میری بیوی نہ ہوتیں تو میں کروڑوں روپے ہضم کر جاتا اور تمہیں پتا بھی نہ چلتا۔ ہماری کامیابی کی بنیادی وجہ میری دیانتداری اور سخت محنت ہے۔"

وہ تسلیم نہیں کرتی تھی اپنی رقم کو اہمیت دیتی تھی اور کہتی تھی۔ "جب میں ٹھوس منصوبہ بندی کر سکتی ہوں تو کام کرنے والے دیانتدار لوگوں کو ملازم بھی رکھ سکتی ہوں۔ دیانتدار تو چھوٹی تنخواہ کے عوض مل جاتے ہیں لیکن چھوٹی رقم سے تم موجودہ مقام تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔"

"لعنت ہے' تم پر اور تمہاری رقم پر' جب دیکھو احسان جتاتی رہتی ہو کسی دن غصہ آ گیا تو منہ توڑ کر ہمیشہ کے لئے زبان بند کر دوں گا۔"

"پہلوانوں کی طرح دھمکی نہ دو۔ میں جاہل عورتوں کی طرح مار کھانے سے پہلے ہی تمہیں عدالت کے کٹہرے میں پہنچا دوں گی۔"

"میں وہ مرد نہیں ہوں جو عدالت میں پہنچ کر بیوی سے معافی مانگتے ہیں۔ میں اس سے پہلے ہی تمہیں طلاق دے دوں گا۔"

"ارے تم کیا دو گے' میں اپنے وکیل کے ذریعے طلاق کے کاغذات بھیج دوں گی میں جس اونچی سطح پر زندگی گزار رہی ہوں وہاں ہم جیسی عورتوں کے لئے طلاق گالی نہیں ہوتی۔"

"تو پھر دیر کیوں کرتی ہو' کاغذات بھیج دو' میں دستخط کر دوں گا۔"

وہ پیر پٹختی ہوئی دروازے تک گئی پھر وہاں سے پلٹ کر بولی۔

"ہم ایک ہفتے تک نہیں ملیں گے اور ٹھنڈے دماغ سے سوچتے رہیں گے' اس کے بعد بھی ایک دوسرے کے لئے دل میں جگہ نہ ہوئی تو ہم علیحدگی اختیار کر لیں گے۔"

وہ برکت سے منہ پھیر کر چلی آئی۔ اس وقت ایسا لگ رہا تھا جیسے برکت کے لئے اب دل میں جگہ نہیں ہو گی' وہ بے وفا احسان فراموش ہے بدتہذیب بھی ہے' بیوی کے ساتھ تمیز سے رہنا نہیں جانتا ہے' میں تو شادی کر کے پچھتا رہی ہوں' اس نے سوچا۔

رفتہ رفتہ غصہ کم ہوا تو برکت نے سوچا' نادرہ اچھی ہے بہت اچھی ہے۔ بس یہی خرابی ہے کہ ہتک آمیز انداز میں احسان جتاتی ہے۔ اگر وہ اتنا کہہ دے کہ اپنے محبوب کی کامیابی اور کامرانی کے لئے رقم لگاتی رہی ہے تو میں محبت سے سر جھکا کر اس کی عظمت کا اعتراف کر لوں گا۔

تیسرے دن جانے کیا ہوا؟ اچانک ہی نادرہ کا سر چکرایا۔ وہ فوراً ہی بیٹھ گئی۔ یہ چند لمحوں کی بات تھی۔ وہ پھر نارمل ہو گئی۔ اسے گرمی لگ رہی تھی' بجلی گئی ہوئی تھی' ائرکنڈیشنز خاموش تھے۔ اس نے انٹرکام پر سیکریٹری کو حکم دیا۔ "جنریٹر آن کرو۔"

اس نے حکم دے کر ریسیور رکھا تو اسی وقت متلی ہونے لگی۔ وہ تیزی سے چلتی ہوئی باتھ روم میں آئی پھر بیسن پر جھک گئی۔ قے ہونے والی تھی مگر نہیں ہو رہی تھی۔ مگر حلق سے زرد پانی نکل رہا تھا۔ وہ خوش ہو گئی۔ شاید یہی ماں بننے کے آثار تھے۔ اس نے باتھ روم سے آکر ایک لیڈی ڈاکٹر کو فون کیا۔ وہ ڈاکٹر اس کی سہیلی بھی تھی۔ نادرہ نے مسکرا کر کہا۔ "شاید مراد پوری ہونے والی ہے' تھوڑی دیر پہلے سر چکرایا تھا۔ پھر ابکائیاں سی آنے لگیں۔ فوراً چلی آؤ۔"

"کیسی باتیں کرتی ہو' میرے کلینک کا وقت ہو گیا ہے۔ بڑی بڑی بیگمات میرے

انتظار میں بیٹھی ہوں گی۔ تم کلینک آجاؤ۔"

"ٹو ہیل ود یو کلینک۔ زیادہ بکواس نہ کرو۔ فوراً چلی آؤ۔ ورنہ ٹھیک نہیں ہو گا۔"

"یہ حکم دینے والی عادت سے باز نہیں آؤ گی۔ اس لئے میاں سے تمہارا جھگڑا ہو تا رہتا ہے۔ ابھی آرہی ہوں۔"

وہ ریسیور رکھ کر بستر پر لیٹ گئی۔ مسکراتے ہوئے چھت کو تکنے لگی۔ وہاں برکت نظر آرہا تھا۔ اسے پہلوان پر بڑا پیار آرہا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی۔ اتنی بڑی خوشخبری کیسے سناؤں گی؟ وہ آئے گا تو پہلے اس کی گردن میں بانہیں ڈالوں گی اس کے چٹان جیسے سینے پر سر رکھوں گی۔ پھر جھکی جھکی نظروں سے شرماتے ہوئے کہوں گی۔ میں ماں بننے والی ہوں۔

"اوں ہونہہ۔ ماں بننا میرے لئے خوشی کی بات ہے۔ مجھے برکی کو خوش خبری سنانا ہے۔ میں کہوں گی تم باپ بننے والے ہو۔"

مرد کو خوش کرنے کے لئے یہی کہنا چاہئے۔ مگر اس میں تشنگی کا احساس ہو رہا تھا۔ فقرہ نامکمل تھا۔ اس میں باپ کے لئے فخر تھا ماں کا کوئی اہم حصہ نہیں تھا۔ وہ تھوڑی دیر سوچتی رہی پھر خوش ہو کر بولی۔ "میں کہوں گی جان! میں تمہارے بچے کی ماں بننے والی ہوں۔"

اس فقرے میں دونوں کی کوششوں کا ذکر ہے' وہ کھل کر مسکرائی۔ میں ایسا کہتے وقت لفظ "تمہارے" پر زور دوں گی۔ یوں عورت کی طرف سے سند ہو جاتی ہے کہ بچہ تمہارا ہی ہے۔

بعض اوقات مسرتوں کے ہجوم میں خوشخبری سنانا بہت مشکل ہو تا ہے۔ کبھی الفاظ نہیں ملتے کبھی اندازِ بیان نہیں ملتا۔ سمجھ میں نہیں آتا اس خوشخبری کو اس کی تمام خوشیوں سمیت کیسے سنایا جائے۔ اس کے سوچتے سوچتے لیڈی ڈاکٹر آگئی۔ آتے ہی بولی۔

"چپ چاپ لیٹی رہو تم کسی دن پاگل ہو جاؤ گی۔ کبھی تمہیں پاؤں بھاری لگتے ہیں' کبھی سر بھاری لگتا ہے۔ مہینے میں دو چار دن آگے پیچھے ہو جائیں تو میرے پیچھے پڑ جاتی ہو۔ اچھی طرح چیک کراتی ہو پھر رپورٹ سن کر مایوس ہو جاتی ہو' میں تمہیں کیسے

سمجھاؤں' ماں بننے کی خواہش کو اپنے حواس پر طاری نہ کرو۔ خدانخواستہ دماغی مریضہ بن جاؤ گی۔"

"تم بولتی بہت ہو۔ ڈاکٹر کو مریضہ کے معائنے پر پوری توجہ دینا چاہئے۔"

وہ باتھ روم میں دستانہ اور ہاتھ دھونے کے لئے گئی پھر وہاں سے بولی۔ "میں ہمیشہ توجہ سے دیکھتی ہوں لیکن قدرت تم پر توجہ نہیں دے رہی ہے۔"

یہ سنتے ہی نادرہ کے ہونٹوں کی مسکراہٹ مرجھا گئی۔ آنکھوں میں آنسو آنا چاہتے تھے' وہ ضبط کر رہی تھی۔ سہیلی نے کہا۔ "میری بات مان لو۔ باقاعدہ میڈیکل چیک اپ کراؤ۔"

"نہیں' مجھے ڈر لگتا ہے' اگر میں بانجھ نکلی تو کیا ہو گا؟"

"کیا ہو گا؟"

"میں برکت سے کم تر ہو جاؤں گی۔ وہ باپ بن سکتا ہے' میں ماں نہیں بن سکتی۔ اس معاملے میں وہ برتر ہو گا جب کہ میں ہر معاملے میں اس سے برتر رہتی ہوں۔"

"تمہارا یہ سوچنے کا انداز کسی دن تمہیں لے ڈوبے گا۔"

وہ رخصت ہو کر دروازے تک گئی پھر پلٹ کر بولی۔ "اب بھی وقت ہے سمجھ لو کہ مرد' عورت سے برتر ہو تا ہے۔"

وہ چلی گئی۔ نادرہ تھوڑی دیر سوچتی رہی۔ اگر میں برکی سے علیحدگی اختیار کروں تو کسی دن ماں بننے کا چانس بھی ختم ہو جائے گا۔ میں پھر کبھی دوسری شادی کی حماقت نہیں کروں گی۔ نہ مجھے برکی جیسا محبت کرنے والا ملے گا اور نہ ہی کسی دوسرے کو دوسری شادی کے نام پر برداشت کروں گی۔ یہ بے حیائی ہے اور مجھ سے بے حیائی نہیں ہو گی۔

اس نے فون اٹھا کر رابطہ قائم کیا پھر کہا۔ "برکی' آجاؤ میں تمہارے بغیر نہیں سکتی۔"

"تم پھر کسی دن بڑے باپ کی بیٹی بن کر بڑی بڑی باتیں کرو گی۔"

"تم اس قدر مائنڈ کیوں کرتے ہو؟ کیا تم نے نہیں سنا کہ دودھ دینے والی گائے کی لات کھانی پڑتی ہے۔"

"مرد گائے کی لات کھا سکتا ہے' عورت کی نہیں۔ اور یہ بات تم ایک پہلوان کو سمجھا رہی ہو۔ میں ایسی صورت میں گائے کو ذبح کردوں گا اور عورت کی ٹانگیں توڑ کر وھیل چیئر پر پہنچا دوں گا۔"

"تم جیتے میں ہاری۔ چلو ٹانگیں توڑ دو مگر آ جاؤ۔"

اس نے ریسیور رکھ دیا۔ دونوں میں پھر دوستی ہو گئی۔ مگر دوستی عارضی ہوتی تھی اور جھگڑے بھی زیادہ طوالت اختیار نہیں کرتے تھے۔ اس طرح دن' مہینے اور سال گزرتے گئے۔ شادی کو بیس برس گزر گئے پھر تیس برس گزر گئے۔ مگر اولاد نہ ہوئی۔ بڑھاپا' جوانی کی دہلیز پر دستک دے رہا تھا۔ نادرہ یہ ماننے کو تیار نہیں تھی کہ جوانی ڈھل گئی ہے۔ "ابھی ایک بچہ بھی نہیں ہوا جسم پر تخلیق کے کرب کا زلزلہ نہیں آیا۔ میں کہیں سے کھنڈر نہیں لگتی ہوں۔ یہ تو چند برسوں کی بات ہے جب میں دلہن بنی تھی' اتنی جلدی تیس برس کیسے گزر سکتے ہیں۔ مجھ سے حساب میں غلطی ہو رہی ہے۔"

ایک دن برکت نے کہا۔ "اولاد کی تمنا ہے تو کسی کا بچہ گود لے لو۔"

"میں تمہارا بچہ چاہتی ہوں۔"

"اب یہ ممکن نہیں ہے۔ تم بوڑھی ہو چکی ہو۔"

یہ سنتے ہی وہ بھڑک گئی۔ "کیا میں تمہیں بوڑھی لگ رہی ہوں؟ ابھی ایک بچے کو جنم نہیں دیا۔ مائیں بننے والی عورتیں بوڑھی ہوتی ہیں۔ میں تو سہاگ کی پہلی رات میں جیسی تھی ویسی ہی آج بھی ہوں۔ تم میرے ساتھ نہیں ہوتے تو لوگ مجھے کنواری سمجھتے ہیں۔"

وہ ہنسنے لگا۔ وہ اور زیادہ بھڑک کر بولی۔ "تم میرا مذاق اڑا رہے ہو۔ کیا میں جھوٹ بول رہی ہوں؟"

"تم شوہر کے سامنے خود کو کنواری کہلانا چاہو گی تو اس سے بڑا مذاق اور کیا ہو گا۔"

"میں تم سے سند نہیں لے رہی ہوں۔ مجھ پر ہنسنے سے پہلے اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھو۔ اپنی عمر چھپانا چاہو گے تب بھی نہیں چھپا سکو گے۔ تمہاری پوتی اور پوتے جوان ہو گئے ہیں۔ تم میلوں دور سے عینک کے بغیر بوڑھے نظر آتے ہو۔"

وہ کھانے کی میز پر بیٹھے ہوئے تھے۔ برکت نے پانی سے بھرا ہوا گلاس اٹھا کر اسے دکھایا۔ پھر اسے پانچ انگلیوں کے شکنجے میں رکھ کر دبایا تو وہ ایک چھناکے سے ٹوٹ گیا۔ اس نے فاتحانہ انداز میں کہا۔ "میں پہلوان ہوں اور پہلوان کبھی بوڑھا نہیں ہوتا۔ میں آج بھی جس لڑکی کو نظر بھر کر دیکھ لوں تو وہ کھنچی چلی آئے گی لیکن کوئی لڑکا تمہیں گھاس نہیں ڈالے گا تم پہلی نظر میں آثارِ قدیمہ لگتی ہو۔"

وہ بارود کی طرح پھٹ پڑی۔ کانچ کی پلیٹ اٹھا کر پھینک دی پھر کہا۔ "تم کیا تھے؟ کانچ کی پلیٹ جسے پہلی ملاقات میں اٹھا کر پھینک دیتی تو ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے۔ میں نے تمہیں کھانے کی میز پر رکھ کر غلطی کی۔ میرا نمک کھاتے ہو اور میرا مذاق اڑاتے ہو۔"

"یو شٹ اپ۔ ذلیل عورت! میں اپنی محنت کی کمائی کھاتا ہوں اور اپنی کوٹھی میں رہتا ہوں۔"

"تمہارے پاس جو کچھ ہے' وہ سب میرا دیا ہوا ہے۔ میری رقم اور میری پلاننگ نے تمہیں زمین سے اٹھا کر آسمان پر پہنچا دیا ہے۔ تم اپنی اوقات بھول گئے ہو۔"

پہلوان سے برداشت نہ ہو سکا۔ اس نے ایک الٹا ہاتھ اس کے منہ پر رسید کیا۔ وہ کرسی سمیت الٹ کر پیچھے فرش پر گر پڑی اس کے ساتھ ہی حلق پھاڑ پھاڑ کر چیخنے لگی۔ ہاتھ تگڑا پڑا تھا لیکن وہ پچھلے تیس برس سے اس تگڑے کو برداشت کرتی آ رہی تھی۔ اسے تکلیف چوٹ کی نہیں تھی' اپنی بے عزتی کی تھی۔ اس کا نمک کھانے والے نے اس پر ہاتھ اٹھایا تھا' ایک بڑے باپ کی بیٹی کو الٹ دیا تھا۔ وہ غصے میں پاگل ہو گئی تھی' چیختی جا رہی تھی اور چیزیں اٹھا اٹھا کر برکت کو نشانہ بناتی جا رہی تھی۔

کتنے ہی ملازم دوڑتے ہوئے آئے۔ برکت نے ڈانٹ کر کہا۔ "بھاگ جاؤ یہاں سے۔"

وہ سب چلے گئے۔ اس نے کہا۔ "میں تیس برس سے تمہارے طعنے سن رہا ہوں اور آج تک یہ سوچ کر برداشت کرتا آ رہا ہوں کہ میری محبت تمہیں ایک دن صحیح معنوں میں شریکِ حیات بنا دے گی لیکن تم ایک مغرور اور بد دماغ ملکہ عالیہ ہی بن کر رہنا چاہتی ہو۔ تمہاری فطرت اور کتے کی دم کبھی سیدھی نہیں ہو گی۔ اس لئے میں

پورے ہوش و حواس میں رہ کر تمہیں طلاق دیتا ہوں۔"

"میں طلاق نہیں لوں گی۔ میں نے آج تک تم سے کچھ نہیں لیا ہے' ہمیشہ دیتی آئی ہوں۔ اس نے طلاق بھی میں ہی دیتی ہوں۔ طلاق........... طلاق.......... طلاق.......... میرا وکیل طلاق کے کاغذات لائے گا۔ دستخط کر دینا۔"

وہ غصے میں تنتناتی ہوئی اپنے بیڈ روم کی طرف چلی گئی برکت وہاں سے چلا آیا۔ اس کے بعد ایک ہفتے کے اندر طلاق کی کارروائی بھی مکمل ہوگئی۔ وہ ہمیشہ کے لئے علیحدہ ہوگئے۔ پھر کبھی ایک چھت کے نیچے ان کی ملاقات نہیں ہوئی۔

اس کی پہلی بیوی بانو مر چکی تھی۔ دو بیٹے اور ایک بیٹی خوشحال زندگی گزار رہے تھے۔ ان کے بچے بھی جوان ہوگئے تھے۔ برکت کا جوان پوتا اپنے دادا کے نقشِ قدم پر چلتا ہوا پہلوانی سیکھ رہا تھا۔ اس نے اپنے بچوں کے لئے اور بچوں کے بچوں کے لئے بہت کچھ کیا تھا۔ ان سب کو الگ الگ کاروبار سے لگا چکا تھا۔ وہ اپنے باپ اور دادا سے ملنے والی بڑی بڑی رقومات کو صحیح طور پر استعمال کر رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر برکت کو اطمینان ہوتا تھا۔ اس نے زندگی کے میدان میں بہت کچھ جیت لیا تھا۔ شکست نادرہ کے حصے میں آئی تھی۔

وہ طلاق کے چند دنوں بعد ہی پچھتانے لگی۔ یہ پچھتاوا ظاہر کرتا تھا کہ وہ برکت سے کتنا پیار کرتی ہے لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ وہ ایک دوسرے کے لئے نامحرم ہوگئے تھے۔ وہ سوچتی تھی اور خود پر لعنت بھیجتی تھی۔ غصے اور غرور کو اپنے اندر سے نوچ پھینکنا اس کے بس میں نہیں تھا۔ وہ پچھلے تیس برسوں میں اپنی اصلاح نہ کر سکی اور اب تو کچھ کرنے کا وقت گزر چکا تھا۔

اس نے چھ ماہ تڑپ تڑپ کر گزارے۔ پہلوان نے اسے اپنا عادی بنا دیا تھا۔ وہ اس سے محبت کئے بغیر اور جھگڑا کئے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی تھی۔ اس نے ایک رات فون کیا۔ برکت نے اس کی آواز سن کر پوچھا۔ "کس رشتے سے فون کر رہی ہو؟"

"کیا ابھی تک غصے میں ہو؟"

"غصہ بھی کسی تعلق سے کیا جاتا ہے۔ تم سے نہ کوئی تعلق ہے نہ غصہ ہے۔"

"برکی! میں اکیلی ہوں۔"

"میں کیا کر سکتا ہوں؟"

"میرے پاس آجاؤ یا مجھے بلا لو۔ دو انسان کسی رشتے کے بغیر بھی ملاقات تو کر سکتے ہیں۔"

"ہم مختلف انسان ہیں۔ ہمارا مذہب مطلقہ بیوی سے ملنے کی اجازت نہیں دیتا۔"

"کوئی ایسی بات کرو جس سے ملنے کی صورت نکل آئے۔"

"کسی ایسی بات کی گنجائش نہیں رہی۔"

"تمہارے دل میں میرے لئے جگہ ہوگی تو گنجائش نکل آئے گی۔"

"آج بھی تمہارے لئے دل میں جگہ ہے لیکن جوانی میں تمہارا غصہ قابلِ برداشت تھا۔ بڑھاپے میں ناقابلِ برداشت ہوگئی ہو۔"

"دیکھو' تم پھر مجھے بڑھاپے کا احساس دلا رہے ہو۔ یہ سراسر زیادتی ہے۔ ابھی کل ہی فیشن میگزین والا ٹائیٹل پر میری تصویر شائع کرنے کے لئے لے گیا ہے۔ کیا اس سے ثابت نہیں ہوتا کہ میں جوان ہوں۔"

"تصویر میں تاج محل کا بیرونی حسن نظر آتا ہے' اس کے اندر کی پرانی قبر نظر نہیں آتی۔ یہ حقیقت تو شاہجہاں جانتا ہے۔"

"تم پھر میری انسلٹ کر رہے ہو۔ مجھے سوری کہو۔"

"میں نے کوئی غلطی نہیں کی ہے۔"

"تم اپنے بڑھاپے کا غصہ مجھ پر اتار رہے ہو۔ کیا میری محبت کی خاطر سوری نہیں کہہ سکتے۔ دوستی کی کوئی صورت نہیں نکال سکتے؟"

"ایک ہی صورت ہے۔ حلالہ بن کر آؤ۔"

"کیسی بے شرمی کی باتیں کر رہے ہو۔ میں کسی دوسرے سے شادی کروں۔ وہ طلاق دے تو تمہارے پاس آؤں۔ یہ کبھی نہیں ہوگا۔ آئندہ میری تنہائی میں کوئی دوسرا نہیں آئے گا۔"

"تو پھر دوری برداشت کرتی رہو اور یہ تسلیم کرنے کا حوصلہ پیدا کرتی رہو کہ اس عمر میں کوئی تم سے شادی نہیں کرے گا۔"

"یو شٹ اپ۔ تم مجھے بار بار عمر کا طعنہ دے رہے ہو۔ میں تمہارے چیلنج کا جواب دے سکتی ہوں۔ ایک سے ایک خوبرو جوان کو بوائے فرینڈ بنا سکتی ہوں۔ مگر

تمہیں کوئی لڑکی گھاس نہیں ڈالے گی۔"

"تم میری فکر نہ کرو۔ تمہارے طبقے میں سولہ برس سے لے کر ساٹھ برس تک کی دوشیزائیں بوائے فرینڈ بناتی رہتی ہیں۔ تم پر بھی کوئی انگلی نہیں اٹھائے گا۔ ایک نہیں ایک درجن بوائے فرینڈ بنالو۔"

اس نے ریسیور رکھ کر رابطہ ختم کردیا۔ اس کے بعد دونوں میں ٹھن گئی۔ دونوں یہ ثابت کرنے پر تل گئے کہ ابھی تو ہم جوان ہیں اور حسین لڑکیاں اور خوبرو لڑکے ان کی راہ میں دل پیش کرنے کے منتظر ہیں۔ انہی کوششوں میں دو برس گزر گئے اس عرصے میں جو بھی آئی' اس نے انکل کہا اور جو بھی آیا' اس نے آنٹی یا باجی ہی سمجھا۔ ان کا خیال تھا کہ آج کی جوان نسل پختہ عمر کو بڑھاپا سمجھتی ہے اور پندرہ بیس برس کی کچی عمر کو جوانی سمجھ کر جوانی سے پہلے ٹھوکریں کھاتی ہے۔

دونوں نے جوان نسل کو محبت اور رومانس کا درس دینے کے لئے اپنی دولت کا سہارا لیا۔ اس طرح وہ غریب لڑکی اور لڑکے کے معاشی مسائل بھی حل کرسکتے تھے۔ نیکی بھی کماسکتے تھے اور اپنے جوان ہونے کا ثبوت بھی دے سکتے تھے۔

☆======☆======☆

وہ باتھنگ ٹب کے اندر صابن کے جھاگ میں ڈوبا ہوا تھا۔ قریب ہی گردش کرتی ہوئی ٹرالی پر حسین مورتی گھوم رہی تھی اور وہ اتنی دیر تک سوچتے سوچتے بہت ساری وہسکی پی گیا تھا۔ اچھا خاصا نشہ ہو رہا تھا۔ اس نے شاور کے نیچے غسل کیا' تولیے سے بدن پونچھ کر شب خوابی کا لباس پہنا پھر لڑکھڑاتا ہوا بیڈ روم میں آیا۔ اس کی نظر ٹیلی فون کے پاس رکھے ہوئے ریکارڈر پر پڑ گئی جس میں نادرہ کی فون کال ریکارڈ ہوئی تھی۔ اس نے باتھ روم میں جانے سے پہلے نادرہ کی آدھی گفتگو سنی تھی پھر اسے آف کردیا تھا۔

وہ ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے ریکارڈر کے پاس آیا۔ پھر پلے کرنے والے بٹن کو دبا دیا۔ نادرہ کی آواز ابھرنے لگی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "اب بھی وقت ہے' اپنے زہریلے الفاظ واپس لو مجھے سوری کہو' تم اچھی طرح جانتے ہو' میں دولت کی چھاؤں میں اپنے حسن وشباب کی تعریفیں سن سن کر خوش ہوتی آئی ہوں۔ بڑھاپے کا طعنہ مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔ مجھے سوری کہو' ایک بار اپنی غلطی تسلیم کرلو۔ نہیں کرو گے تو

شہزاد سے نکاح پڑھوالوں گی۔

"ارے بے وفا! میں دولت مند ہوں تو کیا ہوا؟ کیا عورت نہیں ہوں۔ عورت امیر ہو یا غریب' اس میں وفا اور شرم ہوتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ حالات اور ماحول اسے بے شرم بنا دیتے ہیں۔ اللہ کا شکر ہے' میں ابھی تک شرم والی ہوں۔ آج بھی کسی دوسرے کو اپنا ہاتھ چومنے نہیں دیتی۔ شادی کے نام پر کسی غیر مرد کو برداشت نہیں کرسکتی۔ تم نے مجھے زندگی کے کس نئے موڑ پر لاکر چھوڑ دیا ہے۔ بتاؤ' میں تمہارے پاس کیسے آؤں؟ کس رشتے سے آؤں؟"

اس کی آواز آنسوؤں میں ڈھل گئی۔ وہ رو رہی تھی۔ برکت نے ریکارڈر کو آف کردیا۔ پھر بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ "مگرمچھ کے آنسو۔ میں اس عورت کی رگ رگ سے واقف ہوں۔ یہ ایک طرف رو رو کر مجھ سے شدید محبت کا اظہار کرتی ہے اور دوسری طرف ایک نوجوان کو بوائے فرینڈ بنا کر چیلنج کررہی ہے کہ میں کسی جوان حسینہ کو گرل فرینڈ نہیں بناسکوں گا۔ بزنس مین کی مکار بیٹی دہری چالیں خوب چلتی ہے۔"

اس نے ریسیور اٹھانے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ مگر نشے میں ہاتھ دوسری طرف پڑ گیا۔ دوسری بار اس نے دونوں ہاتھوں سے لپک کر اسے اٹھایا جیسے ریسیور بھاگنے والا ہو۔ پھر اس نے نمبر ڈائل کئے۔ رابطہ قائم ہونے پر کسی مرد کی آواز سنائی دی۔ اس نے کہا۔ "اچھا جوان! نادرہ تمہیں اپنے بیڈ روم میں لے آئی ہے' میرے سامنے پارسائی جتا رہی تھی کہ شادی کے نام پر کبھی کسی دوسرے مرد کو برداشت نہیں کرے گی۔"

دوسری طرف سے ڈانٹ کر کہا گیا۔ "ابے او شرابی! میں تھانے کا انچارج ہوں اور تھانے سے بول رہا ہوں۔ اپنا پتا بتا' میں تجھے ابھی اندر کردوں گا۔"

برکت نے کریڈل پر ہاتھ رکھا۔ رابطہ ختم ہوگیا۔ دوسری بار صحیح نمبر ہوا۔ نادرہ کی آواز سنائی دی۔ "ہیلو' کون؟"

"میں بول رہا ہوں۔ یہ مت سمجھنا نشے میں ہوں۔ میں تمہاری مکاری خوب سمجھتا ہوں۔ ایک جوان کو کافی ہاؤس میں بلا کر مجھے چیلنج کرتی ہو۔ اگر ایک باپ کی بیٹی ہو تو پرسوں تک زندہ رہنا کافی ہاؤس میں آکر دیکھنا۔ میرے ساتھ ایسی حسین وجمیل دوشیزہ ہوگی جسے دیکھنے کے بعد تم آئینے میں اپنے بڑھاپے کو نہیں دیکھ سکو گی۔"

وہ بولتا جا رہا تھا۔ مدہوشی میں میز پر جھکتا جا رہا تھا۔ اس کی آواز ڈوبتی جا رہی تھی' پھر وہ کرسی پر بیٹھے بیٹھے میز پر اوندھا ہو گیا ریسیور چہرے کے پاس پڑا رہ گیا۔ زبان چپ ہو گئی تھی۔ نادرہ پکار رہی تھی۔ "ہیلو' ہیلو برکی! ہیلو............"

وہ دو چار بار آوازیں دے کر چپ ہو گئی۔ رابطہ ختم نہیں ہوا تھا۔ اس لئے یقین تھا' وہ کچھ بولے گا لیکن ذرا دیر بعد ہی ریسیور سے خراٹوں کی آواز سنائی دی۔ ایک طویل عرصے بعد وہ پہلوانی خراٹے بے چینی کا باعث بن گئے۔ اس کی آنکھیں خواب ناک ہو گئیں۔ وہ ریسیور کو کبھی سینے سے لگانے اور کبھی ہونٹوں سے چومنے لگی۔ وہ خراٹے اس کے ہونٹوں پر سلگ رہے تھے' سانسوں میں اتر رہے تھے اور دل میں بج رہے تھے۔ پیار ایسا بھی ہوتا ہے' دور رہ کر بھی پچھاڑتا رہتا ہے۔

☆======☆======☆

وہ تینوں بہنیں نئی کوٹھی میں آ گئیں۔ ان کے پاس سامان زیادہ نہیں تھا اور جو بھی تھا' وہ کوٹھی کے شایانِ شان نہیں تھا۔ وہ ایک کمرے میں مختصر سامان کے ساتھ یوں بیٹھی ہوئی تھیں جیسے ریلوے ویٹنگ روم میں ٹرین کا انتظار کر رہی ہوں۔ برکت نے آ کر انہیں دیکھا پھر کہا۔ "تم تینوں سوچ میں بیٹھی ہو کہ نئی زندگی کی ابتدا کہاں سے کریں اور کیسے کریں؟"

بڑی بہن حسنہ نے کہا۔ "جی ہاں' زندگی کے نئے راستے پر کس طرح چلنا چاہئے اور کتنی دور تک جانا چاہئے' یہ سمجھ میں نہیں آتا۔"

"میرے ساتھ آؤ؟ میں چلنا سکھاؤں گا۔"

وہ تینوں کار میں آئیں۔ نیلما کو اس کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھنا پڑا۔ اس نے ایک دکان میں پہنچ کر کوٹھی کے ہر کمرے میں قالین بچھانے اور پردے لگانے کا آرڈر دیا۔ حسنہ اس دکان کے ایک کاریگر کو کوٹھی میں لے گئی۔ ایک شوروم سے تمام ضروری فرنیچر خریدا گیا۔ دوسری بہن سائرہ فرنیچر کے ساتھ چلی گئی۔ نیلما اس کے پاس تنہا رہ گئی۔ وہ مسکرا کر بولا۔ "مجھے خوشی ہے کہ تم نے انکار نہیں کیا۔ مجھ سے راضی ہو۔ چلو' لباس کی خریداری سے شاپنگ شروع کرو۔"

وہ اسے بڑی بڑی دکانوں میں لے گیا اور اس سے کہتا رہا' وہ کیا پسند کرتی ہے؟ کیا خریدنا چاہتی ہے؟ قیمت کی پروا نہ کرے' خریدتی چلی جائے لیکن وہ چپ چپ سی

تھی۔ دس بار پوچھنے پر ایک بار جواب دیتی تھی' برکت اسے اپنی ہی پسند سے کپڑے' سینڈلیں اور میک اپ کا سامان خرید کر دیتا رہا۔ اس دوران وہ بہنوں کے لئے کچھ نہ کچھ پسند کرتی تھی اور وہ چیزیں خریدنے کے لئے کہتی تھی۔ اس نے کہا۔ "اللہ کا شکر ہے' بہنوں کے لئے ہی سہی' کچھ بول تو رہی ہو۔"

"میں بہت دیر سے سوچ رہی ہوں' مجھے کچھ کہنا چاہئے۔ اگر آپ ٹیپ ریکارڈر خریدیں اور اس میں سے آواز نہ آئے تو آپ کی رقم ڈوب جائے گی۔ یا آپ ریکارڈر واپس کر دیں گے۔"

اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ "تم کفن پھاڑ کر بولتی ہو۔ مگر سُر میں بولتی ہو۔ میں واپس نہیں کروں گا۔"

"سوال پیدا ہوتا ہے' میں کس موضوع پر بولوں؟ میں نے ابھی آنکھیں کھولی ہیں۔ نئی نئی دنیا دیکھ رہی ہوں۔ میں نہیں جانتی آثارِ قدیمہ سے تعلق رکھنے والے گفتگو کے لئے کون سا موضوع پسند کرتے ہیں۔"

برکت کو ذرا غصہ آیا۔ وہ اسے آثارِ قدیمہ کہہ رہی تھی۔ مگر اس نے غصے کو اندر ہی اندر کچل دیا۔ وہ گھر والی نہیں تھی۔ غصہ دکھانے سے بات بگڑ جاتی۔ وہ دونوں ایک دکان سے نکل کر کار کے پاس آئے۔ کسی نے کار کے پیچھے بھاری بھرکم موٹر سائیکل کھڑی کر دی تھی۔ آس پاس بھی گاڑیاں تھیں' کار کو وہاں سے نکالنے کی جگہ نہیں تھی۔ برکت نے بار بار اپنی کار کا ہارن بجایا تاکہ غلط جگہ پارک کرنے والا وہاں آ کر اپنی موٹر سائیکل ہٹا لے۔ مگر کوئی نہیں آیا۔

اس نے نیلما سے کہا۔ "آثارِ قدیمہ سے تعلق رکھنے والی عمارتیں کھنڈر کہلاتی ہیں' وہ اتنی شکستہ اور کمزور ہوتی ہیں کہ ایک نئی اینٹ کا بوجھ برداشت نہیں کر پاتیں۔ میں ایک اینٹ تو کیا پوری نئی نسل کو اٹھا کر ادھر سے اُدھر پھینک سکتا ہوں۔"

وہ پہلوانی انداز میں چلتا ہوا موٹر سائیکل کے پاس آیا پھر اس نے نیلما کے دیکھتے ہی دیکھتے اس بھاری بھرکم گاڑی کو دونوں ہاتھوں میں اٹھا لیا' یہ ویٹ لفٹنگ کا کمال تھا۔ راستہ چلنے والے ٹھٹک گئے' قریب سے گزرنے والی گاڑیاں رک گئیں۔ اس کے سر کے بال سفید تھے' مونچھیں سفید تھیں' دور سے عمر نمایاں تھی اور دور سے اس کی شہ زوری بڑھاپے کو جھٹلا رہی تھی۔ وہ اطمینان سے موٹر سائیکل اٹھائے ایک طرف

گیا پھر ذرا فاصلے پر آہستگی سے اسے نیچے رکھ دیا۔

کتنے ہی لوگ تالیاں بجانے لگے۔ وہ فاتحانہ انداز میں چلتا ہوا نیلما کے پاس آیا‘ اس کے لئے اگلی سیٹ کا دروازہ کھولا۔ وہ چپ چاپ بیٹھ گئی اور کچھ سحرزدہ سی ہو کر سوچنے لگی۔ یہ تو سپرمین ہے۔ کیا سپرمین پر بڑھاپا نہیں آتا؟

اس نے کار اسٹارٹ کرکے وہاں سے نکالی۔ پھر ڈرائیو کرتے ہوئے بولا۔ ”اب تو خاموش نہ رہو۔“

نیلما نے بے اختیار پوچھا۔ ”آپ کی عمر کیا ہوگی؟“

”ساٹھ برس۔“

وہ ذرا کنجوسی سے مسکرائی پھر بولی۔ ”آپ مذاق کر رہے ہیں۔“

جوانی کا زور دکھا کر سچ بولو تو بڑھاپے کا یقین نہیں ہوتا۔ اس نے کہا۔ ”آنکھیں جو دیکھتی ہیں‘ وہی سچ ہوتا ہے۔ تمہاری آنکھیں میری شہ زوری کو دیکھیں گی تو عمر کچھ ہوگی۔ سفید بالوں کو دیکھیں گی تو کچھ اور ہوگی۔ سمندر ہزاروں لاکھوں برس کا بوڑھا ہے مگر اس کی لہریں آج بھی جوان ہیں۔ ساحلی چٹانوں کو ٹکریں مار مار کر توڑ دیتی ہیں۔ جس طرح موتی سیپ میں بند ہوتا ہے اسی طرح منہ زور لہروں کی جوانی بوڑھے سمندر کے اندر چھپی ہوتی ہے۔ تمہیں رفتہ رفتہ معلوم ہوگا‘ مرد اور سمندر کبھی اندر سے بوڑھے نہیں ہوتے۔“

اس نے ایک بیوٹی پارلر کے سامنے گاڑی روک دی۔ نیلما کے ساتھ گاڑی سے نکل کر دکان کے اندر آیا۔ ایک معمر خاتون نے مسکرا کر خوش آمدید کہا۔ وہ بولا۔ ”یہ نیلما ہے‘ میری کزن۔ قدرت نے اسے بڑی فراخ دلی سے حسن دیا ہے اور قدرت نے تمہارے ہاتھوں میں شراب کو دو آتشہ بنانے کا ہنر دیا ہے۔ اسے نکھارنے اور سنوارنے میں جتنی بھی محنت کر سکتی ہو کرو۔ معاوضے کی فکر نہ کرو جو تمہاری زبان سے نکلے گا وہی دوں گا۔ یہ ایڈوانس رکھو۔“

اس نے پیشگی ایک ہزار روپے دے کر کہا۔ ”میں ایک گھنٹے بعد آؤں گا۔“

”اگر آپ اسے مکمل دیکھنا چاہتے ہیں تو تین چار گھنٹے بعد آئیں۔“

”اچھی بات ہے‘ میں اطمینان سے آؤں گا۔“

اس نے نیلما کے شانے پر ہاتھ رکھ کر خدا حافظ کہنا چاہا‘ وہ جلدی سے سمٹ کر

ایک طرف ہوگئی۔ اس نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ”کوئی بات نہیں‘ میں ابھی آؤں گا۔“

وہ دکان سے باہر آیا پھر کار کی اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ سوچنے لگا۔ ”سہمی ہوئی ہرنی ہے‘ آہستہ آہستہ مانوس ہوگی۔“

وہ کار اسٹارٹ کرنا چاہتا تھا کہ اسی وقت نادرہ دکھائی دی۔ وہ سامنے والے فٹ پاتھ پر شہزاد کے ساتھ جا رہی تھی۔ اس نے ڈھیر سارا میک اپ کیا تھا نہایت قیمتی لباس پہنے ہوئے تھی۔ اس کے زیورات میں لاکھ دو لاکھ کے ہیرے بھی جڑے ہوئے ہوں گے مگر اس سے کیا ہوتا ہے‘ کھنڈر کو رنگ برنگے قمقموں سے سجایا جائے تب بھی وہ شادی محل تو نہیں کہلاتا۔

برکت نے ناگواری سے کہا۔ ”اُلو کی پٹھی‘ آئینہ نہیں دیکھتی ہے‘ اس جوان کے ساتھ ایسی لگ رہی ہے جیسے ماں اپنے بچے کو انگلی پکڑ کر شاپنگ کے لئے جا رہی ہو۔“

ایسا سوچتے وقت وہ خود کو بھول رہا تھا نیلما کو شاپنگ کراتے وقت کتنے ہی دکانداروں نے اسے انکل کہا تھا اور نیلما کو بے بی کہتے رہے تھے۔ اس حساب سے وہ دونوں کو باپ بیٹی سمجھ رہے ہوں گے۔ وہ انکل کہلانے پر برا مانتا تھا مگر ہر ایک سے جھگڑا کرکے اپنی شہ زوری کے حوالے سے جوانی کا ثبوت پیش نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اپنے طور پر مطمئن تھا کہ جوانی اندر سے قائم ہے اور شاید دائم بھی ہوگی۔

وہ تین گھنٹے تک کاروباری معاملات میں مصروف رہا اور نادرہ کے ساتھ نظر آنے والے جوان کے متعلق تلخی سے سوچتا رہا۔ یہ بھی تسلیم کرتا رہا کہ اس بزنس مین باپ کی بیٹی نے زبردست نوجوان کا انتخاب کیا ہے۔ شہزاد ہر اعتبار سے خوبرو اور گبرو جوان کہلانے کا مستحق تھا اگر نیلما‘ نادرہ کے انتخاب پر بھاری نہ پڑی تو بڑی سبکی ہوگی۔ وہ یہی سوچ کر پریشان ہو رہا تھا۔ نیلما کو جلدی سے جلدی دیکھنا چاہتا تھا کہ اس کا حسن بیوٹی پارلر میں دو دھاری تلوار بن جائے گا یا نہیں؟

وہ بیوٹی پارلر کے ویٹنگ روم میں پہنچا۔ میڈم نے کہا۔ ”آپ تشریف رکھیں۔ ابھی اسے تیار کیا جا رہا ہے۔“

اس نے کہا۔ ”چار گھنٹے گزرنے والے ہیں‘ وہ ابھی تک تیار نہیں ہوئی؟“

"مسز' آپ نے فرمایا تھا' زیادہ وقت اور زیادہ توجہ کے ساتھ اسے جنت سے زمین پر اتارا جائے۔"

وہ خوش ہو کر بولا۔ "ہاں ہاں' ٹھیک ہے میں نے یہی کہا تھا۔ آپ جائیں' توجہ دیں۔ میں یہاں آرام سے بیٹھا رہوں گا۔"

میڈم ویٹنگ روم سے نکل کر نیلما کے پاس آئی۔ وہ آدم قد آئینے کے سامنے کھڑی حیرانی سے اپنے حسن و جمال کو دیکھ رہی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا کوئی دوسری نیلما سامنے کھڑی ہے جو پیدائش کے وقت سے اس کے اندر چھپی ہوئی تھی۔ اس نے کہا۔ "میڈم! مجھے یقین نہیں آرہا ہے کہ یہ میں ہوں۔ میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ میرے اندر حسن بھرا ہوا ہے۔"

میڈم نے کہا۔ "حسن ہر انسان کے اندر چھپا ہوتا ہے۔ کوئی علم کے ذریعے حسن کو کرید کر عالم بن جاتا ہے۔ کوئی اپنی لگن سے حسن کو اجاگر کرکے ہنر مند کہلاتا ہے اور کوئی دولت کے ذریعے کسی غریب نیلما کے.......... اندر سے حسن کو دریافت کرلیتا ہے۔ حسن باہر سے دیکھنے کی چیز ہے لیکن یہ ہمیشہ اندر ہوتا ہے' جو اسے باہر لے آتا ہے' وہی حسین کہلاتا ہے۔"

"کیا ابھی اور محنت کریں گی؟"

"اتنی ہی کافی ہے' مسٹر برکت انتظار کررہے ہیں۔ میں چاہتی ہوں' تم ابھی نہ جاؤ۔ ذرا انتظار کرنے دو میری بات سمجھ رہی ہو نا؟"

وہ سمجھ رہی تھی لیکن انتظار محبوب کو کرایا جاتا ہے تاکہ اس کے دل میں دیدار کی آرزو شدید ہوتی رہے۔ برکت جیسے خریدار کے دل میں وہ اپنی آرزو پیدا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ جب سے آئینے کے سامنے نکھر رہی تھی اور سنور رہی تھی تب سے ناصر کے سامنے جانے کی بے چینی بڑھتی جارہی تھی۔ ایک خیال تھا کہ وہ اس نئے روپ میں اسے دیکھ کر حیران رہ جائے گا اور دیوانہ وار اسے دیکھتا رہے گا۔ کچھ بولنا بھول جائے گا پھر خیال آیا تھا' پرائی دولت سے تراشے ہوئے حسن پر برہم ہوگا۔ وہ پچھلی رات اس سے ملنے گئی تھی۔ اسے اپنا دکھڑا سنایا تھا اور بتایا تھا کہ ایک دولت مند اسے خرید رہا ہے۔ وہ کبھی بکنے کے لئے تیار نہ ہوتی لیکن اپنی زندگی داؤ پر لگا کر دو بڑی بہنوں کو دھوم دھام سے سہاگن بنا سکتی ہے۔

ناصر نے بے بسی سے کہا۔ "میرے والدین تمہیں بہو بنالیں گے۔ جہیز کے بغیر تمہیں قبول کرلیں گے لیکن تمہاری بہنوں کے لئے کچھ نہیں کرسکیں گے۔ ویسے برا نہ ماننا تمہاری بہنیں خود غرض ہیں۔ تمہیں اپنے مفادات کے لئے قربان کررہی ہیں۔"

"ایسا نہ کہو۔ حسنہ آپا نے ماں بن کر میری پرورش کی ہے۔ وہ تیس برس کی ہوگئی ہیں۔ انہیں دیکھتی ہوں تو جان دے کر انہیں سہاگن بنانے کو جی چاہتا ہے۔ جان دینا کچھ مشکل نہیں ہوتا لیکن دولت مند جو چاہتا ہے' اسے ضمیر نہیں مانتا۔ میں تمہارے لئے ہوں' صرف تمہارے لئے۔ مگر ان حالات میں کیا کروں؟"

ناصر نے کہا۔ "اس بڈھے کو دو دن تک کسی طرح ٹالتی رہو۔ خود کو بچائے رکھنے کی کوشش کرو۔ امتحان کے دو پرچے رہ گئے ہیں۔ اس کے بعد میں اس خریدار سے نمٹ لوں گا۔ تم اپنی بہنوں کے لئے ضمیر کے خلاف نہ جاؤ۔ اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ اس بڈھے کا نام اور پتا بتاؤ۔"

"آپا نے یا میڈم نے اس کا نام لیا تھا۔ میں نے دھیان نہیں دیا۔ میں کل معلوم کرکے آؤں گی۔"

آج نیلما نے معلوم کیا تھا کہ اس کا نام بابو برکت علی ہے۔ باڈی بلڈر بھی ہے اور پلازہ بلڈر بھی نئی کاریں چور دروازوں سے امپورٹ کرتا ہے۔ ایک فائیو اسٹار ہوٹل کا مالک ہے اور بڑے بڑے منسٹروں تک اس کی پہنچ ہے۔ نیلما نے گھبرا کر سوچا۔ یہ بوڑھا خطرناک ہے۔ ناصر کو اس سے دور رکھنا چاہئے۔ ورنہ یہ میرے چاہنے والے کو الٹے سیدھے کیس میں پھنسوا دے گا۔

وہ خیالات سے چونک گئی۔ بیوٹی پارلر کے آدم قد آئینے میں برکت نظر آرہا تھا۔ اس کے پیچھے کھڑا ہوا یوں آنکھیں پھاڑ رہا تھا جیسے پہلی بار دیکھ رہا ہو۔ میڈم سے کہہ رہا تھا۔ "آپ نے کمال کردیا سچ مچ ایسا لگتا ہے' میرے لئے جنت اتاری گئی ہے۔ بھئی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے کاش' میں پہلوان نہ ہوتا' شاعر ہوتا۔"

اس نے میڈم کو دو ہزار روپے دیئے پھر نیلما کے ساتھ باہر آیا۔ کار میں بیٹھتے ہوئے سوچنے لگا۔ اچھا ہوا میں شاعر نہ ہوا۔ شاعر کے حالات اسے جوانی میں بھی جوان نہیں رہنے دیتے۔ جب کہ میں بڑھاپے میں بھی شیر نر ہوں۔ عمر بھر شعر کہنے سے بہتر ہے' آدمی شیر بنا رہے۔

نیلما نے پوچھا۔ "ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

"مجھے اپنی خبر نہیں ہے' تمہیں دیکھ رہا ہوں اور خود کو بھول رہا ہوں۔ تم بتاؤ کہاں چلنا چاہتی ہو؟"

"میں بہت تھک گئی ہوں۔ گھر میں آرام کرنا چاہتی ہوں۔"

"ٹھیک ہے ابھی چار بج رہے ہیں' سات بجے تک آرام کرو پھر آؤں گا اور تمہیں ڈنر کے لئے لے جاؤں گا۔"

"اگر میں آج رات کہیں نہ جاؤں تو کیا حرج ہے؟"

"تم خود سوچو' آج میں نے تقریباً پچاس ہزار روپے کے قالین' پردے اور فرنیچر دلائے ہیں پچیس ہزار سے زیادہ کی شاپنگ کرائی ہے۔ تمہارے حسن کو چار چاند لگائے ہیں۔ تمہیں ساتھ لے کر ہوٹلوں اور کلبوں میں نہیں جاؤں گا تو اتنی محنت اور دوڑ دھوپ کا مجھے صلہ کیا ملے گا؟"

"آپ درست کہتے ہیں۔ میں آپ کے حکم سے انکار نہیں کروں گی۔"

"یہ حکم والی بات نہ کرو۔ میں آقا نہیں ہوں' تم لونڈی نہیں ہو۔ میں تمہیں محبت سے جیتنا چاہتا ہوں۔"

"آپ وعدہ کریں۔ کچھ روز ہمارے درمیان فاصلہ رہے گا۔"

"کتنا فاصلہ؟"

"جتنا اب ہے۔"

"اس نے ڈرائیو کرتے ہوئے پاس بیٹھی ہوئی حسن و شباب کی نوخیز مورت کو دیکھا۔ پھر کہا۔ "ابھی ایک بالشت کا فاصلہ ہے یہ مجھے منظور ہے۔"

وہ اس عمر میں پکا بزنس مین بن چکا تھا۔ وہ کل سے اب تک رقم پھینکتا آیا تھا۔ آئندہ نیلما کا کوئی رشتے دار یا ہمدرد اعتراض کرنے آتا تو اس لڑکی کو نجات دلانے کے لئے اتنی بڑی رقم ادا نہیں کر سکتا تھا۔ سودا پکا تھا۔ ایڈوانس کی رقم اتنی تگڑی تھی کہ نیلما پھڑپھڑا کر رہ جاتی۔ یہ بات وہ بھی سمجھ رہی تھی۔ ناصر اس کی خاطر جان دے سکتا ہے' اتنی رقم کا بندوبست نہیں کر سکتا تھا۔

☆======☆======☆

شہزاد نئے قیمتی سوٹ میں جچ رہا تھا۔ کافی ہاؤس کی اس میز پر نادرہ کے سامنے

بیٹھا دھیمی آواز میں باتیں کر رہا تھا۔ وہ کن انکھیوں سے آس پاس دیکھ رہی تھی اور خوش ہو رہی تھی۔ دور تک میزوں کے اطراف بیٹھے ہوئے رومانی جوڑے اپنے رومانس کے دوران اسے اور شہزاد کو دیکھتے جاتے تھے۔ دیکھنے کا اپنا اپنا زاویہ ہوتا ہے۔ کوئی لڑکی شہزاد کی خوبروئی کو بے اختیار دیکھنے لگتی تھی کوئی نادرہ کی امارت کا اندازہ کرتا تھا۔ ایک شخص اپنی میز پر اپنی محبوبہ کی طرف جھک کر کہہ رہا تھا۔ "یاد ہے' یہ نوجوان پرسوں اسی وقت کافی ہاؤس میں آیا تو لنڈے کا لباس پہنے ہوئے تھا۔"

"ہاں' ابھی میں یہی سوچ رہی تھی کہ یہ راتوں رات امیر بن گیا ہے۔"

"آج کل کے بے روزگار نوجوان اگر ہینڈسم ہوں تو ان راہوں پر روزگار سے لگ جاتے ہیں۔ میں یقین سے کہتا ہوں' اس مالدار عورت نے اسے خوابوں کا شہزادہ بنایا ہے۔"

دوسری میز پر ایک عورت نے اپنے ساتھی سے کہا۔ "میرا خیال ہے' یہ نوجوان تاریخ کا اسٹوڈنٹ ہے۔ اس مالدار عورت کو یوں دیکھ رہا ہے جیسے پانی پت کے میدان میں خم ٹھونک کر آگیا ہو۔"

اسی وقت برکت نیلما کے ساتھ کافی ہاؤس میں داخل ہوا۔ نادرہ نے اُدھر دیکھا تو اوپر کی سانس اوپر رہ گئی وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اتنی حسین و جمیل لڑکی برکت کے ہاتھ لگ جائے گی۔ شہزاد کی نظریں نیلما پر سے ہٹنا نہیں چاہتی تھیں لیکن روزگار کا معاملہ تھا۔ دال روٹی کا سوال تھا۔ وہ ادھر سے منہ پھیر کر باسی ڈبل روٹی کو دیکھنے لگا تھا۔

نادرہ نے ناگواری سے کہا۔ "اس کی بیٹی لگتی ہے۔"

اب وہ بیٹی لگے یا گرل فرینڈ' برکت تو حملے کرنے آیا تھا۔ وہ اس کے دائیں طرف والی میز پر آکر نیلما کو ایسی جگہ بٹھا رہا تھا جہاں سے شہزاد کا مسلسل سامنا ہوتا رہتا۔ وہ جوان نادرہ سے گفتگو کرتا مگر نظر نیلما پر بھی پڑتی رہتی۔

کافی ہاؤس کے اندر بڑی دلچسپی پیدا ہوگئی۔ جو لوگ دوسروں کے معاملات میں دلچسپی نہیں لیتے تھے' وہ بھی رہ رہ کر سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگتے تھے کیونکہ وہ عجوبہ تھے۔ ایک معمر خاتون نوجوان فرینڈ کے ساتھ تھی اور ایک بوڑھا شخص انتہائی کم سن لڑکی کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ وہاں ماں بیٹے کے ساتھ اور باپ بیٹی کے ساتھ نہیں آیا

تھا۔ اس لئے ان کے تعلقات سوالیہ نشان نہیں تھے۔ سوال یہ تھا کہ معمر خاتون کی میز پر روبرو جوان تھا اور دوسری میز پر (ذرا فاصلہ ہی سہی) بوڑھا بھی روبرو تھا۔ کیا وہ خاتون اس جوان اور بوڑھے کا موازنہ کر رہی تھی؟

دوسری طرف نوجوان کے بالمقابل معمر خاتون تھی اور دوسری میز پر (ذرا فاصلے پر ہی سہی) نوجوان حسین دوشیزہ تھی۔ سوال یہ تھا کہ وہ جوان اس خاتون پر اکتفا کرے گا یا دوشیزہ کی طرف پھسل جائے گا؟

برکت کا حملہ کامیاب ہو رہا تھا۔ شہزاد نادرہ سے باتیں کرتے کرتے بے اختیار نیلما کو دیکھ لیتا تھا جب کہ شعوری طور پر دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ قدرتی تقاضوں کو سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ جوانی جوانی کو کھینچ رہی تھی۔ بڑھاپا جوانی کو لگام نہیں دے سکتا۔ یہ موٹی بات سب سمجھتے ہیں' اس وقت وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

نادرہ نے دانت پیستے ہوئے آہستگی سے کہا۔ "شہزاد میں تمہاری نظریں دیکھ رہی ہوں۔ کیا تم یہاں میری انسلٹ کرنے آئے ہو۔"

"اوہ نو! اللہ جانتا ہے' تم میرے لئے سب سے زیادہ اہم ہو۔ میرے خاندان سے زیادہ میری جان سے زیادہ اہم ہو۔ میں ایسی ہزاروں دوشیزاؤں کو تم پر قربان کر سکتا ہوں۔"

"پھر اسے کیوں دیکھ رہے ہو؟"

"اسے نہیں' اس کی آنکھوں میں بوڑھے کو دیکھ رہا ہوں۔ ذرا تم بھی دیکھو' لڑکی پریشان ہے جیسے بوڑھا زبردستی اسے اٹھا لایا ہو۔"

نادرہ خوش ہو کر بولی۔ "تم بالکل درست سمجھ رہے ہو۔ یہ پہلوان ہے۔ بڑے داؤ استعمال کرتا ہے اور حریف کو چت کر دیتا ہے۔"

"کیا تم اسے جانتی ہو؟"

"ہاں' یہ مجھے شکست دینا چاہتا ہے لیکن اس سے پہلے میں اسے منہ توڑ جواب دینا چاہتی ہوں۔ میں جیسا کہوں ویسا کرو گے؟"

"جان دے کر بھی کروں گا۔"

"اس لڑکی کو بوڑھے کی طرف سے پھیر دو۔"

"کیسے پھیر دوں؟"

"کچھ بھی کرو۔ اسے محبت کے جال میں پھانس لو۔"

"یہ کیا کہہ رہی ہو' میں اس سے محبت کروں؟"

"میں اجازت دے رہی ہوں۔ تم اسے جتنی جلدی بوڑھے سے دور کرو گے' اتنا ہی زیادہ تمہیں انعام دوں گی۔ تم ابھی اسے بوڑھے سے توڑ دو گے تو میں تم سے شادی کر لوں گی۔"

وہ بڑے جوش میں بول گئی۔ پھر اس نے چونک کر برکت کو دیکھا' وہ نیلما سے مسکرا کر باتیں کر رہا تھا۔ شہزاد نے پوچھا۔ "تم.........تم مجھ سے شادی کرو گی؟"

"آں؟ نہیں' میں کچھ اور کہنا چاہتی تھی۔ مم.........میں کہنا چاہتی تھی' اس لڑکی سے تمہاری شادی کرا دوں گی۔ تمہیں بہت بڑے کاروبار کے لئے بہت بڑی رقم دوں گی۔ مگر کوئی کمال دکھاؤ۔ فوراً دکھاؤ۔"

"تم بہت بڑی آفر دے رہی ہو مگر کوئی تدبیر سوچنے کی مہلت دو۔"

"تدبیر ضرور سوچو۔ مگر اسے نظر بھر کر دیکھنا شروع کر دو۔ وہ دیکھے تو مسکراؤ۔ کیا لڑکی پھانسنے کا طریقہ میں تمہیں بتاؤں۔ تمہارے پاس عقل نہیں ہے؟"

وہ دانت نکال کر مسکرانے لگا کیونکہ اسی وقت نیلما نے اسے دیکھا تھا اس کے مسکرانے کے انداز پر وہ بے اختیار ہنسنے لگی۔ شہزاد نے آہستہ سے کہا۔ "تعجب ہے' یہ تو پہلی نظر میں پھنس گئی۔ اب کیا کروں؟"

نادرہ اسے گائیڈ کرنے لگی۔ اُدھر برکت نے نیلما سے پوچھا۔ "کس بات پر ہنس رہی ہو؟"

وہ بولی۔ "وہ جو نوجوان ہے' احمقوں کی طرح دانت نکال کر مسکرا رہا تھا۔ کچھ نروس لگ رہا تھا۔"

"اسے اُلو بناؤ۔ ذرا تماشا رہے گا۔"

"مجھے اچھا نہیں لگتا۔ میرے اسکول کی ایک لڑکی اکثر ایک جوان کو احمق سمجھ کر اور احمق بنایا کرتی تھی۔ ایک روز پھنس گئی۔ وہ احمق اسے گن پوائنٹ پر کہیں لے گیا تھا۔"

"میں تمہاری حفاظت کے لئے موجود ہوں اور تم میری شہ زوری دیکھ چکی ہو۔ پلیز اسے اپنے پاس آنے پر مجبور کرو۔"

"پھر کیا ہو گا؟"

"اس کے ساتھ باہر چلی جانا۔ میں تمہارے ساتھ سائے کی طرح لگا رہوں گا۔ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔"

وہ ذرا سوچ کر بولی۔ "جیسا کہہ رہے ہیں' ویسا ہی کروں گی لیکن آپ بھی میری بات مانیں گے۔ اندھیرا ہونے کے بعد سمندر کے کنارے چلیں گے۔"

"یہ بھی کوئی شرط ہے' میں چلوں گا۔"

نیلما نے شنزاد کو دیکھا۔ اس سے نظریں ملتے ہی مسکرائی۔ اس نے خوش ہو کر نیلما سے اشارے میں پوچھا۔ "میں تمہارے پاس آؤں؟"

وہ شرمانے لگی۔ شنزاد کامیابی کا یقین کرتے ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا یہی موقع تھا' وہ حسینہ کو بوڑھے سے توڑ سکتا تھا۔ نادرہ نے دھیمی آواز میں کہا۔ "دیر نہ کرو' جاؤ۔"

وہ آگے بڑھا۔ برکت کی میز پر آیا پھر اسے نظرانداز کرتے ہوئے بولا۔ "مجھے شنزاد کہتے ہیں اور تمہیں؟"

"میں نیلما ہوں۔ فرمائیے؟"

"تمہارے حسن کی جادوگری کھینچ لائی ہے۔ میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

"میں سن رہی ہوں۔"

"یہاں نہیں' کہیں دوسری جگہ چلو۔"

برکت نے پوچھا۔ "اے مسٹر! بات کیا ہے؟"

شنزاد نے کہا۔ "یو شٹ اپ! یہ تمہاری کوئی نہیں لگتی ہے۔ تم اسے کہیں سے لائے ہو۔ میں بھی کہیں لے جا سکتا ہوں۔ یہ خیرات کی شیرینی ہے' کسی کے ہاتھ میں بھی آ سکتی ہے۔"

اتنا کہہ کر وہ ہاتھ پکڑتے ہوئے بولا۔ "چلو میرے ساتھ۔"

وہ ایک جھٹکے سے اٹھتے ہوئے بولی۔ "تم نے میرا ہاتھ پکڑنے کی جرأت کیوں کی؟"

اس نے ایک زوردار طمانچہ رسید کر دیا۔ تڑاخ کی آواز پورے کافی ہاؤس میں گونج گئی۔ تمام لوگ ادھر دیکھنے لگے۔ کچھ اپنی جگہ سے اٹھ کر شنزاد کی طرف آنے لگے۔ کافی ہاؤس کا مالک دوڑتے ہوئے نادرہ بیگم کے پاس آیا پھر بولا۔ "بیگم صاحبہ! یہ

آپ کے ساتھی نے کیا کیا ہے؟ پلیز اسے اپنے پاس بلائیں۔"

نادرہ گم صم بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ جسے بوائے فرینڈ بنا کر لائی ہے' وہ برکت کی گرل فرینڈ سے طمانچہ کھا جائے گا۔ اتنے لوگوں کے سامنے خصوصاً برکت کی طنزیہ نظروں کے سامنے وہ اپنی بے عزتی محسوس کر کے شرم سے گڑی جا رہی تھی۔

کافی ہاؤس کا مالک بیگم کو سکتے کی حالت میں دیکھ کر نیلما اور شنزاد کے درمیان آیا پھر برکت کے سامنے ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "پلیز اور بات نہ بڑھنے دیں۔"

برکت نے کہا۔ "ایک طمانچہ ہی کافی ہے۔ بات نہیں بڑھے گی۔ دراصل اس جوان کا بھی قصور نہیں ہے۔ اس بیچارے کو بڑھاپے کے سحر میں رکھا گیا تھا۔ میرے ساتھ جوانی کی نئی بہار دیکھتے ہی کھنچا چلا آیا۔ اس سے جو گستاخی ہوئی' اس کی سزا مل گئی۔ مگر سزا وہ ناقابلِ برداشت ہوتی ہے جب جوان ساتھی ایک نئی چیز کے لئے پرانی چیز کو ٹھکرا دیتا ہے۔"

نادرہ میں اور کچھ سننے کی تاب نہیں تھی۔ وہ جلدی سے اٹھ کر تیزی سے چلتی ہوئی باہر آ گئی۔ شنزاد اس کے پیچھے دوڑتا ہوا آیا۔ وہ اپنی کار کے پاس رک کر بولی۔ "کتے! کمینے! تو نے میری عزت' میرا غرور خاک میں ملا دیا۔ بھاگ جا یہاں سے۔ میں تیری صورت نہیں دیکھنا چاہتی۔"

"میں تو تمہارے مشورے پر عمل کر رہا تھا۔"

"کیا میں نے تھپڑ کھانے کا مشورہ دیا تھا؟"

"یہ تو ہم سے کسی نے نہیں سوچا تھا کہ وہ ہاتھ اٹھا دے گی۔ وہ مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ سے اور اشارے کا جواب اشارے سے دے رہی تھی۔ اس کی طرف سے حوصلہ پا کر ہی میں نے اس کا ہاتھ پکڑا تھا۔"

وہ اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھ کر کار اسٹارٹ کرنے لگی۔ شنزاد نے کہا۔ "میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ تم نے اس سے محبت کرنے پر مجبور کیا۔ مجھے ایک موقع اور دو۔ مجھ سے ناراض ہو کر نہ جاؤ۔ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

"اونہہ!" وہ حقارت سے بولی۔ "آج سے تیس برس پہلے میں اسے فٹ پاتھ

سے اٹھا کر اپنی زندگی میں لائی تھی۔ اس کا نتیجہ بھگت رہی ہوں۔ تم سب مٹی کے کیڑے ہو تم لوگوں کو مٹی ہی میں رہنا چاہئے۔ گیٹ لاسٹ۔"

اس نے ایک جھٹکے سے کار آگے بڑھائی۔ پھر تیزی سے دور ہوتی چلی گئی۔ شام کی تاریکی چھا رہی تھی۔ برکت نیلما کے ساتھ کافی ہاؤس سے باہر آیا۔ نیلما کے لئے کار کا دروازہ کھولتے ہوئے حقارت سے شہزاد کو دیکھا۔ نیلما اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ وہ کار کے دوسری طرف سے گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ پر آیا پھر اسے اسٹارٹ کرتے ہوئے بولا۔

"میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم اس پر ہاتھ اٹھا دو گی۔"

وہ بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ "یہ ہاتھ صرف میرا چاہنے والا پکڑتا ہے۔ کوئی اور اسے چھونا بھی چاہے تو مجھے آگ لگ جاتی ہے۔"

"تم روانی میں میرے سودے کے خلاف کچھ بول رہی ہو۔"

"میں نے ہوش و حواس میں کہا ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے' پہلی بار اس نے میرے اس ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لیا تھا تو میں نے قسم کھائی تھی' اب یہ ہاتھ کسی کے ہاتھ میں نہیں جائے گا۔"

"جتنی جلدی ہو سکے قسم توڑ دو۔"

"جان چھوڑ سکتی ہوں' قسم نہیں توڑ سکتی۔"

"نادان بچی ہو۔"

"ایسی بھی نادان نہیں ہوں یہ سمجھتی ہوں کہ آپ ہماری اوقات سے بہت زیادہ رقم لگا چکے ہیں۔ ہم بہنیں تمام عمر یہ رقم ادا نہیں کر سکیں گی۔"

"جس کے لئے قسم کھائی ہے' شاید وہ بھی ادا نہ کر سکے۔"

"وہ نقد رقم نہیں دے سکے گا لیکن کسی دوسری صورت سے تمام قرض ادا کر سکتا ہے۔"

وہ حقارت سے بولا۔ "چھوٹے لوگ قسطوں پر ادائیگی کی بات کرتے ہیں۔"

"وہ چھوٹا نہیں ہے۔"

"کتنا بڑا ہے؟"

"اتنا کہ میرے وجود کی کُل کائنات پر چھایا رہتا ہے۔ وہ کہتا ہے' بے شک آدمی آدمی کو کسی نہ کسی پہلو سے خریدتا رہتا ہے کبھی دولت سے' کبھی احساس سے۔ مگر

افسوس محبت سے نہیں خریدتا۔"

"میں دولت کا حساب نہیں کروں گا۔ محبت سے تمہیں خریدنے کی کوشش کروں گا۔"

"آپ کی عمر میں لوگ بچوں سے محبت کرتے ہیں اور جوانوں کو بھی اپنی اولاد سمجھتے ہیں۔"

وہ بھڑک کر بولا۔ "تم مجھے بوڑھا کہہ رہی ہو۔ کیا میری شہ زوری کو بھول چکی ہو؟"

"آپ راستہ بھول رہے ہیں۔ میں نے سمندر کے کنارے چلنے کو کہا تھا۔"

وہ راستہ بدلتے ہوئے بولا۔ "ہم سمندر کی طرف جا رہے ہیں مگر آج چاندنی رات نہیں ہے۔ اندھیرے میں سمندر کا حسن مٹ جاتا ہے۔"

"ایسا بھی اندھیرا نہیں ہوتا یہ اور بات ہے کہ نیم تاریکی بوڑھوں کو مکمل تاریکی لگتی ہے۔"

"تم مجھے چیلنج کر رہی ہو۔ اگر میں ثابت کر دوں کہ نیم تاریکی میں مجھے نظر آتا ہے۔ میں عینک کا محتاج نہیں ہوں اور تمہارے عاشق سے زیادہ جوان ہوں تو اپنی قسم توڑ دو گی؟"

"کیا آپ اس سے پنجہ لڑا سکیں گے؟"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "میں پنجہ ملاتے ہی اس کی انگلیاں توڑ ڈالوں گا۔"

وہ بولی۔ "میں نے اسے سمجھایا تھا کہ آپ پہلوان ہیں دونوں ہاتھوں سے وزنی موٹر سائیکل اٹھا لیتے ہیں مگر وہ سمجھنا نہیں چاہتا کہتا ہے' وہ جوان ہے آپ بوڑھے ہیں فری اسٹائل کشتی میں آپ کی گردن توڑ دے گا۔"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "اسے میرے پاس لے آؤ۔ میں اس کی گردن توڑ دوں گا تو تمہاری قسم آپ ہی آپ ٹوٹ جائے گی۔"

وہ سمندر کی ساحلی سڑک پر آ گئے۔ برکت اسے باتوں میں لگا کر ویران ساحل کی سمت جا رہا تھا۔ کچھ دور جا کر اس نے گاڑی روک دی پھر کہا۔ "آؤ' ہم ٹھنڈی ریت پر چلیں۔"

نیلما نے ونڈ سکرین کے پار دور تک دیکھا پھر کہا۔ "ذرا آگے چلیں پھر کار سے

اتریں گے۔"

وہ خوش ہو گیا۔ تنہائی اور ویرانے میں کچھ رومانس کا موقع مل سکتا تھا۔ نیلما کی طرف سے اعتراض کی توقع تھی مگر وہ توقع کے خلاف کچھ اور ویرانے میں چلنے کو کہہ رہی تھی۔ اس نے کار آگے بڑھا دی ہیڈ لائٹس کو بجھا دیا۔ نیلما نے پوچھا۔ "لائٹس کیوں بجھا دیں؟"

"میں دکھانا چاہتا ہوں کہ چاند نہ نکلا ہو' رات اندھیری ہو تو میں ستاروں کی روشنی میں بھی ڈرائیو کر سکتا ہوں۔"

اس نے بجھانے کو تو ہیڈ لائٹس بجھا دی تھیں لیکن یہ بھول گیا تھا کہ اچانک روشنی چلی جائے تو تاریکی سے زیادہ تاریکی چھا جاتی ہے۔ اس کے سامنے ونڈ سکرین کے پار الٹے توے کی سیاہی چھائی ہوئی تھی۔ اس کے باوجود وہ اپنی کمزوری ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ سنبھل سنبھل کر گاڑی چلا رہا تھا۔ ساحلی سڑک کی چوڑائی کا اندازہ تھا۔ اسی اندازے نے اس کا بھرم رکھ لیا تھا۔

نیلما نے کہا۔ "ہم بہت دور آ گئے ہیں۔"

اس نے اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے فوراً گاڑی روک دی۔ وہ دور تک دیکھنے کے لئے ہیڈ لائٹس آن کرنا چاہتا تھا اسی وقت نیلما نے کہا۔ "ستاروں کی روشنی میں سمندر کتنا پُراسرار لگ رہا ہے۔"

وہ کھڑکی کے باہر دیکھتے ہوئے بولا۔ "واقعی۔" حالانکہ کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ صرف لہروں کا شور سنائی دے رہا تھا۔ وہ دونوں کار سے باہر نکلے۔ آسمان پر دور تک ستارے دکھائی دے رہے تھے۔ ان کی روشنی میں قریب کا راستہ کسی حد تک دکھائی دینے لگا۔ نیلما سمندر کی طرف بڑھتی جا رہی تھی' ایک پرچھائیں کی طرح نظر آ رہی تھی۔ وہ اس کے پیچھے چل پڑا۔

وہ دوڑتی ہوئی اور آگے چلی گئی۔ ستاروں کی روشنی کے باوجود نگاہوں سے مٹ رہی تھی۔ پھر مٹنے سے پہلے ہی اس کے قریب دوسرا سایہ نظر آیا وہ بولی۔ "آباد کرنے والا موجود ہو تو ویرانہ ویرانہ نہیں رہتا۔"

برکت نے آنکھیں پھاڑ کر گرجتے ہوئے پوچھا۔ "کون ہے یہ؟"

نیلما کی آواز آئی۔ "آپ پوچھتے کیوں ہیں۔ میرا ہاتھ دیکھ لیں۔ یہ ہاتھ ان

ہاتھوں میں ہے جن کے لئے میں جان چھوڑ سکتی ہو قسم نہیں توڑ سکتی۔"

اسے دو مٹے مٹے سے سائے نظر آ رہے تھے۔ دوسرے کا چہرہ دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن وہ سمجھ گیا۔ سر ہلا کر بولا۔ "اچھا تو تم اس کے لئے یہاں آنا چاہتی تھیں۔ میں حیران تھا کہ ویرانے میں بے خوف و خطر کیسے آ گئی ہو؟ کیا یہ پنجہ لڑائے گا؟"

جوان مرد کی آواز آئی۔ "لڑاؤں گا۔"

"بچو! اگر لکھتا پڑھتا ہے تو چند منٹ کے بعد انگلیوں سے قلم نہیں پکڑ سکے گا۔ میں نے آج تک کشتی نہیں ہاری کسی میدان میں شکست نہیں کھائی' میری ہر فتح میری طول پکڑتی ہوئی جوانی کا ثبوت ہے۔"

"میں صرف پنجہ نہیں لڑاؤں گا' تجھے فری اسٹائل میں پچھاڑ کر اپاہج کر دوں گا۔"

برکت اس بات پر ہنسنا چاہتا تھا۔ پھر سوچ میں پڑ گیا کہنے لگا۔ "جوان تیری آواز کچھ جانی پہچانی سی ہے۔"

"کیا مقابلے کے خوف سے جان پہچان پیدا کرنا چاہتا ہے؟"

"بکواس مت کر' تو بڑی سے بڑی سفارش لے کر آئے گا تب بھی تجھے پچھاڑ کر اس لڑکی کو اپنی جوانی کا زور دکھاؤں گا۔"

"مجھے تو ایک بوڑھے پہلوان سے لڑتے ہوئے ندامت سی ہو رہی ہے۔ ذرا سوچ کر بتا تو نے بھری جوانی میں کسی بوڑھے پہلوان سے مقابلہ کیا ہے؟"

"اس سوال کا مقصد کیا ہے؟"

"یہی کہ مقابلہ کیا ہے تو اس بوڑھے پہلوان کی شکست کو یاد کر کے نیلما کے حصول سے باز آ جا اور واپس چلا جا۔"

برکت باتوں کے دوران قریب آ کر پینترا بدلنے لگا۔ وہ جوان قریب سے مکمل سائے کی طرح دکھائی دے رہا تھا' اس پر آسانی سے حملہ کیا جا سکتا تھا۔ نیلما دور ہو گئی۔ برکت نے حملہ کیا۔ وہ بچ گیا۔ دوسرے حملے میں جوان نے اچانک ہی پلٹا کھایا۔ پھر دھوبی پاٹ کا داؤ استعمال کرتے ہوئے اسے دور پھینک دیا۔ ریت پر گرتے ہی برکت کے حلق سے کراہ نکلی۔ وہ ایسے وقت فوراً ہی اچھل کر کھڑا ہو جاتا تھا لیکن اس وقت اٹھ نہ سکا۔ ریڑھ کی ہڈی دکھنے لگی تھی۔

جوان نے کہا۔ "دادا جانی! میں تیرا پوتا ناصر پہلوان ہوں۔ آج سے کوئی چالیس برس پہلے تو نے اسی جگہ میرے ایک بزرگ کو پچھاڑا تھا۔ میں نے اس کا انتقام نہیں لیا ہے۔ تجھے پہلے ہی سمجھایا تھا کہ کسی بوڑھے پہلوان کی شکست کو یاد کرے۔ مگر تو گزری ہوئی جوانی کی لاش اٹھائے گھومتا ہے۔ اپنی بزرگی پر فخر نہیں کرنا چاہتا۔"

بابو برکت علی جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا۔ وہ برسوں بعد اپنے پوتے کی آواز سن رہا تھا۔ وہاں روشنی ہوتی تو بھی شاید ناصر کو صحیح طور پر پہچان نہ پاتا۔ کیوں کہ دوسری شادی کے بعد وہ برس دو برس میں پہلی بیوی، بیٹوں اور بہنوں سے سرسری ملاقات کے لئے جاتا تھا اور انہیں جائیداد خریدنے اور کاروبار کرنے کے لئے لاکھوں روپے دے کر چلا آتا تھا۔ نادرہ کو طلاق دینے کے بعد اسے اپنے بیٹوں اور پوتوں کی اہمیت کا پتا چلا تھا۔ کیونکہ ان سے اس کے نام کا سلسلہ چلنے والا تھا۔ نادرہ نے کوئی اولاد پیدا نہیں کی تھی۔

ان حالات میں وہ پہلوان پوتا ناصر بہت اہم اور بہت پیارا تھا۔ کیونکہ دادا کے نقشِ قدم پر پہلوانی کر رہا تھا۔ آج اس نے دادا کو پچھاڑ کر گزری ہوئی باتیں یاد دلائی تھیں اور کہہ رہا تھا۔ "دادا جانی! گستاخی کی معافی چاہتا ہوں، ویسے دنگل میں بھائی کو اور بیٹا باپ کو پچھاڑتا ہے۔ تجھے یہ تسلیم کرلینا چاہئے کہ پہلوان کبھی شہ زور نہیں ہوتا۔ جوانی شہ زور ہوتی ہے اور یہی جوانی پرانی ہو کر آنے والی نئی جوانی سے مات کھاجاتی ہے۔"

اس نے نیلما کی کمر میں ہاتھ ڈال کر کہا۔ "میں اسے لے جارہا ہوں۔ یہ تیری ہونے والی بہو ہے۔ جو لوگ طاقت سے زیر نہیں ہوتے وہ رشتوں کی نزاکت سے مات کھاجاتے ہیں۔"

وہ نیلما کے ساتھ جانے لگا۔ برکت سر جھکائے ریت پر بیٹھا رہ گیا۔ اس کے سامنے سمندر کی لہریں اچھل رہی تھیں۔ ایک دوسرے کے پیچھے دوڑ رہی تھیں، پلٹ رہی تھیں، جوانی کی شرارتیں کر رہی تھی۔ سمندر ہزاروں لاکھوں برس کا بوڑھا تھا۔ مگر اس کے اندر جوانی لہر لہر موجیں مار رہی تھی۔ ناصر بھی ایک جوان لہر تھا جو بوڑھے کے بطن سے نکل کر جارہا تھا۔

☆------☆------☆

غیرت مند

جیل سے فرار ہونے والے دو مجرموں کی دلچسپ کہانی۔ دونوں نے غیرت کی خاطر قتل کیا تھا اور دونوں کا دعویٰ تھا کہ وہ غیرت مند ہیں۔ ایک نوجوان لڑکی نے ان کی غیرت مندی کو امتحان میں ڈال دیا تھا۔

جنگل کا سناٹا بھاگتے ہوئے قدموں سے دھمک رہا تھا۔ درختوں پر آرام کرنے والے پرندے سہم کر اڑ گئے تھے اور فضا میں شور مچاتے ہوئے چاروں طرف منڈلا رہے تھے۔ جنگل کی جھاڑیوں میں جیسے طوفان آگیا تھا۔ وہ اِدھر سے اُدھر لرز رہی تھیں اور اطراف میں پھیل کر بھاگنے والوں کو راستہ دے رہی تھیں۔ جب گھنے جنگلات کا سلسلہ ختم ہوا تو وہ بھاگنے والے ایک کھلے میدان کے سرے پر پہنچ کر ہانپنے لگے۔ وہ تعداد میں دو تھے۔ شدید سردی کے باوجود مسلسل بھاگتے رہنے کے باعث وہ پسینے سے شرابور ہو رہے تھے۔ ان کے چہروں اور آنکھوں سے وحشت برس رہی تھی۔ وہ جنگلی درندوں کی طرح مسلسل ہانپ رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر اس بات کا اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ کہاں سے فرار ہو کر آرہے ہیں۔ کیونکہ ان کے بدن پر قیدیوں کے لباس موجود تھے۔

تھوڑی دیر تک وہ اپنی سانسوں کو درست کرتے رہے اور چاروں طرف یوں گھور رہے تھے جیسے اس جگہ کو پہچاننے کی کوشش کر رہے ہوں یا اپنے لئے کوئی شکار تلاش کر رہے ہوں یا پھر اپنے لئے کسی پناہ گاہ کے متلاشی ہوں۔ جب ان کی سانسیں درست ہوگئیں تو وہ پھر دوڑتے ہوئے اس میدان کو عبور کرنے لگے۔ آگے چل کر پھر درختوں اور جھاڑیوں کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ وہاں ہری ہری گھاس تھی۔ دریا کا کنارہ تھا اور دور بہت دور دریا کے کنارے ایک کار کھڑی ہوئی نظر آرہی تھی۔ اس کار سے پرے ذرا فاصلے پر چاندنی بچھی ہوئی تھی۔ چاندنی پر دسترخوان بچھا ہوا تھا۔ دسترخوان پر انواع و اقسام کے کھانے اور پھل سلیقے اور نفاست سے رکھے ہوئے تھے۔ اتنی ہی نفاست سے ایک نوجوان ایک حسینہ کو اپنے بازوؤں میں لئے بیٹھا ہوا تھا۔

وہ دونوں ایک دوسرے کو گہری نظروں سے دیکھنے لگے اور نظروں ہی نظروں

میں سمجھانے اور سمجھنے لگے کہ اب انہیں کیا کرنا ہے پھر وہ ایک ساتھ بیٹھ گئے۔ دونوں ہاتھ زمین پر ٹیک کر گھٹنوں کے بل جانوروں کی طرح آہستہ آہستہ محتاط انداز میں آگے بڑھنے لگے۔ کہیں گھنی جھاڑیاں اور کہیں سبز پتوں والے تناور درخت انہیں چھپا رہے تھے۔ وہ رومانی جوڑا دریا کی طرف رخ کئے بیٹھا تھا اور وہ دونوں ان کی پشت کی جانب تھے۔ گھٹنوں کے بل آواز پیدا کئے بغیر' رینگتے چلے آرہے تھے۔

ذرا قریب پہنچ کر انہوں نے دیکھا کہ نوجوان کے قریب ہی ایک ہولسٹر پڑا ہوا ہے۔ جس میں سے ریوالور کا دستہ جھانک رہا تھا۔ جیل خانے سے فرار ہونے والوں کے لئے ریوالور سب سے زیادہ اہم تھا۔ اس لئے محتاط انداز میں قریب پہنچتے ہی ایک نے ہولسٹر کی طرف ہاتھ بڑھا کر ریوالور کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ نوجوان نے اپنے قریب سرسراہٹ محسوس کرتے ہی پلٹ کر دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی اس حسینہ کے حلق سے ایک چیخ نکل گئی۔ جس مفرور نے ریوالور اپنے قبضے میں لیا تھا اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ہی ہی ہی ہی......... یو نوٹی گرل۔ نو چیخنا نو چلانا۔ میں ایک خطرناک مسخرہ ہوں' ہنستے ہنساتے قتل کر دیتا ہوں۔"

اس کے پیلے پیلے اونچے نیچے دانت' سخت جبڑے اور انگارے جیسی دہکتی ہوئی سرخ آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ ایسا ہی ہوگا جیسا کہ کہہ رہا ہے اور جیسا کہ نظر آرہا ہے۔ موت اور مصیبت ایسے ہی حلیے میں سامنے آتی ہے۔

وہ سہم کر چپ ہوگئی تھی۔ نوجوان نے اسے اپنے ایک بازو کی پناہ میں لیتے ہوئے سخت لہجے میں پوچھا۔

"کون ہو تم لوگ؟"

ریوالور والے نے اپنے دوسرے ساتھی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"چنگیزی! یہ سالا اندھا معلوم ہوتا ہے ہمیں قیدیوں کے لباس میں بھی دیکھ کر پوچھ رہا ہے کہ ہم کون ہیں؟"

چنگیزی دسترخوان پر بیٹھ کر جلدی جلدی کھانے کی چیزوں پر منہ مار رہا تھا۔ جب اس نے اپنے ساتھی کی بات کا جواب دینے کے لئے اپنا منہ اوپر اٹھایا تو اس کا منہ ایک پورے کیلے سے بھرا ہوا تھا۔ ایسی حالت میں اس نے ایک قہقہہ لگایا تو دانتوں کی چکی میں پسا ہوا کیلا چھینٹے اڑاتا ہوا نوجوان جوڑے کے چہروں پر پھیل گیا۔ وہ دونوں جلدی

جلدی اپنا چہرہ صاف کرنے لگے۔ چنگیزی پتہ نہیں کیا کہنا چاہتا تھا۔ وہ سب کچھ بھول کر ان کی حالت پر قہقہے لگانے لگا۔

"دارا! دوسروں کے منہ پر تھوک کر کتنا مزہ آتا ہے۔ ماں قسم ہنستے ہنستے برا حال ہو جاتا ہے۔"

چنگیزی نے یہ کہتے ہوئے بریانی کی ایک پلیٹ، دارا کی طرف بڑھا دی۔ دارا نے ایک مٹھی بریانی اٹھا کر اپنے منہ میں بھرلی۔ اتنی بھرلی کہ اسے چبانے کے دوران کچھ دانے چھلک کر گرنے لگے۔ وہ بھوکے درندوں کی طرح بڑی ہی بدتمیزی سے کھا رہے تھے۔ نوجوان نے دوستانہ انداز میں کہا۔

"ہمارے درمیان کوئی دشمنی نہیں ہے۔ آرام سے بیٹھ کر کھاؤ ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

"تمہیں تو کیا تمہارے باپ کو بھی اعتراض نہیں ہوگا اس لئے کہ ریوالور ہمارے پاس ہے۔ اس دنیا میں جس کے پاس طاقت ہوتی ہے وہی روٹی کپڑا اور مکان کا مالک ہوتا ہے۔ ہاں اب روٹی کے بعد ہمیں کپڑوں کی ضرورت ہوگی۔ اگر تمہارے پاس دوسرا لباس ہے تو ہمیں دے دو' نہیں تو اپنا یہ لباس اتار دو۔"

نوجوان نے ہچکچاتے ہوئے اپنی محبوبہ کو دیکھا اس کے بعد کہا۔

"نن۔ نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"ہی ہی ہی ہی۔ لڑکا شرماتا ہے ابھی تو اپنی لگائی کو پیار کر رہا تھا۔ ہولسٹر تو اتار ہی چکا تھا۔ اس کے بعد اپنا لباس بھی ضرور............ ہی ہی ہی............"

چنگیزی نے کہا۔ "ابے مسخرے چلا دے گولی' لباس خود بخود اتر جائے گا۔"

"نہیں رے بڈھے' گولی چلانے سے لباس خون میں بھیگ جائے گا میں ذرا صفائی پسند ہوں۔ ذرا صفائی سے اترواؤں گا۔"

چنگیزی کی عمر تقریباً پینتالیس یا پچاس برس کے قریب تھی۔ اس لئے دارا کبھی کبھی اسے بڈھا کہہ کر چھیڑتا تھا۔ چنگیزی نے غصے سے کہا۔

"ابے بڈھا ہوگا تیرا باپ۔ میں اب بھی دو شادیاں کر سکتا ہوں زیادہ غصہ دلائے گا تو اس چھوکری کو اٹھا کر لے جاؤں گا۔"

لڑکی ایک دم سے سہم کر اپنے محبوب سے چپک گئی۔ دارا نے پیلی پیلی بتیسی

دکھاتے ہوئے کہا۔

"سہمی ہوئی عورت کتنی حسین لگتی ہے۔ مرد شاید اس پر اسی لئے ظلم کرتا ہے کہ وہ دہشت زدہ ہو کر حسین سے حسین تر نظر آئے۔ مگر چنگیزی چاچا۔ نہیں چاچا کہوں گا تو تم پھر اپنے بڑھاپے پر اعتراض کرو گے۔ پھر اس چھوکری کو اٹھا کر لے جانا چاہو گے پر ابھی موقع نہیں ہے۔ ابھی تو پولیس والوں سے جان چھڑانی ہے۔ چلو چنگیزی بھائی پہلے تم اس کا لباس اتار کر پہن لو۔"

یہ کہہ کر دارا لڑکی کے پاس آیا اور ریوالور اس کی کنپٹی سے لگاتے ہوئے کہا۔

"تم اسی طرح بیٹھی رہو اور تم نوجوان ذرا پرے ہٹ کر اپنا لباس اتار دو۔ ہم بھی ذرا شرم والے ہیں۔ اس چھوکری کے سامنے اتنی رعایت ہے کہ انڈرویئر پہنے رہنا۔ یاد رکھو اگر تم نے کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو پھر نو لحاظ' نو مروت۔ تمہاری لگائی ٹھائیں سے مرجائے گی۔"

نوجوان نے ذرا پرے ہٹ کر کہا۔

"کار کی ڈگی میں ہماری اٹیچی ہے۔ اس میں کئی جوڑے رکھے ہوئے ہیں۔ مجھے کار تک جانے دو۔ میں ڈگی میں سے............"

"نو نو نو............ کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے کار کی چابی چنگیزی کو دے دو۔"

نوجوان نے بے بسی سے ریوالور کی طرف دیکھا پھر چابی نکال کر چنگیزی کی طرف اچھال دی۔ چنگیزی نے چابیوں کو کیچ کرنے کے بعد ان کی رنگ میں انگلی ڈالی۔ پھر انہیں چک پھیری کی طرح انگلیوں سے گھماتا ہوا کار کی طرف چلا گیا۔ دارا نے ان سے پوچھا۔

"تم دونوں کہاں سے آ رہے ہو اور کہاں جا رہے ہو؟ میرا خیال ہے اگر صرف پکنک منانے آتے تو اٹیچی میں اتنے سارے کپڑے لے کر نہ آتے۔"

"ہم فیصل آباد سے آ رہے ہیں اور یہ میری بیوی ہے۔ اب میں اسے اسلام آباد اپنے گھر لے جا رہا ہوں۔"

"یعنی تم اپنے بیوی کے میکے یعنی کہ اپنے سسرال سے آ رہے ہو۔ ہم بھی اپنے سسرال سے آ رہے ہیں۔ ہی ہی ہی ہی۔"

دوسری طرف چنگیزی نے ڈگی کھولنے کے بعد سوٹ کیس کھول کر دیکھا تو حیرت ومسرت سے چیختا ہوا بولا۔

"دارا............ اللہ غنی تو کاہے کی کمی۔ یہ دیکھو یہ دو نوٹوں کی گڈیاں ہیں۔ بغیر گنے بتا سکتا ہوں کہ یہ دس ہزار روپے ہیں۔"

نوجوان کا منہ لٹک گیا۔ وہ اپنی محبوبہ کی طرف بے بسی سے دیکھنے لگا۔ محبوبہ نے دارا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تمہیں جو کچھ لینا ہے لے لو مگر خدا کے لئے ہمارا پیچھا چھوڑ دو۔ ہمیں یہاں سے جانے دو۔"

"اوہو ہو ہو۔ تم تو بڑی دل والی اور دولت والی معلوم ہوتی ہو تمہارے پاس تو سونے کے زیورات بھی ہوں گے؟"

"ہاں ہیں۔ وہ بھی لے لو جتنی جلدی ہو سکے ہمارا پیچھا چھوڑ دو۔"

"کیسے پیچھا چھوڑ دیں۔ کیا ہمارے جاتے ہی تم دونوں ہمارے خلاف رپورٹ لکھانے تھانے نہیں پہنچو گے؟"

"نہیں۔" نوجوان نے کہا۔ "میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تم دونوں کا کسی سے ذکر نہیں کروں گا۔"

"چنگیزی۔ یہ سالا ہمیں اُلو کا پٹھا سمجھتا ہے ہم اس کے دس ہزار روپے اور اس کی گاڑی لے کر جائیں گے اور یہ رپورٹ نہیں کرے گا۔ یہ سالا مجھ سے بھی بڑا مسخرہ ہے۔"

لڑکی نے سہم کر پوچھا۔

"ک۔ کیا گاڑی بھی لے جاؤ گے؟"

"ہاں! گاڑی بھی لے جائیں گے اور تم دونوں کے ہاتھ پاؤں باندھ کر منہ پر کپڑا ٹھونس کر اس کے بعد اس درخت سے اُلٹا لٹکا کر یہاں سے جائیں گے۔"

لڑکی نوجوان کو ایسی نظروں سے دیکھنے لگی جیسے کہہ رہی ہو کچھ کرو نا۔ ایسے وقت فلم کے ہیرو اپنی محبوبہ کے لئے جان کی بازی لگا دیتے ہیں۔ ایک بڑھک لگاؤ دشمن کے ہاتھ سے ریوالور چھوٹ کر گر پڑے گا۔

لیکن نوجوان اپنی جگہ بے جان مجسمے کی طرح کھڑا رہا۔ فلم کے ہیرو کو بہت

سہولتیں ملتی ہیں۔ ڈائریکٹر اسے اتنا موقع دیتا ہے کہ وہ ریوالور پر ٹھوکر مار کر دشمن کو نہتا کر دے اور دشمن کو سمجھا دیتا ہے کہ ہیرو سے جتنے لات جوتے کھا سکتا ہے فلم بین کو خوش کرنے کے لئے کھاتا رہے۔ تاکہ اس کے بعد ہیروئن کے گانے کے لئے سچویشن پیدا ہو سکے۔ "آ سینے نال لگ جا ٹھاہ کر کے۔"

مگر اس وقت جو ریوالور نوجوان کے سامنے تھا وہ فلمی نہیں تھا۔ اس کی ایک ذرا سی حرکت پر ٹھائیں سے گولی اس کے سینے نال لگ جاتی۔ چنگیزی لباس تبدیل کرنے کے بعد دارا کے پاس آیا۔ پھر اس نے دارا سے ریوالور لے لیا تاکہ وہ کار کے پاس جا کر کپڑے تبدیل کر سکے۔ چنگیزی قد آور اور بھاری بھرکم سا تھا۔ نوجوان کے کپڑے اتنے تنگ ہو رہے تھے کہ انہیں پہن کر وہ مضحکہ خیز لگ رہا تھا۔ اس نے لڑکی کو دیکھ کر کہا۔

"مجھے اس طرح نہ دیکھو۔ ابھی تو میں آٹے کا تھیلا لگ رہا ہوں لیکن جب اچھا لباس پہن لیتا ہوں تو میرے ٹھوس بدن اور عمر کی پختگی پر لڑکیاں مرتی ہیں۔ تمہاری اطلاع کے لئے بتا دوں کہ میں بہت بڑا جاگیردار ہوں۔ فی الحال مجبوری کی حالت میں تمہارے روپے اور تمہاری کار لے کر جا رہا ہوں۔ تم مجھے اپنا پتہ بتا دو' اس پتہ پر یہ کار اور روپے واپس پہنچا دیئے جائیں گے۔"

لڑکی نے خوش ہو کر نوجوان کو دیکھا لیکن نوجوان نے پریشان ہو کر کہا۔

"ڈارلنگ مجبوری ہے۔ ہم انہیں پتہ نہیں بتا سکتے۔"

ڈارلنگ نے کہا۔ "میں اپنے گھر کا پتہ بتا دیتی ہوں۔ اس طرح ہمارے روپے اور اسی ہزار کی یہ کار تو واپس مل جائے گی۔"

"ہاتھ سے نکلی ہوئی دولت واپس نہیں آتی۔ خصوصاً وہ چیزیں جو چرائی گئی ہوں یا زبردستی چھین لی گئی ہوں ان کی واپسی کی توقع نادان کرتے ہیں۔ اگر یہ ہماری جان بخش دیں تو یہی ان کا بہت بڑا احسان ہو گا۔"

لڑکی نے ناگواری سے منہ بنا کر کہا۔

"تم تو صرف باتیں بنانا جانتے ہو۔ آج تک صرف ریوالور لٹکا کر گھومتے رہے اور اپنی مردانگی کی دھونس جماتے رہے۔ مردانگی تو ایسے ہی وقت دکھائی جاتی ہے کیا تم میری حفاظت کر رہے ہو؟"

نوجوان نے غصے سے کہا۔

"تم کیا چاہتی ہو؟ کیا میں اپنے ہی ریوالور کی گولی کا نشانہ بن جاؤں؟ کیا مجھے اپنی زندگی عزیز نہیں ہے؟"

لڑکی نے غصے سے کہا۔

"مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم اپنی جان بچانے کے لئے مجھے ایسے وقت دشمنوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دو گے۔ اگر یہ میرے ساتھ برا سلوک کریں گے تو اس وقت بھی تم اپنی سلامتی کے لئے دعائیں مانگتے رہو گے۔ یہ روپے یہ کار اور سونے کے زیورات سب میرے ہیں۔ اس وقت میں ہی ہر طرح سے نقصان برداشت کر رہی ہو۔ بس دیکھ لی تمہاری محبت تم سے اچھے تو یہ ہیں جو میری چیزیں واپس کرنے کا وعدہ کر رہے ہیں۔ اگر واپس نہ بھی کریں تو کم از کم نرمی سے تو پیش آ رہے ہیں۔"

چنگیزی نے کہا۔ "شاباش تم بہت سمجھدار ہو۔ تم ہمارے ساتھ تعاون کرو ہم تمہیں نقصان نہیں پہنچائیں گے۔"

لڑکی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ پتہ نہیں سچ مچ کے آنسو تھے یا ان کی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے مگرمچھ سے ادھار لئے گئے تھے۔ ایسے وقت عورت کے آنسوؤں کی صحیح پہچان نہیں ہوتی۔ وہ روتے ہوئے کہنے لگی۔

"اب میں تم لوگوں سے کچھ نہیں چھپاؤں گی۔ ساری باتیں سچ سچ بتاؤں گی۔ میں اس کی بیوی نہیں ہوں۔ میں اپنے گھر سے دس ہزار روپے اور زیورات لے کر اس کے ساتھ بھاگ آئی ہوں۔ یہ کار بھی میری ہے۔ اب پچھتا رہی ہوں کہ ایسے بزدل کے لئے اپنے ماں باپ کو کیوں چھوڑ دیا۔"

اس وقت تک دارا ایک رسّی لے کر ان کے ہاتھ پاؤں باندھنے آ گیا تھا۔ لڑکی کی بات سن کر اس کے چہرے پر پتھروں کی سی سختی آ گئی تھی چنگیزی کے چہرے کی کرختگی بتا رہی تھی کہ لڑکی کی کسی بات نے ان دونوں مفرور بدمعاشوں کو ان کے ماضی کا کوئی تکلیف دہ لمحہ یاد دلا دیا ہے۔ چنگیزی نے گرج کر اس نوجوان سے کہا۔

"ارے بدمعاش تُو تو ہم سے بھی بڑا لٹیرا ہے۔ تُو نے بوڑھے ماں باپ کی غیرت پر ڈاکہ ڈالا ہے۔ کسی کی جوان بیٹی کو بھگا کر لے جا رہا ہے۔ میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

دارا نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"نہیں چنگیزی تُو نے اپنی بیٹی کے لئے اور میں نے اپنی بہن کے لئے قتل کیا تھا۔ اب ہمیں دوسرے کی بیٹی کے لئے قاتل نہیں بننا چاہئے۔"

"مگر غیرت بھی تو کوئی چیز ہے۔ آخر یہ بھی تو کسی کی بیٹی اور بہن ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ اس غیرت کی خاطر ہم اس کی اچھی طرح سے مرمت کریں گے۔"

دارا نے یہ کہتے ہی نوجوان کے منہ پر ایک الٹا ہاتھ رسید کر دیا۔ وہ لڑکھڑا کر ایک قدم پیچھے چلا گیا۔ ایسا کرارا ہاتھ تھا کہ اس کی باچھوں سے خون رسنے لگا تھا۔ اس نے اپنے لہو کو پونچھتے ہوئے کہا۔

"یہ لڑکی مجھے مرد نہیں سمجھتی۔ اگر تم مرد ہو تو اپنے ساتھی سے کہو کہ ریوالور جیب میں رکھے پھر میں تمہیں چھٹی کا دودھ یاد دلاؤں گا۔"

"ہی ہی ہی۔ یار چنگیزی بھائی یہ تو مردوں والی باتیں کر رہا ہے۔ ٹھیک ہے یہ جب تک مجھے چھٹی کا دودھ یاد دلائے گا۔ اس وقت تک نو ریوالور شوٹنگ۔ اسے جیب میں رکھ لو۔"

چنگیزی نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"نہیں دارا یہ مردانگی دکھانے کا وقت نہیں ہے۔ پولیس ہمارے پیچھے ہے ہمیں جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہئے۔ چلو اسے اس درخت کے پاس لے جا کر باندھ دو۔"

یہ کہہ کر وہ ریوالور کی نال سے اسے ہانکتا ہوا درخت کے پاس لے گیا۔ دارا اسے درخت کے تنے سے لگا کر رسّی سے باندھنے لگا۔ لڑکی چپ چاپ یہ تماشا دیکھ رہی تھی۔ اسے اچھی طرح باندھنے کے بعد انہوں نے اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا۔ پھر اس کے منہ کو بھی ایک بڑے رومال سے باندھ دیا۔ اس کے بعد دارا نے لڑکی کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

"اسے یونہی نہیں چھوڑا جا سکتا۔ کیوں نہ اسے ہم اپنے ساتھ لے چلیں۔"

"نن۔ نہیں۔" لڑکی نے سہم کر کہا۔ "خدا کے لئے مجھے یہیں چھوڑ دو۔ مجھ پر رحم کرو۔"

"اپنے ماں باپ کا دل دکھاتے وقت اور ان کی گود چھوڑتے وقت تمہیں ان پر رحم نہیں آیا تھا؟"

یہ کہہ کر دارا نے اس کے گداز بازو کو اپنے آہنی پنجے میں جکڑ لیا دوسرے بازو پر چنگیزی نے چھاپہ مارتے ہوئے کہا۔

"کیا تم نے یہ نہیں سوچا تھا کہ ماں باپ کی پناہ سے باہر تمہیں درندے بھی مل سکتے ہیں۔ ان بوڑھوں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔ یہی کہ انہوں نے بچپن سے اب تک تمہیں سینے سے لگائے رکھا تھا۔ تم انہیں ماں کی ممتا اور باپ کی شفقت کا انعام دے کر آئی ہو۔ اب کوئی بھی تمہیں انعام کے طور پر حاصل کر سکتا ہے۔ اب چلو ہمارے ساتھ۔"

وہ اسے کھینچتے ہوئے کار کی طرف لے جانے لگے۔ وہ دام میں آئے ہوئے پنچھی کی طرح پھڑپھڑا رہی تھی۔ یہ سوچ کر تھر تھر کانپ رہی تھی کہ یہ دونوں درندے اس کے ساتھ نہ جانے کیا سلوک کریں۔ کار کے پاس پہنچ کر دارا نے کہا۔

"میں اس کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھتا ہوں۔ تم ڈرائیو کرو۔"

چنگیزی نے کہا۔ "واہ بیٹے آگئے اپنے مطلب پر۔ کیا میں اس کے ساتھ پچھلی سیٹ پر نہیں بیٹھ سکتا؟ چلو تم ڈرائیو کرو۔"

"اے خبردار۔" دارا نے کہا۔ "مجھ پر حکم نہ چلانا ورنہ درست نہ ہوگا۔"

"میں بھی کسی کا تحکمانہ انداز پسند نہیں کرتا۔ تم بھی مجھے ڈرائیو کرنے کے لئے نہ کہو۔"

دارا نے اپنا سر کھجاتے ہوئے کہا۔

"اگر ہم آپس میں لڑیں گے تو بات بگڑ جائے گی۔ چلو ہم تینوں اگلی سیٹ پر بیٹھیں۔"

وہ تینوں کار کی اگلی سیٹ پر آگئے۔ چنگیزی اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس کے بعد لڑکی کو بٹھایا۔ دارا نے کہا۔

"کار کی ڈگی میں ولایتی شراب کی تین بوتلیں ہیں کیا خیال ہے ذرا سی چکھنے کے بعد سفر کا آغاز کیا جائے؟"

"ابھی نہیں کہیں دور نکل جانے کے بعد اطمینان سے پئیں گے۔ آؤ بیٹھ جاؤ دیر

نہ کرو۔"

وہ آکر بیٹھا تو لڑکی دونوں کے درمیان پھنس کر رہ گئی۔ چنگیزی نے کار اسٹارٹ کی پھر اسے جنگل کے کچے راستے پر ڈرائیو کرتے ہوئے لڑکی سے کہا۔

"کیا پکی سڑک تک پہنچنے کا یہی راستہ ہے؟"

"ہاں! مگر تم لوگ مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟"

"ہم ابھی نہیں بتا سکتے کہ کہاں جا رہے ہیں۔ بس اتنا سمجھ لو کہ قانون کی پہنچ سے دور ہو جانا چاہتے ہیں۔ ہم جہاں مناسب سمجھیں گے تمہیں چھوڑ دیں گے۔ تم اپنی کار لے کر واپس چلی جانا۔"

لڑکی چپ چاپ ونڈ اسکرین کے پار دیکھنے لگی۔ نگاہوں کے سامنے دور تک جنگل پھیلا ہوا تھا۔ وہ خیالوں کے جنگل میں بھٹکنے لگی۔ اب سے پہلے وہ ایک مست مورنی کی طرح اپنی آرزوؤں کے سب رنگ پنکھ پھیلائے ایک محبوب کے لئے دیوانہ وار ناچتی تھی۔ آج اس مورنی کو ناچتے ناچتے اپنے بھدے پاؤں نظر آگئے تھے۔ وہ پاؤں جو محبت کرنے والے والدین سے دور بھگا کر لے جاتے ہیں۔ جوانی کی تپتی دھوپ میں سراب دکھاتے ہیں۔ اس محبوب کی چھاؤں میں لے جاتے ہیں جو دور سے سایہ دار درخت نظر آتا ہے۔ قریب پہنچ کر فریب نظر کا پتہ چلتا ہے۔

پکی سڑک پر پہنچ کر دارا نے اپنا ایک ہاتھ سیٹ کی پشت پر لا کر لڑکی کے شانے پر رکھ دیا۔ وہ اپنے آپ سے سمٹنے لگی لیکن جگہ اتنی تنگ تھی کہ ان کے درمیان سمٹنے کی گنجائش نہیں تھی۔ دارا نے اس کے بھرے بھرے شانے کو سہلاتے ہوئے کہا۔

"نو سمٹنا نو شرمانا۔ بائے گاڈ تم بہت اچھی ہو۔"

چنگیزی نے کہا۔ "اچھی یا بری کو پرکھنے کا موقع نہیں ہے۔ شریف آدمی بن کر رہو تو بہتر ہے۔ یہ نہ بھولو کہ تمہارے باپ ہمارا پیچھا کر رہے ہیں۔"

"ہی ہی ہی ہی۔ اس رشتے سے تو وہ تمہارے بھی باپ ہوئے میں نے ذرا اس کے شانے پر ہاتھ رکھا ہے تو تم جل رہے ہو۔"

"ہاں یہی بات ہے۔ اپنا ہاتھ ہٹا دو۔"

"تم پھر حکم دے رہے ہو۔"

"یہ حکم نہیں ہے۔ میں انصاف کی بات کر رہا ہوں۔ لوٹ کے مال میں برابر کا

حصہ ہونا چاہئے اگر تم نے میری بات نہیں مانی تو اسٹیئرنگ چھوڑ کر میں بھی ہاتھ رکھ لوں گا۔"

لڑکی نے پریشان ہو کر کہا۔

"یہ تم لوگ کیسی باتیں کر رہے ہو؟ ابھی کچھ دیر پہلے تم لوگ کہہ رہے تھے کہ تم میں سے ایک نے اپنی بیٹی کی خاطر اور ایک نے اپنی بہن کی خاطر قتل کیا ہے۔ میں بھی تمہاری بیٹی اور بہن کے برابر ہوں۔"

دارا نے فوراً ہی اس کے شانے سے ہاتھ ہٹا کر کہا۔

"اے خبردار ایک جھانپڑ لگاؤں گا تو منہ ٹیڑھا ہو جائے گا۔ اگر ہم نے سبھی کو بہن اور بیٹی بنا لیا تو کیا ہمارے لئے کوئی آسمان سے اتر کر آئے گی۔"

وہ سہم کر چپ ہو گئی۔ یہ بات سمجھ میں آ گئی کہ غیرت صرف اپنے خون کے لئے ہوتی ہے۔ وہ اپنی شرافت اور عزت کا واسطہ بھی نہیں دے سکتی تھی کیونکہ عزت نام کی چیز تو وہ گھر کی دہلیز پر چھوڑ کر آ گئی تھی۔ اب اس کے قریب کوئی بھی نکاح کا لائسنس حاصل کئے بغیر آ سکتا ہے۔ دارا نے چنگیزی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم ایک ہاتھ میں ریوالور پکڑ کر ڈرائیو کر رہے ہو۔ اگر کسی راہگیر نے گزرتے وقت دیکھ لیا تو اس کی سمجھ میں یہی آئے گا کہ ہم اسے ریوالور کے زور پر اغوا کر کے لے جا رہے ہیں۔"

"تم میرے ہاتھ سے ریوالور لینے کے لئے اتنی لمبی چوڑی تقریر نہ کرو۔ یہ میرے پاس ہی رہے گا۔"

چنگیزی نے ریوالور کو اپنی ران کے نیچے دبا لیا۔ دارا نے گھور کر کہا۔

"تم احسان فراموش ہو۔ یہ بھول گئے کہ تم میری مدد سے ہی جیل سے فرار ہو کر آئے ہو۔ اگر ہم ایک دوسرے پر بھروسہ نہیں کریں گے تو پھر کس طرح سرحد پار کریں گے؟"

"یہی تو میں تم سے کہنا چاہتا تھا کہ ریوالور میرے پاس رہنے دو اور مجھ پر اعتماد کرو۔"

دارا تھوڑی دیر تک بے بسی سے اسے دیکھتا رہا پھر اس نے جھنجلا کر کہا۔

"جب ہمیں بھاگتے ہی رہنا ہے تو پھر اس چھوکری کو ساتھ کیوں لے جا رہے

ہیں۔ اسے کار سے باہر پھینک دو۔ خواہ مخواہ طبیعت خراب ہو جاتی ہے۔"

چنگیزی نے کہا۔ "طبیعت کو ٹھیک رہنے کے لئے ضروری ہے کہ تم اسے اپنی بہن سمجھو۔"

"نہیں پہلے تم اسے اپنی بیٹی کہو۔"

"ارے واہ تم تو الٹی نصیحت کر رہے ہو۔ جب کوئی خلوص دل سے نصیحت کرے تو پلٹ کر اس پر تنقید نہیں کرنا چاہئے۔ ورنہ صراطِ مستقیم پر نہیں چل سکو گے۔"

"ابے جا۔ صراط جیل سے نکل کر صراط مستقیم کی باتیں کر رہا ہے۔ اگر تیری نیت میں کھوٹ نہیں ہے تو پہلے تُو اسے اپنی بیٹی بنا لے۔"

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ تھوڑی دیر تک چنگیزی ونڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے اپنے ہونٹوں کو سختی سے بھینچتا رہا۔ بڑی مشکل ہے' ایک نوجوان لڑکی کے لئے ہونٹوں کی بے حیا دہلیز سے بیٹی کا لفظ نہیں نکلتا۔ شیطان بہکاتا ہے کہ یہ ہاتھ سے نکل جائے گی تو پھر دوسری نہیں ملے گی۔ جو مالِ غنیمت ہے اسے غنیمت جانو۔

چنگیزی نے اپنی زندگی میں کبھی کسی غیر لڑکی کو لڑکی کے علاوہ کچھ نہیں سمجھا تھا۔ ہمارے تمہارے لوگوں کی طرح اپنی اولاد کو صرف نصیحت کرتا رہا۔ اسی لئے اب اس لڑکی کو بہن اور بیٹی کہتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔ دارا نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

"ارے ساری زندگی نصیحت کرنے والے بڈھے اسی لئے تُو مجھے دوسرے نصیحت کرنے والوں کی طرح سمجھا رہا تھا کہ میں پلٹ کر تنقید نہ کروں۔ اب تیری حقیقت معلوم ہو گئی ہے۔ تُو اسے بیٹی نہیں کہے گا۔"

چنگیزی نے جھنجلا کر کہا۔

"بکواس مت کرو۔ اصل رشتہ دل سے ہوتا ہے۔ میں نے دل ہی دل میں کہہ دیا ہے۔"

"ابے تُو نے کیا کہہ دیا ہے؟"

"وہی جو تُو نے کہنے کے لئے کہا تھا۔"

"ارے تو منہ سے کیوں نہیں کہتا؟"

اس نے غصے سے دارا کو دیکھا۔ پھر ٹھہر ٹھہر کر بولا۔

"میں اس لڑکی کو............" اس نے دل میں کہا۔ "دوسرے کی۔" پھر زبان سے کہا۔ "بیٹی سمجھتا ہوں۔"

دارا نے مطمئن ہو کر کہا۔

"اب میں بھی اسے اپنی بہن کہتا ہوں۔"

لڑکی نے اطمینان کی سانس لی۔ اب وہ اس کے لئے اتنے خطرناک نہیں تھے۔ وہ بیس میل کا فاصلہ طے کر چکے تھے۔ کچھ آگے جا کر چنگیزی نے کہا۔

"ہم نے بڑی بھول کی۔ پانی کا تھرماس لے لینا چاہئے تھا۔ مگر ہم کھانے پینے کی چیزیں وہیں چھوڑ آئے ہیں۔ مجھ پیاس لگ رہی ہے۔"

دارا نے کہا۔ "مجھے بھی پیاس لگ رہی ہے۔"

لڑکی نے بھی تھوک نگلتے ہوئے پیاس کا اظہار کیا۔ دارا نے کہا۔

"یہاں پانی نہیں ملے گا۔ تم گاڑی روکو۔ میں وہسکی کی ایک بوتل نکال کر لاتا ہوں۔"

"بے غیرتی کی باتیں نہ کرو۔ کیا اپنی بہن کے پاس بیٹھ کر شراب پیو گے؟"

"نہیں۔ تمہاری بیٹی کے پاس بیٹھ کر پیوں گا۔"

چنگیزی نے ایک جھٹکے سے بریک لگا کر گاڑی کو روکا پھر ریوالور نکال کر دھاڑتے ہوئے بولا۔

"ذلیل کمینے تُو بیٹی کا رشتہ لگا کر مجھے گالی دے رہا ہے۔ میں تجھے شوٹ کر دوں گا۔"

اس کے للکارنے کے دوران ہی دارا نے بڑی پھرتی سے دروازہ کھول کر باہر چھلانگ لگادی۔ پھر وہ گاڑی کی آڑ میں بیٹھ کر بولا۔

"دیکھو چنگیزی غصہ حرام ہوتا ہے۔ میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔"

چنگیزی نے دروازہ کھول کر باہر نکلتے ہوئے کہا۔

"نہیں میں تجھے معاف نہیں کروں گا۔ تُو نے مجھے بہت بڑی گالی دی ہے۔"

لڑکی نے باہر آکر چنگیزی کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

"آپس میں جھگڑا نہ کرو اسے معاف کردو یا پھر مجھے جانے دو۔ اگر تم میرے سامنے اسے قتل کرو گے تو میں یہ منظر نہیں دیکھ سکوں گی۔ دہشت سے مرجاؤں گی۔"

چنگیزی چند لمحوں تک اس کے گورے گورے ہاتھوں کو اپنے ہاتھ پر محسوس کرتا رہا۔ پھر اس نے کہا۔

"میں اسے اس شرط پر معاف کروں گا کہ یہ ہمارے لئے کہیں سے پانی لے آئے۔"

دارا نے دور تک دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہاں کوئی مکان نظر نہیں آرہا ہے۔ میں پانی کہاں سے لاؤں گا۔"

چنگیزی نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"وہاں درختوں کے جھنڈ میں ضرور کوئی بستی ہوگی۔ تم وہاں سے لاسکتے ہو۔ ہم یہاں تمہارا انتظار کریں گے۔"

دارا نے دانت پیستے ہوئے ریوالور کی جانب دیکھا۔ اس ریوالور نے اسے بالکل ہی بے بس کردیا تھا۔ اس نے مجبور ہو کر ذرا عاجزی سے کہا۔

"نہیں۔ چنگیزی میں پانی لینے جاؤں گا تو تم بھاگ جاؤ گے۔"

"اُلّو کے پٹھے' میں چاہوں تو ایک گولی سے تمہیں ٹھنڈا کر کے جاسکتا ہوں۔ تم اطمینان رکھو' اس لڑکی کو پیاس لگی ہے میں اسے پانی پلا کر ہی آگے بڑھوں گا۔"

دارا مطمئن ہو کر سڑک کے نیچے اتر گیا۔ پھر کھیتوں کی پگڈنڈیوں پر چلتے ہوئے درختوں کے ایک جھنڈ کی طرف جانے لگا۔ جاتے جاتے وہ بار بار پلٹ کر پیچھے دیکھ رہا تھا۔ جب وہ بہت دور نکل گیا تو چنگیزی نے کہا۔

"تم یہاں کیوں کھڑی ہو چلو اپنی سیٹ پر بیٹھو۔"

وہ اپنی سیٹ پر آکر بیٹھی تو وہ اسٹیرنگ سیٹ پر آکر بیٹھ گیا۔ پھر اس کے کچھ کہنے سے پہلے کار اسٹارٹ ہو کر آگے بڑھ گئی۔ دارا پلٹ کر تیزی سے بھاگتا ہوا اور اسے گالیاں دیتا ہوا کھیتوں سے سوکھی مٹی کے ڈھیلے اٹھا کر اس کی طرف پھینکتا ہوا چلا آرہا تھا۔ وہ آرہا تھا اور کار پچاس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے جا رہی تھی۔ پھر ساٹھ میل پھر ستر میل اتنی تیز رفتاری کے بعد وہ دو منٹ میں ہی نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ لڑکی نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"تم نے اس بے چارے کو کیوں چھوڑ دیا؟"

"وہ بیچارہ تمہارا عاشق تو نہیں تھا۔ اس نے تمہیں بہن کہا ہے اور تمہاری جیسی

بہنیں اپنے بھائیوں کو چھوڑ کر اسی طرح اپنے عاشق کے ساتھ بھاگتی ہیں۔"

"یہ۔یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ تھوڑی دیر پہلے تم نے مجھے بیٹی کہا ہے۔"

"بکواس مت کرو۔" اس نے ایک ہاتھ سے اس کے بازو کو پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا۔ "دیکھو لڑکی تم نے میری زبان سے سنا ٹھیک تھا لیکن میں نے ٹھیک طرح سے نہیں کہا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں کہہ دیا کہ تم دوسروں کی بیٹی ہو اور یہ حقیقت بھی ہے۔ ایک کی بیٹی دوسرے کی بیٹی نہیں ہو سکتی۔ دوسرے سے دوسرا ہی رشتہ ہوتا ہے۔"

لڑکی نے پریشان ہو کر کہا۔

"لیکن میں نے اور دارا بھائی نے صاف طور سے سنا ہے کہ تم نے مجھے........."

چنگیزی نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

"آگے نہ کہو۔ پہلے میری بات سمجھو۔ میں تمہیں مثال دے کر سمجھاتا ہوں۔ اگر محلے میں کسی کی مرغی آوارہ پھرتی ہے اور اس پر نیت آجائے تو اسے پکڑ کر محلے کا ایک چکر لگاتے ہوئے پوچھا جاتا ہے۔

"یہ مرغی........." پھر آہستہ سے کہا جاتا ہے۔ "کس کی ہے؟"

پھر اسی طرح زور سے آواز دی جاتی ہے۔ "......... یہ مرغی۔" پھر اسی طرح آہستہ سے پوچھا جاتا ہے۔ "کس کی ہے؟"

جب پورے محلے میں تین بار پوچھنے کے بعد اس کا کوئی دعویدار نہ ہو تو وہ مرغی حلال ہو جاتی ہے۔ اسی طرح تم بھی میرے لئے حلال ہو گئی ہو۔"

لڑکی نے حیرانی سے پوچھا۔ "یہ کس کتاب میں لکھا ہے کہ اس طرح چیزیں حلال ہو جاتی ہیں؟"

"میں زیادہ پڑھا لکھا نہیں ہوں۔ کسی نہ کسی کتاب میں لکھا ہی ہوگا ورنہ لوگ حرام کو حلال نہ بناتے۔ تم اس طرح مچلنا چھوڑ دو' گاڑی کی رفتار بہت تیز ہے۔ اسٹیئرنگ پر سے ہاتھ بہک جائے گا۔"

"اچھا ہے بہک جائے۔ یہ گاڑی کسی کھڈ میں گر جائے۔ کسی درخت سے ٹکرا جائے۔ ایسی زندگی سے موت اچھی ہے۔ میں نے اپنے باپ کا دل دکھایا ہے۔ اللہ

تعالٰی کی طرف سے مجھے اس کی سزا مل رہی ہے۔"

وہ یک بیک پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اگر چنگیزی کسی کہانی کا کردار ہوتا تو مصنف اسے پچھتانے والی لڑکی کے آنسوؤں سے پگھلا دیا۔ اللہ کا خوف دلا کر فوراً ہی راہ راست پر لے آتا۔ مگر ہماری اس دنیا میں ایسے سنگدل کردار بھی ہیں جو عورت کے آنسوؤں کو ہوس کے رومال سے پونچھتے ہیں' پہلے گناہ کرتے ہیں پھر سجدے میں پہنچ کر گڑگڑاتے ہیں کہ آئندہ ایسا نہیں کریں گے۔

لیکن لڑکی کی قسمت کچھ اچھی تھی۔ ذرا دیر بعد بہت دور سے پولیس کار کا سائرن سنائی دیا۔ چنگیزی نے فوراً ہی گاڑی روک کے پیچھے کی جانب دیکھا۔ پیچھے سڑک بائیں جانب مڑ گئی تھی۔ اس لئے پولیس نظر نہیں آرہی تھی۔ اس نے فوراً ہی لڑکی کو کھینچ کر گاڑی سے باہر نکالا۔ اس کے چاروں دروازے لاک کئے پھر اسے کھینچتا ہوا سڑک سے اتر کر دور تک کھلی جھاڑیوں کی طرف بھاگنے لگا۔ سائرن کی آواز لحہ بہ لحہ قریب آتی جارہی تھی۔ جب وہ گھنی جھاڑیوں کے پیچھے پہنچ گئے تو وہ پولیس کار راستے کے موڑ پر نظر آئی چنگیزی نے ریوالور کی نال کو اس کی پسلی سے لگاتے ہوئے کہا۔

"اگر ذرا بھی آواز کرو گی یا کوئی اشارہ دو گی یا ان جھاڑیوں کو ہلاؤ گی تو میں اسی وقت گولی مار دوں گا۔"

وہ سہم کر بیٹھی رہ گئی۔ ابھی جان چھڑانے کا موقع ملا تھا۔ پولیس والوں سے توقع تھی کہ اب وہ اسے گرفتار کرلیں گے۔ مگر وہ چالاک بھیڑیا اسے گھسیٹ کر جھاڑیوں کے پیچھے لے آیا تھا۔ وہ دم سادھے بیٹھی رہی۔ تھوڑی دیر بعد پولیس کی پٹرولنگ کار ان کی گاڑی کے قریب آکر رک گئی۔ ایک پولیس انسپکٹر اپنی گاڑی سے باہر آکر ان کی گاڑی کو دیکھنے لگا۔ اس کے ساتھ چند سپاہی بھی تھے۔ وہ دور دور تک نظریں دوڑا رہے تھے اور آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ پھر شاید انہوں نے یہ سوچا کہ کوئی رومانی جوڑا جنگل میں منگل منانے آیا ہو۔ فی الحال وہ کسی رومانی جوڑے کا محاسبہ نہیں کرسکتے تھے۔ کیونکہ مفرور قیدیوں کی تلاش کرتے ہوئے سرحدی علاقے کی طرف جارہے تھے۔ تاکہ انہیں سرحد پار کرنے سے پہلے ہی گرفتار کرلیں۔ اس لئے وہ لاکڈ کار کو چھوڑ کر اپنی پٹرولنگ کار میں آگے بڑھ گئے۔

چنگیزی اس پولیس کار کو دور جاتے دیکھ رہا تھا اور تیزی سے سوچ رہا تھا کہ اب

پولیس کا کیا کرنا چاہئے۔ کیونکہ آگے جانے میں خطرہ تھا۔ اس سے پہلے ہی پولیس والے سرحد پر پہنچ رہے تھے۔ پیچھے لوٹنے میں بھی گرفتاری لازمی تھی اور اب وہ لڑکی اس کے لئے بوجھ بن گئی تھی۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد وہ لڑکی کو لے کر جھاڑیوں سے نکلا پھر وہ دوڑتا ہوا کار کے پاس آیا۔ اس نے کار کی ڈگی کھولی پھر اٹیچی کھول کر اس میں سے تمام کپڑے ڈگی میں پھینک دیئے۔ پھر باسکٹ میں سے وہسکی کی تین بوتلیں نکال کر لاک کیا۔ پھر لڑکی کو چابیاں دیتے ہوئے کہا۔ تم آزاد ہو فوراً واپس چلی جاؤ۔ میں آگے سرحد تک پیدل چلا جاؤں گا۔ خبردار کسی سے نہ کہنا کہ میں سرحد کی طرف گیا ہوں۔"

لڑکی فوراً ہی دروازہ کھول کر اسٹیرنگ سیٹ پر بیٹھ گئی پھر اس نے انجن اسٹارٹ کر کے گاڑی کو واپس موڑ دیا۔ وہ اسٹیرنگ کو سنبھالتے وقت بھی سہمی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی کہ کہیں اس درندے کا ارادہ نہ بدل جائے لیکن وہ خاموشی سے ریوالور تانے کھڑا تھا۔ لڑکی نے گیئر بدلے پھر اسے تیز رفتاری سے بھگاتی ہوئی دور چلی گئی۔ چنگیزی بیچ سڑک پر کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ جب وہ کار دور سڑک کے موڑ سے گزر کر نظروں سے اوجھل ہو گئی تو وہ سڑک سے اتر کر انہی جھاڑیوں کی طرف بھاگتا چلا گیا۔

اس نے لڑکی کے سامنے دانستہ یہ بات کہی تھی کہ وہ سرحد کی طرف پیدل جا رہا ہے تاکہ لڑکی پولیس والوں تک یہی رپورٹ پہنچائے۔ جھاڑیوں سے بھی آگے تھوڑی دور تک بھاگتے رہنے کے بعد وہ رک گیا۔ اب وہ سڑک نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس نے اندازہ لگایا کہ اس سڑک سے تقریباً چار فرلانگ دور آ چکا ہے اس کے بعد وہ پلٹ کر سرحد کی مخالف سمت جانے لگا۔ یعنی سرحدی لائن مغرب کی طرف تھی اور وہ مشرق کی طرف جا رہا تھا۔ اب اس کے اندازے کے مطابق وہ پکی سڑک گھوم کر جنوب کی طرف چلی گئی تھی اور وہ مشرق کی طرف بڑھتے بڑھتے شمال کی طرف گھوم رہا تھا۔

بہت دور جانے کے بعد وہ ایک درخت کے سائے میں تھک کر بیٹھ گیا۔ دوپہر کے وقت دھوپ تیز ہو گئی تھی اور حلق خشک ہو رہا تھا دور دور تک بستی کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ اس نے اٹیچی کھول کر وہسکی کی ایک بوتل نکال لی پھر اسے کھول کر اپنے منہ سے لگا لیا اور ٹھہر ٹھہر کر ایک ایک گھونٹ حلق سے اتارنے لگا۔ ذرا دیر بعد

پیاس تو بجھ گئی مگر نشہ سر چڑھ کر بولنے لگا۔ وہ ابھی بہکنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے بوتل کو بند کر کے دوبارہ اٹیچی میں رکھ دیا۔ پھر وہاں سے اٹھ کر شمالی علاقے کی جانب بڑھنے لگا۔ تقریباً دو میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ایک دھوبی گھاٹ نظر آیا۔ اس سے پرے ایک چھوٹی سی بستی نظر رہی تھی۔ اس وقت گھاٹ پر صرف ایک ہی دھوبی ایک بڑے سے کپڑے کو دھوبی پاٹ مار رہا تھا۔ اس نے چنگیزی کو مضحکہ خیز تنگ لباس میں دیکھ کر پوچھا۔

"بابو جی۔ کہاں سے آ رہے ہو؟"

"میں مسافر ہوں اور راستے سے بھٹک گیا ہوں۔ بہرحال راستہ تو مل جائے گا۔ تم مجھے ایک شلوار قمیض دے دو۔ میں تمہیں دو سو روپے دوں گا۔"

دھوبی کی باچھیں خوشی سے کھل گئیں۔

"بابو جی' میں ابھی شلوار لا کر دیتا ہوں بس ذرا بستی تک جانا ہو گا میری دھوبن کپڑوں پر استری کر رہی ہے۔"

"کھانے کے لئے کچھ ملے گا؟"

"ضرور بابو جی۔ آپ بستی تک چلیں۔"

"نہیں میں بستی تک نہیں جاؤں گا۔ تم کپڑوں کے ساتھ روٹیاں لے آؤ گے تو میں تمہیں سو روپے دوں گا۔"

دھوبی نے مسرت سے جھک کر فرشی سلام کرتے ہوئے کہا۔

"اللہ آپ کو سلامت رکھے۔ میں یہ گیا اور یہ آیا۔"

وہ پلٹ کر تیزی سے جانے لگا۔ چنگیزی نے اسے آواز دی۔

"سنو۔ بستی میں کسی سے میرا ذکر نہ کرنا۔"

"نہیں کروں گا بابو جی۔ اس میں تو میری ہی بھلائی ہے کیونکہ میں اپنے کسی گاہک کا کپڑا چرا کر ہی آپ کو دوں گا۔ میں بھی نہیں چاہتا کہ کسی کو پتہ چلے۔"

"اگر کوئی بستی والا یہاں پہنچ گیا تو؟"

دھوبی نے سر کھجاتے ہوئے کچھ سوچا پھر کہا۔

"بابو جی آپ دریا کے اس پار چلے جائیں۔ پانی گھٹنوں تک ہے۔ دریا کے پار ان درختوں کے پیچھے آپ میرا انتظار کریں۔ بس میں یہ گیا اور یہ آیا۔"

وہ بستی کی طرف بھاگتا چلا گیا۔ چنگیزی اٹیچی اٹھا کر دریا میں اتر گیا۔ کنارے پر برائے نام پانی تھا۔ وہ بیچ میں پہنچا تو پانی گھٹنوں سے کچھ اونچا ہو گیا۔ ٹھنڈا ٹھنڈا پانی تھا۔ دو دن سے اس نے غسل نہیں کیا تھا۔ دوسرے کنارے پر پہنچ کر اس نے اٹیچی رکھی کپڑے اتارے پھر کنارے کی گیلی مٹی سے بدن کو رگڑ رگڑ کر نہانے لگا۔ جب دوسرے کنارے پر دھوبی آتا ہوا نظر آیا تو وہ انڈر ویئر پہن کر اٹیچی اور کپڑے اٹھا کر ذرا دور درختوں کے پیچھے چلا گیا۔

پندرہ منٹ بعد دھوبی اس کے پاس پہنچ گیا۔ وہ ایک چھابے میں سوکھی روٹیاں' پودینے کی چٹنی اور پیاز اور ٹماٹر کا سلاد لے کر آیا تھا۔ وہ سو روپے کا کھانا تھا۔ ایک بھوکے کے لئے سب سے بڑی نعمت تھی۔ چنگیزی نے پیٹ بھر کر کھایا۔ پھر پانی پینے کے بعد اس نے پہننے کے لئے شلوار اور قمیض اٹھائی تو اس لباس کو کچھ دیر تک دیکھتا رہ گیا۔ اسے پندرہ برس پہلے کی بات یاد آ گئی۔ بالکل ایسی ہی گلے اور شانے پر کڑھائی کی ہوئی قمیض اس کے پاس تھی۔ قمیض کا بادامی رنگ بھی وہی تھا۔ اسی رنگ کی شلوار تھی اسے پہنتے وقت یوں لگا جیسے وہ پندرہ برس پیچھے چلا گیا ہو۔

اس نے دھوبی کو تین سو روپے دیئے اور اپنی اٹیچی اٹھائی اور پھر شمال کی جانب چل پڑا۔ انجانی منزل کی طرف چلتے وقت بھی اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ قمیض اور شلوار کے اندر پہنچ کر اپنے گھر کے اندر پہنچ گیا ہو۔ ایک بار پھر سے چک نمبر دو سو تیرہ کا زمیندار بن گیا ہو۔ اپنی حویلی میں بیٹھ کر اپنے چھوٹے سے خاندان پر حکومت کر رہا ہو۔

دور دور کے دیہات تک اس کا رعب اور دبدبہ تھا۔ غریب مگر نوجوان عورتوں پر اس کی مردانگی کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے باوجود وہ ایک مرد بچے کا باپ نہ بن سکا۔ وہ دو بیٹیوں کا باپ تھا۔ نذیراں جوان ہو چکی تھی اور دوسری بیٹی شاداں تقریباً آٹھ برس کی تھی۔ اپنی عیاشیوں کے نشے میں وہ بھول گیا تھا کہ اس کا اثر اس کی جوان بیٹی پر بھی پڑ سکتا ہے۔ شکاری جب شکار کھیلنے کے لئے نکلتا ہے تو اپنے گھر کے دروازے بند کر کے اس خوش فہمی میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ کوئی دوسرا شکاری اس بند دروازے کو توڑنے نہیں آئے گا۔

لیکن کسی نے نذیراں کو توڑ کر رکھ دیا۔ چنگیزی کو پتہ چلا تو وہ غیرت کے جوش

میں رائفل اٹھا کر بیٹی کو مارنے کے لئے تیار ہو گیا۔ اس کی بیوی سامنے ڈھال بن کر آ گئی۔

"ہماری بچی نادان ہے' اسے کیوں مارتے ہو۔ جس نے تمہاری غیرت کو للکارا ہے اس کا گریبان جا کر پکڑو۔"

چنگیزی نے جوان بیٹی کی جان بخشی کر دی لیکن اسے مار پیٹ کر اس نوجوان کا پتہ پوچھ لیا جو حویلی پر شب خون مارنے آیا تھا۔ وہ شیر کی طرح دھاڑتا ہوا اس نوجوان تک پہنچ گیا۔ نوجوان بزدل اور کمزور نہیں تھا لیکن اسے اپنے بچاؤ کا موقع نہ مل سکا۔ چنگیزی نے وہاں پہنچتے ہی اس کا نام پوچھا پھر اسے گولی کا نشانہ بنا دیا۔ نوجوان نے دم توڑتے ہوئے کہا۔

"میں گناہ گار نہیں ہوں۔ مگر تمہاری اس دنیا میں محبت کو گناہ سمجھا جاتا ہے اور تمہاری عیاشیوں کو رئیسوں کا مشغلہ سمجھ کر معاف کر دیا جاتا ہے۔ بے غیرت میں نہیں تم ہو جو دوسروں کی عزت سے کھیلتے ہو۔ مگر جب اپنی غیرت کی بات آئے تو غیرت مند بن کر لہو اچھالنے کے لئے چلے آتے ہو۔"

یہ کہہ کر اس نے دم توڑ دیا۔ نوجوان کے قتل ہونے کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ جب وہ اپنی حویلی میں واپس آیا تو قانون کے محافظ اسے حراست میں لینے کے لئے پہنچ گئے تھے جیل جانے سے پہلے اس نے حویلی میں آ کر اپنی بیوی سے کہا۔

"میں جا رہا ہوں۔ پتہ نہیں عمر قید ہو گی یا پھانسی کی سزا پاؤں گا۔ میں واپس آؤں یا نہ آؤں مگر یہ یاد رکھنا کہ تمہارا شوہر غیرت مند تھا۔ لہٰذا اب کوئی بے حیائی کی بات میرے کانوں تک نہ پہنچے۔ ایک ہفتے کے اندر اندر نذیراں کی شادی کر دو۔"

یہ کہہ کر اس نے نفرت سے نذیراں کو دیکھا۔ پھر محبت سے شاداں پر نظر ڈالی۔ وہ آٹھ برس کی بچی اس کے پاؤں سے لپٹ کر رو رہی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ جوانی کیا ہوتی ہے اور جھوٹی غیرت کے لئے ایک باپ جیل کیسے جاتا ہے وہ صرف اتنا سمجھ پائی تھی کہ باپ اس سے دور ہو رہا ہے۔ اس لئے وہ پاؤں سے لپٹ کر رو رہی تھی۔ چنگیزی نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"شاداں کی ماں۔ لڑکیاں بچپن میں ہی بھلی لگتی ہیں۔ جوانی میں پاؤں کا کانٹا بن جاتی ہیں۔ تم اسے جوان ہونے سے پہلے ہی بیاہ دینا۔ اگر کبھی مجھے پتا چلا کہ تیری غفلت

سے فائدہ اٹھا کر یہ لڑکیاں بے لگام ہوگئی ہیں تو میں جیل کی سلاخیں توڑ کر آؤں گا اور تم ماں بیٹیوں کا جنازہ ایک ہی دن اٹھواؤں گا۔"

یہ دھمکی دے کر وہ چلا گیا۔ ایک برس تک مقدمہ چلا۔ اس کے وکیل نے اسے سزا سے بچانے کے لئے ہر ممکن کوشش کی لیکن اسے عمر قید کی سزا سنادی گئی۔ اس کی بیوی اس سے ملنے آیا کرتی تھی اور اسے جیل کے باہر کے حالات بتایا کرتی تھی۔ اس نے بتایا کہ نذیراں کی شادی ہوگئی ہے۔ ایک سال کے بعد خبر دی کہ نذیراں ماں بن گئی ہے پانچ برس بعد خبر دی کہ شادو جوان ہو رہی ہے۔ چنگیزی نے گھبرا کر کہا۔

"بس اب انتظار نہ کر اسے فوراً ڈولی میں بٹھا کر رخصت کردے۔"

"مگر ابھی تو وہ آٹھویں جماعت میں پڑھتی ہے اور شادی سے پہلے دس جماعتیں پاس کرنا چاہتی ہے۔"

چنگیزی نے غصے میں کہا۔ "تُو نے مجھ سے پوچھے بغیر اسے اتنا کیوں پڑھا دیا۔ کیا تجھے معلوم نہیں کہ زمانہ خراب ہے۔ لڑکیاں اسکول جانے کے لئے نکلتی ہیں اور کہیں اور چلی جاتی ہیں۔ ایک بیٹی سے دھوکہ کھا کر بھی تجھے عقل نہیں آئی۔ چلی جا یہاں سے اور شادو کو بیاہنے کے بعد ہی مجھے اپنی صورت دکھانا۔ اگر ایک ماہ کے اندر تُو نے بیٹی کے ہاتھ پیلے نہیں کیے تو میں تم سب کو گولی مار دوں گا۔"

وہ آہنی سلاخوں کے پیچھے گولی مار دینے کی فضول سی دھمکی دے رہا تھا۔ مگر اس کی بیوی سہم گئی کہ کہیں یہ جیل سے فرار ہو کر نہ آجائے۔ اس لئے وہ شادو کی شادی کردینے کا وعدہ کرکے وہاں سے چلی گئی۔ ایک ماہ بعد اس کی بیوی نے خوشخبری سنائی کہ شادو اپنے گھر کی ہوگئی ہے۔ اس کے بعد معمول کے مطابق اپنی بیٹیوں کے متعلق اور اپنی زمینوں کے متعلق اطلاعات ملتی رہیں کہ جیل کے باہر سب کچھ اس کی مرضی کے مطابق ہو رہا ہے۔

دیکھتے ہی دیکھتے جیل میں چودہ برس گزر گئے۔ اس کا تبادلہ دوسری جیل میں ہوگیا۔ اس جیل میں اتفاق سے اس کے قریبی پنڈ کا ایک آدمی مل گیا جو ڈکیتی کے جرم میں دو سال کی سزا کاٹنے آیا تھا۔ اس نے چنگیزی سے کہا۔

"چوہدری تم کس خوش فہمی میں مبتلا ہو۔ تمہاری بیوی تم سے خوفزدہ ہو کر تم سے بہت سی باتیں چھپاتی ہے۔ اگر سچی بات سننے کا حوصلہ ہے تو مجھ سے سنو' شادو کی

ڈولی تمہاری حویلی کے دروازے سے کسی نے اٹھتے نہیں دیکھی۔ کیونکہ وہ اپنے کسی عاشق کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔"

"اوئے کمینے کیا بکتا ہے۔ میں تیری زبان کھینچ لوں گا۔"

چنگیزی نے ایک دم سے بھڑک کر اس پر حملہ کیا لیکن دارا ان کے درمیان آگیا۔ وہ چنگیزی کو سمجھا بجھا کر ایک طرف لے گیا۔ پھر اس نے کہا۔

"شیر سلاخوں میں رہ کر صرف گرج سکتا ہے اپنی غیرت کو للکارنے والوں پر برس نہیں سکتا۔"

"میں یہ سلاخیں توڑ کر نکل جاؤں گا۔ اپنی عزت پر ہاتھ ڈالنے والے کو کتے کی موت ماروں گا۔"

دارا نے اس کے شانے کو تھپک تھپک کر کہا۔

"ذرا آہستہ میرے بڈھے شیر۔ ذرا آہستہ۔ تمہارے گرجنے سے قانون کے محافظ محتاط ہوجائیں گے۔ پھر ہم یہاں سے کبھی نہیں نکل سکیں گے۔ یہ سلاخیں توڑنا ہمارے بس کی بات نہیں۔ ذرا موقع کا انتظار کرو۔ میں تمہیں یہاں سے نکال کر لے جاؤں گا۔"

چنگیزی نے اسے احسان مندی سے دیکھا۔ اس کے بعد دارا سے اس کی دوستی ہوگئی۔ چند ماہ بعد انہیں پتھر توڑنے کے لئے ایک پہاڑی علاقے میں لے جایا گیا۔ پتھر توڑنے کا کام ایسا تھا کہ کام کے دوران ان کو بیڑیوں سے آزاد کردیا گیا لیکن مسلح سپاہی بڑی مستعدی سے ان کی نگرانی کررہے تھے۔ قانون کے محافظ نادان ناتجربہ کار یا کمزور نہیں ہوتے اپنے فرائض کو پوری ذمہ داریوں سے نبھانا جانتے ہیں لیکن کبھی کبھی تقدیر مجرموں کا ساتھ دے دیتی ہے۔ ایک جگہ راستہ بنانے کے لئے ایک بڑے سے پتھر کو ہٹانا تھا۔ یہ کام چنگیزی' دارا اور دوسرے چار قیدیوں کو دیا گیا۔ وہ سب پوری قوت سے زور لگا کر اسے ایک طرف ہٹانے لگے لیکن چنگیزی اور دارا کی طرف سے زور زیادہ پڑا تو وہ پتھر ڈھلان کی طرف لڑھکنے لگا۔ نیچے میدان میں دوسرے قیدی کام کررہے تھے اور سپاہی پہرہ دے رہے تھے۔ ایک دیو ہیکل پتھر کو اپنی طرف آتا دیکھ کر وہاں بھگدڑ مچ گئی۔

نیچے کام کرنے والوں کے لئے زبردست خطرہ پیدا ہوگیا۔ اوپر کھڑے ہوئے

تین سپاہی ذرا آگے بڑھ کر نشیب کی طرف دیکھنے لگے۔ اسی وقت چنگیزی اور دارا نے دو بڑے بڑے پتھر اٹھا کر دو سپاہیوں کے سروں پر دے مارے۔ تیسرے سپاہی کے پلٹنے سے پہلے ہی اسے نشیب کی طرف دھکا دے دیا۔ پھر انجام کی پرواہ کئے بغیر تیزی سے بھاگتے چلے گئے۔

چنگیزی چلتے چلتے پھر ایک بار تھک کر ایک درخت کے سائے میں بیٹھ گیا۔ اب وہ تنہا تھا۔ پتہ نہیں دارا کہاں بھٹک رہا ہو گا۔ پھر گرفتار ہو چکا ہو گا اور پولیس کو بیان دے رہا ہو گا کہ دوسرا مفرور قیدی سرحدی لائن کی طرف گیا ہے۔ چنگیزی نے ایک گہری سانس لے کر سوچا۔

"اچھا ہوا کہ میں نے راستہ بدل لیا۔ اب دارا اور اس لڑکی کے بیان کے مطابق مجھے مغربی علاقوں کی طرف تلاش کیا جائے گا۔ اوہ میں اپنے ماضی کی یادوں میں بھٹکتا ہوا کتنی دور آگیا ہوں۔ میں نے سوچا تھا کہ سرحد پار جاؤں گا۔ پھر ایک سال بعد واپس آؤں گا۔ اس وقت تک پولیس والے تھک ہار کر بیٹھ جائیں گے یہ سمجھ کر کہ مفرور قیدی سرحد پار کر چکا ہے اب گرفتار ہونے کے لئے واپس نہیں آئے گا لیکن مجھے واپس آنا تھا کیونکہ میں اس نوجوان کے لہو سے ہاتھ رنگنا چاہتا ہوں جو شادو کو بھگا کر لے گیا ہے۔"

وہ درخت کے سائے سے اٹھ کر پھر آگے بڑھنے لگا۔ اب شام ہو چکی تھی۔ اندھیرا ہونے سے پہلے وہ کوئی پناہ گاہ تلاش کر لینا چاہتا تھا۔ اس خیال سے وہ ذرا تیز قدم بڑھانے لگا۔ اس کے ساتھ ہی خیالات کا سلسلہ جاری تھا۔

"میں اس نوجوان کو کہاں تلاش کروں جس نے میری غیرت کو للکارا ہے۔ جس قیدی نے مجھے شادو کی بے غیرتی کے متعلق بتایا تھا میں نے اسے غصہ دکھا کر اپنا دشمن بنا لیا تھا۔ اس نے مجھے آگے کچھ بتانے سے انکار کر دیا تھا کہ وہ کہاں گئی ہے اور کس کے ساتھ گئی ہے؟"

وہ چلتے چلتے رک گیا۔ دور نشیب میں ایک چھوٹا سا شہر نظر آرہا تھا۔ مکانوں کی کھڑکیوں اور دروازوں سے نظر آنے والی روشنیاں دور سے چراغوں کی طرح ٹمٹماتی نظر آرہی تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ نشیب میں اترتے ہوئے سوچنے لگا۔

آج رات کسی ایسے گھر میں پناہ لینا ہو گی جو شہری آبادی سے ذرا الگ تھلگ

ہو۔ میں نے کیا سوچا تھا اور کیا ہو رہا ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ ایک برس بعد سرحد سے واپس آکر چک نمبر دو سوسترہ کی طرف جاؤں گا اور اپنی بیوی کی گردن دبوچ کر شادو اور اس نوجوان کا پتہ پوچھوں گا لیکن اب تو میری بیوی' میرا گھر' میری زمینیں مجھ سے چھ سو میل دور ہیں فی الحال میں وہاں نہیں پہنچ سکتا۔ ابھی کچھ عرصے تک مجھے چھپنے کے لئے کوئی اچھی سی جگہ تلاش کرنا ہو گی۔

وہ نشیب میں اتر کر ایک مکان کی طرف دیکھنے لگا۔ اس وقت تک رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ تقریباً سو گز کے فاصلے پر ایک مکان کی روشنیاں نظر آرہی تھیں۔ وہ دوسرے مکانوں سے الگ تو نہیں تھا لیکن آبادی کے آخری سرے پر تھا۔ وہ آہستہ آہستہ اس مکان کی طرف بڑھنے لگا تاریکی میں دیکھ لئے جانے کا اندیشہ نہیں تھا لیکن مکان کے نزدیک پہنچتے ہی پتا چلا کہ وہاں دال نہیں گلے گی۔ کیونکہ وہاں سے کتنے ہی لوگوں کے قہقہے سنائی دے رہے تھے۔ مردوں اور عورتوں کی ملی جلی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ ایک ریوالور دکھا کر اتنے لوگوں کو کنٹرول نہیں کر سکتا تھا۔

وہ وہاں سے گھوم کر مغرب کی سمت جانے لگا۔ وہ آبادی سے بہت دور چھپتا چھپاتا جا رہا تھا۔ اس سرے پر جتنے مکانات تھے ایک دوسرے کے ساتھ گڈمڈ تھے۔ اگر وہ کسی ایک گھر میں داخل ہوتا تو دوسرے گھروں تک خبر پہنچ جاتی۔ یہ خبر تو پہلے ہی اخبارات کے ذریعے پھیل چکی ہو گی کہ پچھلے دن دو قیدی فرار ہو چکے ہیں۔ ان کی تصویریں بھی شائع کی گئی ہوں گی۔ اس لئے وہ مسافر بن کر کسی کے یہاں پناہ نہیں لے سکتا تھا۔

وہ چھوٹا سا شہر تقریباً پانچ میل کے رقبے پر تھا۔ وہ شہر کے باہر ہی باہر چاروں طرف بھٹک رہا تھا۔ رات کے دس بجے وہ آبادی کے مغربی کنارے پر پہنچ کر رک گیا۔ ایک مکان سب سے الگ تھلگ نظر آرہا تھا شیشے کی کھڑکیوں سے روشنی چھن چھن کر باہر آرہی تھی۔ اِردگرد ملگجا سا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ اس اندھیرے میں وہ محتاط قدموں سے چلتا ہوا اس مکان کے ذرا قریب پہنچ گیا۔ وہاں گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس مکان میں کوئی نہ ہو لیکن کوئی تو ضرور ہو گا ورنہ وہاں روشنی نہ ہوتی۔

وہ تھوڑی دیر تک دیوار سے لگ کر چپ چاپ کھڑا رہا۔ پھر ذرا آگے کی طرف

جھک کر کھڑکی کے شیشے کے پار دیکھنے لگا۔ اندر کھڑکی کا پردہ ذرا سا سرکا ہوا تھا۔ سامنے کی دیوار پر ایک لڑکی کا سایہ نظر آیا۔ سائے کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کوئی چھوٹی سی بچی ہے چنگیزی کو نہ جانے کیسے اس لمحے شادو یاد آگئی' اس نے ذرا دماغ پر زور ڈال کر سوچا تو یاد آیا کہ شادو جب سات برس کی تھی تو کبھی کبھی باپ سے آنکھ مچولی کھیلتی تھی کہیں چھپ کر آواز دیتی تھی۔

"ابا میں کہاں ہوں؟"

ایسے وقت چنگیزی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آجاتی تھی کیونکہ وہ بھولی بھالی سی بٹی چھپتے وقت یہ بھول جاتی تھی کہ اس کا سایہ سامنے دیوار پر پڑ رہا ہے بچے سائے کو اہمیت نہیں دیتے۔ اسی لئے اپنے سائے سے پہچان لئے جاتے ہیں۔ مگر بڑوں کے متعلق یہ مشاہدہ ہے کہ وہ بچوں سے بھی گئے گزرے ہوتے ہیں۔ خود اپنے سائے کو بھی نہیں پہچان سکتے۔ جب روشنی کے سامنے ان کا سایہ دور تک پھیلتا ہے تو وہ یہی سمجھتے ہیں کہ وہ اپنے سائے کی طرح قد آور ہیں اور اپنے رعب و دبدبے سے دور تک چھائے ہوئے ہیں۔

اس نے سر کو جھٹک کر سوچا کہ میں آگے بڑھنے والا انسان ہوں۔ گھٹنے والی پرچھائیوں میں کیوں الجھ گیا۔ اسی وقت ایک دوسرا سایہ اس دیوار پر نظر آیا وہ کوئی جوان عورت ہی ہوگی' وہ ننھے سے سائے کے سر پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔ شاید وہ ہولے ہولے اس سے کچھ کہہ رہی تھی۔ پھر وہ اسے گود میں اٹھا کر چومنے لگی۔ اس کے بعد وہ پرچھائیں دیوار کی اسکرین پر اِدھر اُدھر ٹہلنے لگی۔ جب وہ ٹہلتی ہوئی.......... دوسری طرف جاتی تو پردے کے پیچھے سے اس کا تھوڑا سا لباس جھلکتا تھا۔ پھر وہ پلٹ کر دوسری طرف چلی جاتی تھی۔ دیوار پر ماں بٹی کا صرف سایہ رہ جاتا تھا۔

چنگیزی نے کسی جوش اور جذبے کے تحت اپنی مٹھیاں بھینچ لیں۔ اسے یاد آیا کہ اس کی بیوی اسی طرح شادو کو گود میں لے کر ٹہلانے کے دوران لوریاں دے کر سلاتی تھی۔ کیا دیوار کی اسکرین پر اس کی بیوی کا سایہ تھا؟ یا دنیا کی ساری مائیں اسی طرح اپنی گود کے پالنے میں بچوں کو اِدھر سے اُدھر جھلاتی ہوئی بالکل اسی انداز میں لوریاں دیتی ہیں۔ وہ بار بار دیوار پر تھرکنے والی پرچھائیوں کو دیکھ کر پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے خود اپنی پیشانی پر ہاتھ مار کر دل ہی دل میں کہا۔

"ارے چنگیزی بڑھاپے میں تیرا دماغ سٹھیا گیا ہے۔ تجھے ہر عورت اپنی بیوی اور ہر بچی اپنی شادو نظر آتی ہے۔ بیوقوف پندرہ برس گزر چکے ہیں۔ تیری شادو اب سات آٹھ برس کی بچی تو نہ ہوگی کہ تیری بیوی اب بھی اسے گود میں ٹہلاتی رہے۔ ارے دوسروں کو اپنی گود میں بلانے والے تیری شادو تو کسی نوجوان کی گود میں چلی گئی۔"

وہ غصے اور غیرت کے جوش میں تھر تھر کانپنے لگا کچھ دیر تک تو اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیسے اپنے غصے کو برداشت کرے یا کس طرح شادو اور اس نوجوان کے پاس پہنچ جائے۔ ایک گولی شادو کے لئے اور ایک گولی اس غیرت کو للکارنے والے کے لئے ٹھائیں ٹھائیں۔ چنگیزی نے تصور میں دونوں کو مرتے ہوئے دیکھا تو اس کا غصہ کسی قدر کم ہوگیا۔ اس کے بعد وہ مکان کے چاروں طرف دبے قدموں سے چلتا ہوا ایک چکر کاٹ کر یہ معلوم کرنے کی کوشش کرنے لگا کہ وہاں اور کتنے افراد ہیں لیکن دوسرے کمرے کی کھڑکیوں پر اس طرح پردے پڑے ہوئے تھے کہ مکان کے اندر کا حال معلوم کرنا مشکل ہوگیا۔ وہ ذرا اور دور ہٹ کر دیکھنے لگا۔ مکان کی چھت سرخ کھپریل کی تھی۔ وہ تھوڑی دیر سوچنے کے بعد ایک چھوٹے سے پتھر کو اٹھا کر ہاتھ میں تولنے لگا۔ پھر اس نے اس پتھر کو چھت پر پھینک دیا۔ وہ پتھر چھت کی ڈھلان پر ایک ایک کھپریل سے گزرتا ہوا اونچی آواز میں بجتا ہوا مکان کے سامنے آکر گر گیا۔ چند لمحوں کے بعد سامنے کا دروازہ کھلا پھر ایک عورت نے باہر نکل کر کہا۔

"کون ہے۔ یہ محلے کے بچے بہت شرارتی ہوگئے ہیں۔ اتنی رات کو بھی نہیں سوتے۔"

اس عورت نے اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد دروازے کو دوبارہ بند کیا۔ چنگیزی درخت کی آڑ سے نکل کر اس بند دروازے کو دیکھتے ہوئے سوچنے لگا کہ اتنی رات کو ایک عورت باہر نکل کر آئی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ گھر میں کوئی مرد نہیں ہے۔ ورنہ ایسے وقت گھر کا کوئی مرد ہی باہر آتا ہے۔ وہ مطمئن ہو کر آہستہ آہستہ چلتا ہوا دروازے کے سامنے آگیا۔ دروازے کے پیچھے پردہ سرک گیا تھا اور وہاں ایک چھوٹا سا ڈرائنگ روم نظر آرہا تھا۔ وہ دروازے پر دستک دینے لگا۔

دستک کی آواز سن کر وہ عورت ڈرائنگ روم میں آگئی۔ اس بار چنگیزی نے

اسے صاف طور سے دیکھا اور دل ہی دل میں کہا۔ اسے عورت نہیں نوجوان لڑکی کہنا چاہئے۔ شاید یہی لڑکی کسی بچے کو گود میں اٹھا کر لوریاں سنا رہی تھی۔ وہ دروازے کے پیچھے آکر کھڑی ہو گئی۔ اندر سے آنے والی روشنی چنگیزی تک پہنچ رہی تھی۔ لڑکی خوفزدہ اور حیرت زدہ تھی کبھی چنگیزی کو کبھی اس کے لباس کو دیکھ رہی تھی۔ اور چنگیزی اس خیال سے مسکرا رہا تھا کہ اس بار بھی ایک حسین اور نوجوان دوشیزہ ٹکرائی ہے۔ اس نے مسکراتے ہوئے ذرا اونچی آواز میں کہا۔

"میں ایک بھٹکا ہوا مسافر ہوں۔ کیا تم مجھے راستہ دکھا سکتی ہو؟"

وہ پھر بھی ساکت کھڑی رہی اور پریشان نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔ اس نے دروازہ کھولنے سے انکار بھی نہیں کیا اور دروازہ کھولنے کے لئے آگے بھی نہیں بڑھی۔ اس کے دیکھنے کا انداز اب بھی وہی تھا یعنی وہ کبھی چنگیزی کے لباس کو دیکھتی تھی اور کبھی ڈرتے ڈرتے نظریں اٹھا کر اس کی صورت کو دیکھنا چاہتی تھی۔ پھر فوراً ہی نظریں جھکا لیتی تھی۔

چنگیزی نے اس بار دروازے کے شیشے پر اپنی انگلیوں سے دستک دی۔ وہ چونک کر آگے بڑھی۔ پھر خوفزدہ ہونے کے باوجود دروازہ کھول دیا۔ اس کا خوف بجا تھا۔ کیونکہ دروازہ کھلتے ہی اس بھٹکے ہوئے مسافر کے ہاتھ میں ریوالور نظر آیا۔ وہ گھبرا کر ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔

"خبردار!" چنگیزی نے بڑی سفاکی سے کہا۔ "ذرا بھی آواز نکلی تو گولی مار دوں گا۔ مجھے فوراً بتاؤ کہ اس گھر میں اور کتنے لوگ ہیں؟"

وہ ہولے ہولے کانپ رہی تھی لیکن ریوالور سے خوفزدہ نہیں تھی۔ لوگ جس چیز سے ڈرتے ہیں اسی چیز کو سہم کر دیکھتے ہیں اور وہ بار بار چنگیزی کے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ چنگیزی نے دبی دبی غراہٹ سے کہا۔

"میں نے جو پوچھا ہے اس کا جواب دو۔"

"کک۔ کوئی نہیں ہے۔ مم۔ میرا مطلب ہے کہ صرف میں ہوں اور میری سات سال کی ایک بچی ہے۔"

چنگیزی نے اٹیچی کو فرش پر رکھ دیا۔ پھر آہستہ آہستہ اس کے چاروں طرف گھوم کر اسے ہر زاویے سے دیکھنے لگا۔

"ہاہاہا۔ مجھ سے جھوٹ بولتی ہے۔ اری تُو تو ابھی خود بچی نظر آتی ہے۔ کھلتی ہوئی کلی ہے۔ نکھرتا ہوا جوبن ہے۔"

"آ۔ آپ ایسی باتیں نہ کریں میں آپ کی بیٹی ہوں۔"

چنگیزی کا ایک الٹا ہاتھ اس کے منہ پر پڑا۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے کی طرف صوفے کے پاس جا کر گر پڑی۔

"پتہ نہیں تُو کس حرام زادے کی بیٹی ہے۔ وہ حرام زادہ میں نہیں ہوں خبردار آئندہ بیٹی کا رشتہ کبھی نہ لگانا۔ چل اب اٹھ جا۔"

وہ آہستہ سے اٹھتے ہوئے بولی۔

"اگر تُو اتنا ہی ظالم ہے تو مجھے اتنا بتا دے کہ کیا اپنی بیٹی کے منہ پر بھی ایسا طمانچہ مار سکتا ہے۔"

چنگیزی نے دانت پیس کر کہا۔

تُو طمانچہ مارنے کی بات کرتی ہو اور میں اس بیٹی کو گولی مارنے کے لئے جیل کی سلاخوں سے باہر آیا ہوں۔"

وہ ایک دم سے کانپ گئی۔ لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔

"تت۔ تُو اسے گولی مارنے سے پہلے یہ نہیں پوچھے گا کہ اس نے کیا قصور کیا ہے؟"

"پہلا قصور تو یہ کہ وہ میرے گھر میں پیدا ہوئی۔ دوسرا قصور یہ کہ وہ جوان ہوئی۔ تیسرا قصور یہ کہ جوانی کو پر لگ گئے اور وہ کسی نوجوان کے ساتھ اڑ گئی۔"

وہ ڈرتے ڈرتے کہنے لگی۔

"ہو سکتا ہے کہ کسی مجبوری نے اسے گھر چھوڑنے پر مجبور کر دیا ہو۔"

وہ گرجنے لگا۔ "بکواس مت کر۔ معلوم ہوتا ہے تُو بھی کسی کے ساتھ بھاگ کر آئی ہے۔ تُو نے بھی اپنے ماں باپ کو بدنام کیا ہے۔ اگر ایسا ہے تو میں تجھے گولی نہیں ماروں گا۔ کیونکہ صرف اپنی غیرت کے جوش میں گولیاں چلائی جاتی ہیں۔ میں تیری عزت کو بڑے پیار سے ذبح کر دوں گا۔"

"نن۔ نہیں۔" وہ سہم کر پیچھے ہٹتے ہوئے بولی۔ "میں کسی کے ساتھ بھاگ کر نہیں آئی ہوں۔ میرا باقاعدہ نکاح ہوا ہے۔"

"تو پھر گھر والا کہاں ہے؟"

"وہ کاروبار کے سلسلے میں باہر گیا ہوا ہے۔ کل تک واپس آجائے گا۔"

"اس کے علاوہ اور کتنے رشتے دار یہاں آتے ہیں؟"

"اور یہاں کوئی نہیں آتا۔"

"تو پھر ٹھیک ہے میں تیرے آدمی کو کنٹرول کرلوں گا۔ یہ مکان بہت اچھا ہے۔ کچھ روز یہاں چھپ کر بحفاظت رہ سکتا ہوں۔ ہاہاہا جانتی ہے میں کون ہوں؟"

لڑکی نے اثبات میں سرہلا کر ایک انگلی سے سینٹر ٹیبل کی طرف اشارہ کیا۔ صوفے کے درمیان جو میز رکھی ہوئی تھی اس پر ایک اخبار پڑا ہوا تھا۔ چنگیزی نے اسے اٹھا کر الٹ کر دیکھا تو اخبار کے آخری صفحے پر اسے اپنی اور دارا کی تصویر نظر آئی۔ اس نے لڑکی کو حیرانی سے دیکھ کر کہا۔

"تو تصویر دیکھ چکی تھی۔ دروازے کے باہر مجھے پہچان گئی تھی۔ پھر تو نے دروازہ کیوں کھول دیا۔ کیا تجھے اس بات کا ڈر نہیں تھا کہ میں ایک مفرور قاتل ہوں تجھے بھی قتل کرسکتا ہوں۔"

"ہاں میں تجھے دیکھتے ہی ڈر گئی تھی۔ میں نے سوچا تجھے پناہ دوں گی تو پھر تو مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا۔"

چنگیزی پہلی بار ذرا ست پڑ گیا۔ اس لڑکی نے جس اعتماد اور معصومیت سے اسے پناہ دینے کے لئے دروازہ کھولا تھا' اس معصومیت نے اسے ذرا سا متاثر کردیا۔ اس نے سرہلا کر کہا۔

"اچھی بات ہے' میں تجھے نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ یوں بھی میں بہت بھوکا ہوں اور تھکا ہوا ہوں۔ فی الحال تجھ میں دلچسپی نہیں لے سکتا۔ مجھے کھانے اور آرام کرنے سے دلچسپی ہے۔"

"میں نے پنکی کے ڈیڈی کے لئے سالن پکا کر رکھا ہے۔ تو یہاں بیٹھ میں گرم روٹیاں پکا کر لاتی ہوں۔"

"پنکی کون ہے؟"

"میری بچی کا نام ہے۔"

چنگیزی نے پھر اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ دل ہی دل میں کہا۔ سالی مجھ سے

جھوٹ بولتی ہے۔ ابھی خود اس کی عمر کیا ہوگی۔ اتنی جلدی بچی کیسے پیدا کرلے گی اور اگر کر بھی لی ہے تو کیا فرق پڑتا ہے۔ شراب کی بوتل جوں کی توں بھری ہے۔ وہ کچن میں جانے لگی تو اس نے کہا۔

"ٹھہر جا کچن میں جانے سے پہلے اتنا یاد رکھنا کہ میں بیڈ روم میں پنکی کے پاس رہوں گا۔ اگر تو نے کوئی چالاکی دکھائی مکان سے باہر جا کر کسی سے میرا ذکر کیا تو میں گرفتار ہونے سے پہلے پنکی کو گولی ماردوں گا۔"

لڑکی نے ریوالور کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اگر مجھے کسی کو بتانا ہی ہوتا تو میں تیرے لئے دروازہ نہ کھولتی۔"

یہ کہہ کر وہ کچن کی طرف چلی گئی۔ لڑکی کا اطمینان دیکھ کر چنگیزی پریشان ہوگیا۔ یہ بات اب تک اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ اس نے ایک خطرناک مفرور قاتل کے لئے دروازہ کیوں کھول دیا؟ وہ زیر لب بڑبڑاتا ہوا اسی بیڈ روم میں آگیا۔ جس کی کھڑکی کے باہر سے وہ کچھ دیر جھانکتا رہا تھا۔ وہاں ایک بستر پر پنکی گہری نیند میں سو رہی تھی۔ اس عمر میں ماں کی لوریاں بچوں کو اسی طرح خواب کی دنیا میں پہنچا دیا کرتی ہیں۔

لیکن لوریاں دینے والی ماں کچن میں پہنچ کر اپنے خواب کی بھیانک تعبیر دیکھ رہی تھی۔ آٹا گوندھا ہوا تھا۔ اس نے چولہے پر توا چڑھا کر آٹے کے پیڑے بناتے ہوئے سوچا۔

"اب کیا ہوگا؟ میں ابا کو کیسے بتاؤں کہ میں اس کی شادو ہوں پندرہ برس پہلے جیل جاتے وقت اس نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا تھا اور پندرہ برس بعد واپس آکر اسی ہاتھ سے طمانچہ مارا ہے۔"

وہ آستین سے آنسو پونچھنے لگی۔ اگر نہ پونچھتی تو وہ آنسو آٹے کے پیڑے میں جذب ہوجاتے۔ باپ ان روٹیوں کو چبا کر بھی آنسوؤں کے رشتے کو پہچان نہ سکتا۔

"اچھا ہوا جو وہ مجھے نہیں پہچان رہا ہے۔ ورنہ غیرت کے جوش میں گولی ماردیتا۔ یہ بھی نہ پوچھتا کہ میں نے کوئی قصور کیا ہے یا نہیں۔ میں نے کوئی غلطی نہیں کی کوئی گناہ نہیں کیا۔ میں نے باقاعدہ وسیم سے شادی کی ہے لیکن ابا اسے تسلیم نہیں کرے گا۔ اس لئے کہ پہلے وہ انتقام کے جوش میں اندھا ہو کر گولی چلاتا ہے اس کے بعد کسی بات کو سمجھتا ہے۔"

روٹیاں پکانے کے بعد اس نے سوچا کہ باپ کو ڈرائنگ روم میں آنے کے لئے آواز دے۔ مگر اسے کس رشتے سے پکارے۔ ابا کہتی تو ساتھ میں ریوالور کی گولی آتی اور نہ کہنے سے دل میں درد اٹھ رہا تھا۔ بعض اوقات تقدیر عجیب مذاق کرتی ہے۔ جب وہ وسیم سے شادی کرنے کے بعد ماں سے ملنے گئی تھی تو ماں نے اسے معاف کردیا تھا۔ اس لئے کہ مائیں تو معاف کرنے والا جذبہ لے کر اولاد کو جنتی ہیں لیکن اس نے کہا تھا۔

"بیٹی تیرا باپ تجھے معاف نہیں کرے گا۔ میں نے تجھے دودھ پلایا ہے مگر ایک بار دودھ کی جلی ہوں' نذیراں کا انجام دیکھ چکی ہوں' اس لئے تُو اپنے مرد کے ساتھ کہیں دور چلی جا۔"

اس کی ماں یہ مشورہ نہ دیتی۔ تب بھی وہ دور اس علاقے میں چلی آتی کیونکہ اسی علاقے میں وسیم کا تبادلہ ہوا تھا۔ وسیم کا خیال آتے ہی پھر وہ ایک بار کانپ سی گئی۔ اس لئے کہ اس کا باپ یہاں آگیا تھا۔ وسیم سے کسی وقت بھی سامنا ہو سکتا تھا اور وہ جو وسیم تھا وہ اس کی بڑی بہن نذیراں کے عاشق کی طرح نہتا نہیں رہتا تھا۔ ہر وقت اس کے ہولسٹر میں ریوالور موجود رہتا تھا۔ اس لئے کہ وہ پولیس انسپکٹر تھا اور اس کے باپ کی تلاش میں نکلا ہوا تھا۔

شادو کا دل ڈوبنے لگا۔ اس بار بڑا جوڑ توڑ کا مقابلہ تھا۔ اس کا باپ وسیم کو پولیس انسپکٹر کے روپ میں دیکھ کر اپنے بچاؤ کے لئے یقیناً اس پر گولیاں چلا سکتا تھا اور وسیم اپنا فرض ادا کرنے کے لئے اپنی شادو کے رشتے کا خیال نہ کرتا۔ شادو نے اس سے پوچھا بھی تھا۔

"اگر ابا سے سامنا ہو گیا تو آپ کیا کریں گے؟"

"میں اپنا فرض نبھاؤں گا اور یہ کوشش کروں گا کہ وہ مقابلہ کے بغیر خود کو قانون کے حوالے کردیں' ورنہ مقابلے کا انجام تو تم جانتی ہو تمہارے ابا مریں گے یا پھر تمہارا سہاگ لٹ جائے گا۔"

وہ دل پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئی۔ وہ باپ اور شوہر کو نہیں سمجھا سکتی تھی اور اپنے دل کو بھی تھام کر بار بار نہیں سمجھا سکتی تھی کہ وہ ایک سے پیار کرے اور دوسرے رشتے کو بھول جائے۔ مگر نہیں اللہ مہربان ہے۔ اسی لئے اس کے باپ کو اس کے شوہر

کی غیر موجودگی میں یہاں بھیج دیا ہے۔ اب وہ کسی طرح اپنے ابا کو یہاں چھپا کر رکھ سکتی تھی اور خطرے کے وقت یہاں سے بھگا سکتی تھی۔

وہ سوچتے سوچتے اک دم سے چونک گئی۔ رشتوں اور جذبوں میں الجھ کر اسے پتہ چلا ہی نہ چلا کہ ایک گھنٹہ گزر چکا ہے۔ روٹیاں ٹھنڈی ہو رہی ہیں۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر تیزی سے چلتی ہوئی اپنے بیڈ روم میں پہنچ گئی۔ سامنے بستر پر پنکی سو رہی تھی۔ بستر کے سامنے چنگیزی ایک ایزی چیئر پر نیم دراز تھا۔ کرسی کے ہتھے پر اس کا ہاتھ اس پوزیشن میں تھا جیسے وہ ریوالور تھامے اپنی نواسی کو نشانے پر لئے بیٹھا ہو لیکن اب وہ ریوالور اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر قالین پر گر پڑا تھا اور کمرے میں اس کے خراٹے کی آواز گونج رہی تھی۔ شادو کو یاد آیا کہ جب وہ پنکی کی طرح سات برس کی تھی تو باپ کے سینے سے لگ کر سوتی تھی لیکن اس کے سونے سے پہلے یہی جانے پہچانے خراٹے سنائی دیتے تھے۔ خراٹوں کی کیسی بے ہنگم سی آواز ہے لیکن کیسی پیار بھری موسیقی ہے جو ماں کی لوریوں کی طرح خواب آور ہے۔

اس نے آگے بڑھ کر ریوالور کو قالین پر سے اٹھا لیا۔ وہ پچھلے دن دوپہر سے بھاگتا چلا آرہا تھا اسے ستانے کا موقع تو ملتا تھا مگر سونے کا موقع نہیں ملتا تھا۔ تقریباً چھبیس گھنٹے تک بھاگتے رہنے کے بعد اب سونا جاگنا اس کے اختیار میں نہیں تھا۔ اس کی جگہ کوئی نوجوان ہوتا تو شاید نیند پر قابو پالیتا لیکن جوان عورتوں کے لئے للچانے والا بڑھاپا ایسے مقام پر پہنچ کر بے بس ہو جاتا ہے اور تھک کر سو جاتا ہے۔

شادو اپنے ہاتھ میں ریوالور لے کر سوچتی رہی کہ اب اسے کیا کرنا چاہئے کیا باپ کو نہتا کردے۔ اگر ایسے میں پولیس والے پہنچ گئے تو باپ کمزور پڑ جائے گا۔ وہ یہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ دوسری طرف شوہر کمزور پڑ جائے۔ عجیب سی کشمکش تھی۔ تھوڑی دیر تک وہ تذبذب میں گرفتار رہی۔ پھر اس کے دماغ میں یہ بات آئی کہ باپ کے ہاتھ میں ریوالور ہو گا تو اپنی بیٹی اور نواسی پر بھی رحم نہیں کرے گا۔ وسیم پر تو بغیر سوچے سمجھے حملہ کرے گا۔ للذا اسے مسلح ہونے کا فریب دینا چاہئے۔

وہ ریوالور کا چیمبر خالی کرنے لگی۔ اسی وقت چنگیزی نیند میں بڑبڑانے لگا۔ وہ اک دم سے سہم کر باپ کو دیکھنے لگی۔ گھبرانے کی بات نہیں تھی وہ آنکھیں بند کئے خواب کی دنیا میں کسی سے باتیں کر رہا تھا۔ شادو نے ریوالور کو جہاں سے اٹھایا تھا وہیں

رکھ دیا۔ پھر ایک گوشے میں جاکر کارتوس کو قالین کے نیچے چھپا دیا۔ پھر اس نے گھڑی کی طرف دیکھا تو پورے بارہ بجے تھے۔ وہ بیڈ روم سے باہر آکر ڈرائنگ روم کے بیرونی دروازے کو دیکھنے لگی۔ باپ کی طرف سے خطرہ ٹل گیا تھا کہ وہ ریوالور سے نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔ مگر اب وسیم کی طرف سے ڈر لگ رہا تھا۔ پتہ نہیں وہ کس وقت یہاں پہنچ جائے۔ اگر اس کے ابا کے قدموں کے نشانات مل گئے ہوں گے یا کسی طرح اس بات کا پتہ چل گیا ہوگا کہ وہ مفرور قیدی اسی طرف آیا ہے تو وہ بھی پولیس کی جماعت لے کر یہاں پہنچ جائے گا۔

مجرم اس خوش فہمی میں مبتلا رہتے ہیں کہ وہ اپنے پیچھے کوئی سراغ نہیں چھوڑ گئے ہیں۔ ابا بھی اسی خوش فہمی میں مبتلا ہو کر یہاں چلے آئے ہیں۔ ان کے فرشتوں کو بھی علم نہیں ہے کہ یہ ان کی بیٹی اور ایک پولیس انسپکٹر کا گھر ہے۔ حتیٰ کہ وہ اپنے اس لباس کو بھی نہیں پہچان سکے جسے وہ پہن کر آئے ہیں۔ جب میں شادی کے بعد پہلی بار امی سے ملنے گئی تھی تو اس حویلی میں ابا بہت یاد آئے تھے میں نشانی کے طور پر ان کے لباس کا یہ جوڑا اٹھا کر لے آئی تھی۔ پندرہ برس تک بڑے جتن سے اپنے سوٹ کیس میں رکھا۔ پھر تقریباً دس روز پہلے میں نے اسے نکال کر وسیم کو پہننے کے لئے دیا پتہ نہیں کیوں میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی تھی کہ میں اپنے شوہر کو اپنے باپ کے لباس میں دیکھوں۔

ماہر نفسیات کہتے ہیں کہ لڑکیاں بچپن ہی سے اپنے باپ کی شخصیت سے متاثر ہوتی ہیں۔ اس لئے شادی کے بعد اس شخصیت کی کچھ جھلکیاں اپنے شوہر میں دیکھنا چاہتی ہیں۔ وسیم نے میری اس خواہش کو سمجھتے ہوئے مسکرا کر اس لباس کو پہن لیا تھا۔ میلا ہونے کے بعد میں نے اسے دھوبی کو دے دیا۔ اب وہ کمبخت آئے گا تو وہ دکھڑا روئے گا کہ لباس چوری ہوگیا ہے۔ اسے کیا معلوم کہ اس نے میرے باپ کو اس کا اپنا لباس پہنا کر بھیجا ہے۔ میں تو دروازے کے شیشے کے پار اس لباس کو دیکھتے ہی سہم گئی تھی کہ کہیں ابا تو نہیں آگئے اور جب چہرہ دیکھا تو چند لمحوں تک اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا واقعی بعض اوقات تقدیر رشتوں کو ملانے کا بڑا خوفناک مذاق کرتی ہے۔

وہ سوچنے کے دوران اِدھر سے اُدھر ٹہلتی رہی اور بار بار بیرونی دروازے کے کی طرف دیکھ کر سوچتی رہی کہ انسپکٹر وسیم اچانک ہی آدھمکا تو وہ باپ کو کس طرح

بچائے گی۔ ریوالور خالی کر دینے کے بعد اب اس کے شوہر کے لئے خطرہ نہیں رہا تھا لیکن باپ کی گرفتاری لازمی تھی۔ اس وقت اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تو اس نے بیڈ روم کے دروازے کے پٹ لگا دیئے تاکہ وسیم آتے ہی اس کے باپ کو نہ دیکھ سکے۔ وہ اپنے شوہر کے گلے میں باہیں ڈال کر پیار کرے گی، پھر یہ کہہ اسے دوسرے بیڈ روم میں لے جائے گی کہ پنکی کو ڈسٹرب نہیں کرنا چاہئے۔

سوچتے ہی سوچتے اچانک دروازے پر دستک سنائی دی۔ اس کا دل دھک سے ہوگیا۔ اس نے گھبرا کر ایک بار اس بیڈ روم کی طرف دیکھا جس کے پٹ یونہی لگا دیئے تھے۔ اگر وہ باقاعدہ اس دروازے کو چٹخنی لگا کر بند کرتی تو انسپکٹر شوہر کے دماغ میں یہ سوال ضرور پیدا ہوتا کہ بیٹی کو اندر سلا کر باہر سے دروازہ کیوں بند کیا گیا ہے۔ دروازے پر دوبارہ دستک ہوئی تو وہ جلدی سے آگے بڑھ کر شیشے کے پار دیکھنے لگی۔ اس بار دستک دینے والا نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ وسیم کی شرارت کو سمجھ گئی۔ وسیم اسے چھیڑنے کے لئے بعض اوقات دستک دینے کے بعد چھپ جاتا تھا اور چھپ کر اسے ڈراتا تھا لیکن آج وہ مذاق کے موڈ میں نہیں تھی۔ فوراً ہی دروازہ کھولنے کے بعد باہر آکر بولی۔

"بس پولیس انسپکٹر صاحب سامنے آجائیے۔ آپ کی شریکِ حیات بزدل نہیں ہے۔"

لیکن وہ سامنے نہیں آیا۔ پیچھے سے آکر ایک ہاتھ سے اس نے اس کے منہ کو دبایا اور دوسرے سے چاقو کی نوک اس کے سینے پر رکھتے ہوئے بولا۔

"نو چیخنا نو چلّانا۔ میں بہت خطرناک مسخرہ ہوں ہنستے ہنستے قتل کر دیتا ہوں۔"

وہ فولادی پنجہ شادو کے منہ پر اس مضبوطی سے جم گیا تھا کہ چیخنے چلّانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مارے دہشت کے اس کے دیدے پھیل گئے تھے۔ جب چاقو کی نوک اس کے سینے کے وسط میں آکر ٹھہری تب اسے عقل آئی کہ اس نے باپ کی صورت دیکھ کر دوسرے مفرور قیدی کو بھلا دیا تھا۔ اسے پہلے ہی سے محتاط رہنا چاہئے تھا۔ مگر اب سوچنے سے کیا ہوتا تھا۔ اب تو اس کا باپ بھی نہیں بچا سکتا تھا کیونکہ باپ کے پاس وہ خالی ریوالور چھوڑ کر آئی ہے۔ اسے اپنے کان کے پاس دبی دبی سی غراہٹ سنائی دی۔

"جو پوچھتا ہوں اس کا صحیح جواب دو' جواب دینے کے بجائے چلاؤ گی تو پھر یہ چاقو تمہارے سینے میں بلکہ خوبصورت دھڑکتے ہوئے سینے میں ہی ہی ہی ہی............"

اس نے بڑی سفاکی سے ہنستے ہوئے اپنا ہاتھ اس کے منہ پر سے ہٹاتے ہوئے پوچھا۔

"جانی' اس جوانی کے کتنے پہریدار اس مکان میں موجود ہیں؟"

"کک۔ کوئی نہیں۔ مم۔ میں ہوں اور۔ اور میری ایک سات سال کی بچی ہے۔"

"کیوں جھوٹ بولتی ہے ارے ابھی تو تیری ہی جوانی کا بچپنا نہیں گیا ہے۔ جب ہم بچے کھیلیں گے تب کسی بچے کی بات کرنا۔ ہاں تو جانِ من سچ بتا دو کہ گھر میں کتنے آدمی اور ہیں؟"

"میں نے سچ کہہ دیا۔ تجھے یقین نہیں آتا تو میں کیا کروں۔"

"اچھا۔ چلو کڑھائی سے اچھل کر تو چولہے میں ہی گرنا پڑتا ہے۔ مگر یاد رکھو جب مرنے کا وقت آیا تو تمہیں بھی اپنے ساتھ لے مروں گا۔"

وہ اسے اپنے آگے دھکا دیتا ہوا ڈرائنگ روم میں آگیا۔ پھر اس نے دروازے کو اندر سے بند کرنے کے بعد چاقو کے پھل کو شادو کی گردن پر رکھتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔

"اس گھر میں جتنے لوگ ہیں وہ میرے سامنے آجائیں۔ اگر کسی نے چھپنے کی کوشش کی یا چیخنے چلانے کی کوشش کی تو میں اس لڑکی کو پانی پلائے بغیر ذبح کر دوں گا۔"

یہ کہہ کر وہ جواب کا انتظار کرنے لگا۔ شادو نے کہا۔

"میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں کہ یہاں میرے ساتھ ایک چھوٹی سی بچی ہے وہ سو رہی ہے تمہاری آواز سن کر یہاں نہیں آئے گی۔"

"کیسے نہیں آئے گی۔ ایک بڑک لگاؤں گا تو اس کا باپ بھی آئے گا۔ اے کہاں ہے ری ننھی سی چھوکری' چل جلدی سے باہر آجا۔ نہیں تو تیری ماں مرجائے گی۔"

اس کے جواب میں پنکی کے بیڈ روم کا دروازہ بڑی آہستگی سے کھل گیا۔ وہاں چنگیزی ہاتھ میں ریوالور لئے کھڑا تھا۔ اسے دیکھتے ہی دارا بوکھلا گیا۔ چنگیزی نے ریوالور

کا رخ اس کی جانب کرتے ہوئے کہا۔

"تو پھر مرنے کے لئے میرے سامنے آگیا ہے۔ چھوڑ دے اس لڑکی کو۔"

"یار چنگیزی بھائی تُو تو خواہ مخواہ میرا دشمن بن گیا ہے۔ چل تو بھی مجھے بہن اور بیٹی کی گالی دے دے اور غصہ تھوک کر دوستی کر لے۔"

"ٹھیک ہے میں یہاں خون خرابہ نہیں کرنا چاہتا یوں بھی ہماری بھلائی اسی میں ہے کہ ہم آپس میں مل کر رہیں۔"

دارا نے شادو کو اپنے سامنے سے ہٹاتے ہوئے کہا۔

"چنگیزی تیری موجودگی بتا رہی ہے کہ یہاں فی الحال خطرہ نہیں ہے۔ مگر کیا تُو جانتا ہے کہ یہ ایک پولیس انسپکٹر کا گھر ہے۔"

"کیا بکتا ہے؟" چنگیزی نے گھبرا کر پوچھا۔

"بکتا نہیں سچ کہتا ہوں۔ ابھی میں دروازے پر دستک دے کر ایک جگہ چھپ گیا تھا۔ یہ چھوکری نما عورت باہر نکل کر یہ سمجھ رہی تھی کہ اس کا شوہر آیا ہے اور اسے پولیس انسپکٹر کہہ کر مخاطب کر رہی تھی۔"

چنگیزی نے گھور کر شادو کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کیا یہ سچ ہے؟ اگر یہ سچ ہے تو تُو نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔"

"میں نے سوچا تھا کہ تجھے روٹی کھلاتے وقت بتاؤں گی لیکن جب روٹی پکا کر تیرے پاس آئی تو تجھے گہری نیند میں سوتا دیکھ کر مجھے تجھ پر ترس آگیا تو مجھے اپنا دشمن نہ سمجھ۔ اگر میں تجھے مارنا چاہتی تو تیرا ریوالور فرش پر گرا ہوا تھا لیکن میں نے اسے وہاں سے نہیں اٹھایا۔"

چنگیزی اسے حیرانی اور پر[illegible]ں سے دیکھنے لگا۔ وہ لڑکی اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ اس حقیقت کو وہ تسلیم کر رہا تھا کہ جب اس کی آنکھ کھلی تو ریوالور سچ مچ اس کے ہاتھ میں نہیں تھا۔ قالین پر پڑا ہوا تھا۔ اگر وہ چاہتی تو ریوالور اٹھا کر کم از کم اپنی بچی کی حفاظت کے لئے اسے گولی کا نشانہ بنا دیتی یا نزدیک رہنے والوں کو بلا کر اسے تھانے پہنچا دیتی۔

وہ تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ پھر اس کے دماغ میں یہ بات آئی کہ اس لڑکی کے دل میں کسی چور محبت کا جذبہ ہے۔ جسے وہ چھپا کر رکھ رہی ہے اور اس کے اظہار سے گریز

کر رہی ہے۔ سوچتے سوچتے اس نے سامنے دیوار پر لگے ہوئے آئینے میں اپنے آپ کو دیکھا۔ پھر ایک ہاتھ اپنے چہرے پر پھیرا۔ داڑھی بڑھی ہوئی تھی اور داڑھی کے بال کالے کم تھے اور سفید زیادہ تھے۔ اس کے دل نے سمجھایا بال سفید ہونے سے کیا ہوتا ہے میرے چہرے پر اب تک جوانی اور مردانگی باقی ہے۔ اب سمجھ میں آیا کہ یہ لڑکی مجھ پر مرمٹی ہے۔

اس نے مسکراتے ہوئے شادو کو دیکھا۔ شادو بھی جواباً مسکرانے لگی تو وہ خوشی سے اور کھل گیا۔ اس نے پھر سوچا۔

"آج کل کی لڑکیاں نوجوانوں سے زیادہ بوڑھوں کو پسند کرتی ہیں۔ اسی لئے یہ لڑکی بند دروزے کے پار مجھے دیکھتے ہی متاثر ہو گئی تھی۔ میں اس سے پہلے بھی کتنی ہی الہڑ دوشیزاؤں کو متاثر کر چکا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے مجھے مفرور سمجھ کر خوفزدہ ہونے کے بجائے اپنا عاشق سمجھ کر دروازہ کھول دیا تھا۔"

دارا نے اس کی طویل خاموشی سے اکتا کر کہا۔

"سوچتا کیا ہے چنگیزی اس لڑکی نے تجھے دھوکہ دیا ہے' یہ اپنے خاوند کا انتظار کر رہی ہے۔ وہ پولیس انسپکٹر پتہ نہیں کتنے سپاہیوں کے ساتھ یہاں پہنچے گا۔ میں کہتا ہوں اس چھوکری کو قتل کردے اور یہاں سے بھاگ چل۔"

"تُو بکواس نہ کر میں نے تجھ سے مشورہ نہیں مانگا۔ ہاں تو لڑکی تیرا نام کیا ہے؟"

"شا.......... شا۔" وہ اپنا نام بتانے سے پہلے ہی کانپ گئی کہ باپ شادو کا نام سن کر اس کی گردن دبوچ لے گا۔ آخر اس نے سنبھل کر کہا۔ "شا۔ شاہدہ میرا نام شاہدہ ہے۔"

چنگیزی نے بڑی محبت سے کہا۔

"شاہدہ! میں تم پر بھروسہ کرتا ہوں۔ یہ بات اچھی طرح سمجھ گیا ہوں کہ تُو مجھے چاہتی ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے فخریہ انداز میں دارا کو یوں دیکھا جیسے کہہ رہا ہو کہ دیکھ لے جوان تُو مجھے بوڑھا کہتا ہے لیکن یہ لڑکیاں مجھے بوڑھا نہیں سمجھتیں۔ تم ان لڑکیوں کی پسند سے ہی سمجھ سکتے ہو کہ محبت کی صحیح عمر کیا ہوتی ہے۔ اس نے پھر شادو سے پوچھا۔

"تو یہ بتا کہ تیرا شوہر آجائے گا تو پھر تو ہمیں کس طرح چھپائے گی؟"

"ابھی تک تو یہی سمجھ میں آیا ہے کہ اسٹور روم میں چھپا دوں گی۔ وسیم کی عادت نہیں ہے کہ وہ ہر کمرے میں جھانکتے پھریں۔ وہ تھکے ماندے اندر آئیں گے' میں انہیں سلادوں گی۔ اب باتیں بہت ہو چکیں تم چلو دونوں روٹی کھالو۔"

وہ ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گئی۔ چنگیزی اور دارا بھی ایک ساتھ چلتے ہوئے وہاں ایک بڑی سی میز کے اطراف آکر بیٹھ گئے۔ چنگیزی نے بڑے پیار سے شادو کا ہاتھ تھام کر کہا۔

"تُو بہت خوبصورت ہے۔ جا میری اٹیچی سے وہسکی کی ایک بوتل نکال کر لے آ۔"

وہ بیڈ روم میں گئی اور وہاں رکھی ہوئی اٹیچی میں سے بوتل نکال کر باپ کے پاس لے گئی۔ پھر سالن اور روٹیاں بھی لاکر رکھ دیں۔ اس کے بعد پنکی کے پاس چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد دارا نے شراب کا جام ہاتھ میں لے کر کہا۔

"تم نے اس لڑکی کو بے لگام چھوڑ دیا ہے۔ اگر یہ پسند آگئی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس پر اندھا اعتماد کرلیا جائے۔"

چنگیزی نے شراب کا آدھا جام خالی کرنے کے بعد کہا۔

"میں اسے کیا پسند کروں گا' اس نے خود ہی مجھے پسند کرلیا ہے۔"

"دیکھو یار مالِ غنیمت میں برابر کا حصہ ہونا چاہئے۔"

"بکواس مت کرو۔ اس لڑکی نے ہمیں پناہ دی ہے۔ ہمیں اس کی عزت کرنا چاہئے اور تم اس کی عزت لینے کا ناپاک منصوبہ بنا رہے ہو۔"

"دیکھو یار تم پھر لڑکی کی طرف سے روزہ رکھنے والی بات نہ کرنا ہم دونوں ایک مدت کے بعد جیل سے آرہے ہیں۔ ایک مدت بعد عورت اتنے قریب آجائے تو شیطان بہکانے کا حقدار ہو جاتا ہے اور ہمارا بہکنا بھی جائز ہو جاتا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ اپنے لئے دوسرا جام بنانے لگا۔ چنگیزی چاہتا تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ پی لے اور پی کر مدہوش ہو جائے اسے بھی پچھلی دوپہر سے شاید سونے کا موقع نہیں ملا ہوگا۔ اس نے پوچھا۔

"دارا۔ مجھ سے بچھڑنے کے بعد تم کہاں بھٹک رہے تھے تمہیں سونے کا موقع تو ملا ہوگا؟"

"نو موقع۔ نو چانس۔ بھاگتے بھاگتے یہ وقت آگیا ہے میں اندازے کے مطابق مغربی سرحدی لائن کی طرف بڑھتا آرہا تھا۔ رات ہوئی تو تاریکی میں بھٹکتا ہوا یہاں پہنچ گیا۔"

"اب تمہیں پینے اور کھانے کے بعد یہاں آرام سے سو جانا چاہئے میں جاگ کر پہرہ دیتا رہوں گا۔"

"واہ میرے بوڑھے طوطے۔ مجھ سے زیادہ چالاک بن رہے ہو۔ مجھے سلا کر اس چھوکری کے پاس جانا چاہتے ہو۔"

"یہ بات نہیں ہے دارا۔ تم اس کا خیال چھوڑ دو۔ وہ لڑکی بہت معصوم اور بہت رحم دل ہے۔ ایسی جگہ جہاں ہمیں پناہ ملی۔ جہاں کھانے کو روٹی ملی اور اب اطمینان سے سونے کے لئے اس لڑکی کا اعتماد مل رہا ہے تو ایسے وقت ہمیں اپنے ظرف کو 'اپنے ایمان کو آزمانا چاہئے۔ ایک لڑکی جو ہم پر مسلسل احسان کئے جا رہی ہے ہمیں اس کی عزت سے کھیل کر شیطان نہیں بننا چاہئے۔

دارا نے وہسکی سے تیسرا گلاس بھرتے ہوئے کہا۔

"دیکھ چنگیزی بوڑھی نصیحتیں نہ کر۔ انسان کو نصیحتوں کے ذریعے اوپر سے نہیں بدلا جا سکتا۔ بدلنے کے لئے اندرونی انقلاب کی ضرورت ہوتی ہے۔ پہلے اندر سے ضمیر کو بدلنا چاہئے۔ سوچ کو بدلنا چاہئے۔ خود غرضی کے بجائے دوسروں کو اپنے اندر بٹھا کر یہ سمجھنا پڑتا ہے کہ ہم اسے کدھر سے نقصان پہنچا رہے ہیں۔ جدھر سے نقصان پہنچ رہا ہو وہ راستہ بند کر دیں مگر ہم ایسا نہیں کر سکتے۔ اس لئے کہ ہم بھوکے ہیں۔"

"اور اس لئے تم بھونک رہے ہو کتے کہیں کے۔ آدمی اور کتے میں کچھ تو فرق ہونا چاہئے۔ جب کتا دوسروں کو کاٹنے کی شدید خواہش میں پاگل ہو جاتا ہے تو اسے گولی ماردی جاتی ہے۔ اگر میں گولی مار دوں تو تیری ساری بھوک ختم ہو جائے گی۔"

دارا نشے میں جھومتے ہوئے اور نیند کے غلبے سے اونگھتے ہوئے ریوالور کی جانب دیکھنے لگا۔ اس نے لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے کہا۔

"کیا............ ہے یہ............؟"

اب وہ ریوالور کو نہیں سمجھ رہا تھا۔ اپنے سامنے بیٹھے ہوئے دوست یا دشمن کو نہیں پہچان رہا تھا۔ تین پیگ پینے کے بعد اس طرح کوئی آؤٹ نہیں ہوتا لیکن شراب

کے نشے سے زیادہ تھکن اور نیند کے غلبے نے اسے آؤٹ کر دیا۔ اس کا سر آگے کی طرف جھک کر میز کی طرف آگیا۔ پھر اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ تب چنگیزی نے فیصلہ کیا کہ اسے ہمیشہ کے لئے راستے سے ہٹا دینا چاہئے۔ اگر یہ زندہ رہے گا تو ہمیشہ راستے کی رکاوٹیں بنتا رہے گا۔ یہ سوچ کر اس نے ریوالور والا ہاتھ آگے بڑھایا۔ پھر اس کے سر کا نشانہ لے کر ٹریگر دبایا۔ کھٹ کی آواز کے ساتھ ریوالور ٹھنڈا ہو گیا۔ وہ چونک کر ریوالور کو دیکھنے لگا۔ اس کے چیمبر کو گھما کر ایک ایک خانے کو دیکھنے کے بعد غصے سے دانت پیستے ہوئے اس طرف سر کو گھمایا۔ جہاں شادو گئی تھی۔

"مکار کہیں کی میری غفلت سے فائدہ اٹھا کر ریوالور کو خالی کر دیا ہے اور بڑی معصومیت سے یقین دلا رہی تھی کہ ریوالور قالین پر سے نہیں اٹھایا۔"

وہ غصے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر وہاں سے پنکی کے بیڈ روم کی طرف جانے لگا۔

"اب میری سمجھ میں آگیا کہ وہ اتنی زیادہ مطمئن کیوں ہے۔ وہ سمجھ رہی ہے کہ ریوالور تو خالی ہو چکا ہے۔ اب اسے اور اس کی بچی کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اس کا خاوند بھی گرفتار کرنے آئے گا تو میں جوابی حملہ نہ کر سکوں گا۔ سؤر کی بچی میں تو تیری بوٹی بوٹی نوچ ڈالوں گا۔"

وہ پنکی کے بیڈ روم کے دروازے پر پہنچتے ہی ٹھٹک گیا۔ شاید پنکی بیدار ہو گئی تھی اور شادو اسے لوری دے کر سلا رہی تھی مگر لوری کے بول ایسے تھے کہ وہ ایک دم سے بیس برس پیچھے چلا گیا۔ اپنی حویلی کے دروازے پر پہنچ گیا۔ اندر سے اسے اپنی بیوی کے گانے کی آواز سنائی دے رہی تھی وہ دو برس کی ننھی شادو کو لوری دے کر سلا رہی تھی۔ مگر لوری کے بول اور بول کی ادائیگی ممتا کے ترنم کی شیرینی سب کچھ وہی تھی۔ وہ بیس برس کے بعد پھر پنکی کے دروازے پر پہنچ گیا۔ اندر جو عورت پنکی کو لوری دے رہی تھی اور سلا رہی تھی وہ ایک بوڑھے کو جھنجھوڑ کر جگا بھی رہی تھی۔

وہ تذبذب میں پڑ گیا اندر جو عورت ہے 'اس نے لوری کا یہ انداز' یہ بول کہاں سے سیکھ لیا۔ وہ ایک قدم آگے بڑھ کر کمرے کے اندر دیکھنے لگا۔ شادو بستر پر دروازے کی جانب پشت کئے لیٹی ہوئی تھی اور پنکی کو سینے سے لگا کر تھپک رہی تھی۔ اب لوری کے بول دھیمی دھیمی گنگناہٹ میں بدل گئے تھے۔ شاید اس لئے کہ پنکی

سو چکی تھی مگر چنگیزی کے اندر شیطان جاگ رہا تھا۔ شادو پشت کی جانب سے نظر آ رہی تھی اور اس کا لہر لہر خم کھا کر ابھرنے والا بدن للچا رہا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر اس کے سڈول بازو پر ہاتھ رکھا تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ اس کا دوپٹہ اس سے دور پڑا ہوا تھا۔ کھلے گریبان کی جھپ نے بوڑھے کی آنکھوں میں مرچیں بھر دیں۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ کیا دیکھ رہا ہے اور کسے دیکھ رہا ہے۔ ہوس کے حمام میں خون اپنے خون کو بھی نہیں پہچانتا۔ وہاں غیرت آدمی سے پہلے مرجاتی ہے۔

"ہاہاہا۔ میری جان مجھے بوڑھا نہ سمجھو۔ یہ ریوالور گولیوں سے خالی ہے مگر میں جذبات سے خالی نہیں ہوں۔ تم نے جو مکاری دکھائی ہے' اس کی سزا تمہیں یہ ریوالور نہیں دے گا۔ اس کے لئے میں کافی ہوں۔"

اس نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ ایک جھٹکے سے ہاتھ چھڑا کر پلنگ سے اتر گئی۔

"ابا......... یہ تجھے کیا ہو گیا ہے؟"

"بکواس مت کر۔ تو کسی حرام زادے کی بیٹی ہو سکتی ہے میری نہیں۔ تیری ماں نے تجھے میرے لئے پیدا کیا ہے۔ اگر اپنی بھلائی چاہتی ہے تو چپ چاپ میری آغوش میں آجا۔"

شادو نے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ کر نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"خدا کے لئے یہاں سے چلا جا۔ اب تجھ میں بہنوں اور بیٹیوں کی پہچان نہیں رہی۔ جو بات میں کہنا نہیں چاہتی اسے کہنے پر مجبور نہ کر۔ چلا جا یہاں سے۔"

مگر وہ ایک ہی چھلانگ میں اس کے قریب پہنچ گیا پھر اس سے پہلے کہ وہ بھاگتی بوڑھے شیر نے پنجہ مار کر اسے دبوچ لیا۔ وہ تڑپ تڑپ کر کہنے لگی۔

"ابا۔ مجھے بیٹی کہہ کر سینے سے لگا لے۔ میں خود ہی تیرے سینے سے لگ جاؤں گی۔ ابا اگر اب نہیں بتاؤں گی تو قیامت آجائے گی۔ میں تیری شادو ہوں۔ ابا میں تیری شادو ہوں.........."

وہ ایک دم سے گھبرا کر پیچھے ہٹا۔ پھر لڑکھڑا کر ایزی چیئر پر گر پڑا۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا تھا۔ اسی لمحے وہ بھی ریوالور کی طرح جذبات کے کارتوس سے خالی ہو چکا تھا۔ اس کے کانوں میں شادو کی آواز سنائی دی۔

"ابا میں تیری شادو ہوں۔ تجھے بند دروازے کے پیچھے دیکھتے ہی میں نے پہچان لیا تھا۔ تو نے مجھے نہیں پہچانا۔ تو اپنے اس لباس کو بھی نہیں پہچان رہا ہے جسے پندرہ برس پہلے پہن چکا ہے۔ یہ لباس تیرے سینے سے لگا ہوا ہے لیکن جو شخص بیٹی کو سینے سے لگا کر نہ پہچان سکے وہ کبھی اپنے آپ کو بھی نہیں پہچان سکتا۔"

چنگیزی کا سر گھومنے لگا۔ جوان بیٹی کا بدن جہاں جہاں اس کے بوڑھے جسم سے رگڑ کھا گیا تھا وہاں تمام جگہ کانٹے چبھ رہے تھے۔ اب اس کا ضمیر اس کے دماغ کو انگاروں سے داغ رہا تھا۔

"ابا۔ میں جانتی تھی کہ تجھے میری حقیقت معلوم ہو گی تو تو مجھے اور میری پنکی کو اور میرے وسیم کو غیرت کے جوش میں قتل کر دے گا لیکن میں یہ جانتی تھی کہ دوسروں کی بہنوں بیٹیوں کے سامنے تیری غیرت اور انسانیت مرجاتی ہے۔ اب تیرے ضمیر کو مُردہ دیکھ کر یہ بتا رہی ہوں کہ میں تیری بیٹی ہوں۔ میں اپنے گھر سے اپنی مرضی سے نہیں بھاگی تھی بلکہ تیری وجہ سے بھاگنے پر مجبور ہو گئی تھی۔

"تو نے یہ نہیں سوچا تھا کہ جس نوجوان کو تو قتل کرے گا۔ اس کے رشتے دار ہمارے دشمن بن جائیں گے۔ امی نے نذیراں کی شادی کر دی تو وہ دشمن میرے جوان ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ تو اپنی جھوٹی غیرت کی دھاک جما کر جیل چلا گیا۔ یہ نہیں سوچا کہ ہماری حفاظت کون کرے گا۔ میں جوان ہوئی تو دشمن میرے پیچھے پڑ گئے۔ ایک رات انہوں نے مجھے اغوا کرنے کے لئے حویلی پر حملہ کیا۔ میں عزت بچا کر پولیس انسپکٹر وسیم کی پناہ میں چلی گئی اور اب تک اپنے وسیم کی پناہ میں ہوں تو نے مجھے کیا دیا؟ بدنامی۔ دشمنوں کا خوف اور سب سے زیادہ اپنی دہشت میرے دل میں بٹھا دی کہ نہ جانے کب تو آکر میرے سہاگ کو اجاڑ دے گا۔"

مگر اب میرے دل سے سارا خوف مٹ گیا ہے اس لئے کہ میں ایک باپ کی آغوش میں رنڈی بننے کے بجائے اسی بے غیرت باپ کے ہاتھوں مرجانا چاہتی ہوں۔ چل آگے بڑھ اور اپنے ہاتھوں سے گلا گھونٹ دے تاکہ دنیا والوں کو اب بھی یہ دکھا سکے کہ تو نے غیرت کے جوش میں بیٹی کو ہلاک کیا ہے۔ ہوس کے جوش میں نہیں........."

چنگیزی کی نظریں زمین میں گڑتی جا رہی تھیں۔ اب اس میں اتنا حوصلہ نہیں تھا

کہ وہ نظریں اٹھا کر بیٹی کو دیکھ سکتا۔ وہ فرش پر پڑے ہوئے ریوالور کو دیکھ رہا تھا۔ اگر وہ خالی نہ ہوتا تو اس میں سے گولیاں کس کے لئے چلتیں بیٹی کے لئے یا اپنے لئے؟

اس نے کرسی پر سے جھک کر ریوالور کو اٹھا لیا پھر بیٹی سے نظریں ملائے بغیر بولا۔

"مجھے کارتوس لا کر دے۔ میں فیصلہ کروں گا کہ غیرت کو مرنا چاہئے یا بے غیرتی کو............"

اتنے میں قہقہوں کی آواز سنائی دی۔ چنگیزی نے پلٹ کر دیکھا دارا ہاتھ میں چاقو لئے اس کی طرف بڑھتا آ رہا تھا۔

"نو کارتوس' نو شوٹنگ۔ میں نے ساری باتیں سن لی ہیں۔ بوڑھے خبیث میں نے تجھ سے غلط کہا تھا۔ مجھے کہیں سونے کا موقع نہیں ملا تو نے یہی سمجھا کہ تین پیگ پیتے ہی مجھ پر نیند اور شراب غالب آ گئی ہے۔ بیوقوف بڈھے! میری اور تیری کھوپڑی میں نیند اور شراب کا نہیں' جوانی کا نشہ ہے جس نے ہمیں اندھا کر دیا ہے اور اب ہماری آنکھوں سے بہن اور بیٹی کی پہچان نکل گئی ہے۔ اب اگر تیرے سامنے ابھی تیری بیٹی کا ہاتھ پکڑلوں تو تجھے خوش ہونا چاہئے کیونکہ ہم تو ایک دوسرے کی بیٹیوں سے کھیلتے ہی آئے ہیں۔"

"بکواس مت کر میں تجھے جان سے مار ڈالوں گا۔"

"ہی ہی۔ کیسے مار ڈالے گا؟ تیرا ہاتھ خالی ہے' تیرا ریوالور خالی' تیرا دل محبت کے رشتوں سے خالی' تو مر چکا ہے بڈھے' مجھے کیسے مارے گا؟ دیکھ میں تیرے سامنے تیری بیٹی............"

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی چنگیزی نے ریوالور کھینچ کر مارا اور دارا جھک گیا۔ ریوالور دیوار سے ٹکرا کر فرش پر گر پڑا۔ پھر بیٹی کو بچانے کے لئے بوڑھے باپ نے اس پر چھلانگ لگائی مگر چیخ مار کر فرش پر پہنچ گیا۔ دارا کا چاقو اس کے دائیں بازو میں پیوست ہو گیا۔ نانا جان کی چیخ سن کر نواسی چیختی ہوئی اٹھ بیٹھی تھی۔ شادو نے لپک کر اسے سینے سے لگا لیا۔

ہنگامے پر ہنگامہ ہو رہا تھا۔ رات کے سناٹے میں باہر بھی کسی گاڑی کے انجن کا شور سنائی دیا۔ شاید انسپکٹر وسیم آ گیا تھا۔ شادو پُر امید نظروں سے بیڈ روم کے کھلے دروازے کو دیکھنے لگی۔ دارا نے دانت نکال کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"فکر نہ کرو۔ باہر کا دروازہ اندر سے بند ہے۔ تمہارے باپ کا وہ دایاں ہاتھ زخمی ہے جس سے اس نے اپنی بیٹی کے محبوب کو غیرت کے جوش میں مار ڈالا تھا۔ اسے یہ سوچنے کے لئے چھوڑ دو کہ جب آدمی بوڑھا اور بے کار ہو جائے تو وہ جوش سے نہیں ہوش سے کام لینے کی تدبیر سوچتا ہے۔"

چنگیزی نے اپنے زخمی بازو کو پکڑ کر تکلیف کی شدت سے کراہتے ہوئے کہا۔

"میں ہوش میں آ گیا ہوں دارا۔ خدا کے لئے دارا میری بیٹی کے قریب نہ جا۔"

"نصیحت اور التجائیں کبھی اثر نہیں کرتیں۔"

"دارا یہ میری بیٹی ہے۔ تیری بہن ہے۔ میرے ٹھوکر کھانے سے تجھے بھی رشتوں کی پاکیزگی کا درس حاصل کرنا چاہئے۔"

"جب تک خود کو ٹھوکر نہ لگے کوئی دوسروں کی ٹھوکروں سے کچھ نہیں سیکھتا۔ پیار کی پاکیزگی کی بات نہ کرو کیونکہ کوئی نظام اوپر سے عائد نہیں کیا جا سکتا' پہلے اندر سے قائم کیا جاتا ہے۔ پہلے اندر سے ٹھوکر لگتی ہے۔ پھر اوپر سے اس نئے نظام کا چہرہ طلوع ہوتا ہے۔"

دارا نے خون آلود چاقو لے کر شادو کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

"شادو۔ جیل سے فرار ہونے کے بعد تمہارے باپ نے راستے میں میرا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ میں وہاں سے بھٹکتا ہوا ایک بستی کے قریب پہنچ گیا۔ اتفاق سے میرے علاقہ کی ایک بوڑھی عورت وہاں مل گئی اس نے مجھے دیکھتے ہی نفرت سے کہا۔

"بے غیرت تو ابھی تک زندہ ہے۔ تیری بہن چکلے میں پہنچ گئی ہے۔" میں نے غصہ میں آ کر اس کی گردن دبوچ لی۔ وہ اٹک اٹک کر کہنے لگی۔

"تو مجھے مار کر پھر جیل جائے گا۔ پھر تیری دوسری بہن داؤ پر لگ جائے گی۔ تم لوگ غیرت کے جوش میں جیل جاتے وقت یہ کیوں نہیں سوچتے کہ تمہاری بیوی' بہن اور بیٹیاں بے آسرا ہو جائیں گی۔"

میں نے اس کی گردن چھوڑ دی۔ اس کی باتیں میری سمجھ میں آ گئیں۔ مگر میں نے دل سے تسلیم نہیں کیا کیونکہ ہم اپنے آپ کو ناقابلِ شکست سمجھتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہماری بہن اور بیٹی پر کوئی ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہیں کرسکتا۔ میں بڑھیا کی باتیں سن کر غصہ کھولتا ہوا اِدھر چلا آیا اور ضد میں آ کر سوچتا رہا کہ میں انتقاماً کسی دوسرے کی

بہن کے سر پر سے آنچل کھینچ لوں گا۔"

باہر دروازے پر دستک ہونے لگی۔ انسپکٹر وسیم اپنی شادو کو آواز دے رہا تھا۔ دارا نے اسے نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔

"مگر یہاں آکر میں نے ایک باپ کو ہوس کے حمام میں بیٹی سے ٹکراتے دیکھا تو میرے ذہن کو شدید جھٹکا پہنچا۔ اب تک میری دوسری بہن جوان ہو چکی ہو گی۔ اگر میں بھی اسے نہ پہچان سکا۔ دنیا کے اتنے بڑے حمام میں اگر میں اس سے ٹکرا گیا تو کیا ہو گا؟

"نہیں، ایسا نہیں ہو گا۔ اب ساری خوش فہمیاں ختم ہو جانی چاہئیں میں اس شرمناک المیہ سے بچنے کے لئے خود کو اندر سے بدل سکتا ہوں۔ دوسری بہن کے سر پر آنچل رکھ کر اپنی بہن کے آنچل کو تار تار ہونے سے بچا سکتا ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے دور پڑے ہوئے دوپٹے کو اٹھا کر شادو کے سر پر رکھ دیا۔ شادو کی آنکھوں میں خوشی سے آنسو جھلملا رہے تھے۔ دارا نے پنکی کو گود میں لے کر چومتے ہوئے کہا۔

"آؤ۔ اب ہم قانون کے لئے دروازہ کھول دیں۔"

فرش پر پڑا ہوا چنگیزی اپنے زخم بھول کر مسکرا رہا تھا۔

☆=======☆======☆